من و یزداں

میں اور میرا خدا

نیاز فتحپوری

(جملہ حقوق محفوظ)

نام کتاب ------ من و یزدان
مصنف ------ علامہ نیاز فتح پوری
ناشر ------ حلقۂ نیاز و نگار کراچی
طبع اول ------ ۱۹۶۶ء
طبع دوم ------ ۱۹۹۳ء
طابع ------ ایجوکیشنل پریس کراچی
قیمت ------ دو سو روپے

ملنے کا پتہ

اختر بک ڈپو اردو بازار کراچی
سنگ میل پبلی کیشنز اردو بازار لاہور
عامر بک ڈپو نیو اردو بازار کراچی

مذہب انسانیت کا پہلا اور آخری صحیفہ

من و یزداں

جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت
کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی
علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے مدلّل بحث
کی گئی ہے

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
خدا ہے یا نہیں	۱۱
آہ زعمرے کہ گذشت اینچنیں	۲۱
نظریۂ اسلام میری نظر میں	۲۸
میری عصبیت	۳۶
بلقیس رعنا کے دو خط	۴۱

مذہبی بیماری	۴۸
ہمارے علماء کرام کا دینی نظریہ	۵۲
سید سلیمان ندوی	۶۶
نگار کی الحاد پروری	۷۸
کورانہ تقلید	۸۷
اے خدا	۹۴
کیا خدا کا وجود ہے	۱۰۳
شیعہ سنی نزاع	۱۱۱
سید سلیمان ندوی اور میں	۱۲۲
ایک تلخ حقیقت	۱۳۰
ہماری قدامت پرستیاں	۱۴۵
مذہب و الحاد	۱۵۳
اکابر اسلام کے بعض خرافات	۱۵۹
ہمارا مستقبل	۱۶۸
عیش و مسرت	۱۷۳
خدا لامذہبیت کے زاویہ نگاہ سے	۱۷۷
بقائے روح و معاد	۱۹۶
بُعد المشرقین	۲۰۴
دشمنِ اسلام کون ہے	۲۱۱
میرے مذہبی خیالات	۲۲۱
گذشتہ و آئندہ	۲۲۵
خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا	۲۳۴
مسلمانوں کا یوم النبی	۲۴۲
عالمگیر مذہب	۲۵۷
حیات و ماورائے حیات	۲۶۰

علم و یقین و اعتقاد و مذہب	۲۷۲
انسانی زندگی کا معیار اور علمائے کرام	۲۸۲
افسانۂ روح و روحانیت	۲۹۴
خودنمائی خداشناسی سے بہاست	۳۰۵
کیا مذہب فطری چیز ہے	۳۱۲
ملاحدہ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے	۳۲۰
مولوی و مولویت	۳۲۳
(۱) مذہب کی حقیقت	۳۳۰
(۲) صراطِ مستقیم	۳۴۴
(۳) مذہب کا مستقبل	۳۶۰
روایات و معجزہ	۳۸۷
مذاہبِ عالم کی تاریکیاں	۳۹۹
مذاہب کی واہمہ پرستی	۴۱۰
بُت پرستی و بُت شکنی	۴۱۶
قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم	۴۲۴
رُوح و بقائے رُوح	۴۳۸
خدا کا تصوّر	۴۴۹
ماخذ القرآن پر اصولی گفتگو	۴۵۴
سامی مذاہب کی روایات	۴۸۷
شیطان	۵۳۴
معصیت اور مذہب و عقل	۵۳۹
شریعت میں تغیر و تبدّل	۵۴۴
درود شریف	۵۵۱
عبادت	۵۵۶
مساجد اور سیاسی جلسے	۵۶۱

خدا ہے یا نہیں؟

اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے چاہو، چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی اور دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔

موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفا، نباتات کی بوقلمونی وحوش و طیور کی طبیعی نیرنگی۔ نوع انسانی کے قوائے کامنہ، فضائے بسیط کے ستارے، کائنات کی لاانتہا وسعت، خورد و شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں (جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم الجو، علم الافلاک، علم الکیمیا، علم وظائف الاعضا، علم الحیات، نفسیات وغیرہ رکھا ہے، بتائیں گی کہ یقیناً کوئی ایسی قوت موجود ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں اور اسی لئے یہ مسئلہ اس قدر بدیہی، اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں

تو اسے مشاہدات سے تعبیر کر سکتا ہوں جس کے لئے نہ کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی حجت و استدلال کی۔

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے صبح کو پھول کھلتے ہیں اور سارا کنج نکہت سے معمور ہو جاتا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے" اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور!

حق خامش ست و با تو بصد رنگ گفتگو ست
شوق آرمیدہ است دفلک تا ز جستجو است
موقوف اضطراب زبان نیست عرض راز
گر دارسی اشارۂ تحقیق مو بمو ست
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشی ست
ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بو ست
کثرت حجاب جلوۂ وحدت نمی شود
مژگاں بہر چہ باز کنی دیدہ محو اوست

پھر اب اور نہ کبھی، یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت مافوق الادراک ہے یا نہیں البتہ عقول انسانی کا اختلاف اس امر میں ضرور رہا ہے کہ ہم اس کا تصور کیونکر کریں۔ اس : دیکھے جا سکنے والے کو کیونکر دیکھیں اور اس نہ سمجھے جا سکنے والے کو کس طرح سمجھیں فلسفہ آج تک اس گرہ کو نہ کھول سکا، مذہب کی عقدہ کشائیاں تمام تر

اپنے دائرہ نجات سے وابستہ رہیں اور مختلف زمانوں میں، مختلف قوموں نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا لیکن کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ باوجود اس کے کہ حقیقت ایک ہے مگر تعبیرات بے انتہا، شاہد ایک ہے مگر اس کی داستانیں کثیر!

حُسنُكَ واحد وعباراتنا شتّیٰ

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

مذاہب عالم اور اقوام و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کفر و اسلام، اذان و ناقوس کی جنگ جو آج نظر آ رہی ہے، کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی ابتدا اسی وقت سے ہوتی ہے جب انسان اپنا جذبۂ تفوق پرستی لے کر سامنے آیا پھر یہ جنگ یقیناً علم و مذہب کی جنگ نہیں، کیونکہ اگر مذہب کا مقصودِ حقیقی صرف خدا شناسی ہے تو پھر مجھے کوئی سمجھائے کہ دنیا کا وہ کون سا علم ہے جو معناً اس غائت تک نہیں پہونچتا، بلکہ یہ جنگ ان رقیبوں کی تھی جو ایک ہی محبوب کے جلوہ کے لئے بیتاب تھے، ان جاں دادگان خود فراموش کی تھی جو سوا اپنے کسی اور کو "خلوتیانِ راز" میں شامل دیکھنا پسند نہ کرتے تھے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہیئے کہ وہ اپنے ہی "ذوقِ سجود" کا تفوق ثابت کرکے "آستانِ محبوب" کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتے تھے اور یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے اور آج بھی تمام افتراق و انشقاق اسی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

فلسفہ و استدلال کی دنیا میں آکر جس وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائیگا تو معلوم

ہوگا کہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذاہب عالم نے پیش کیا تھا

وہ صحیح نہ تھا، ہوسکتا ہے کہ صرف قومی نظام تمدن کے لحاظ سے وہ کسی وقت
مناسب رہا ہو لیکن اخوت عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ نامکمل تھا، دنیا میں صرف
ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھایا اور
اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب کی ضرورت دنیا کو باقی ہے نہ
مبلغ مذہب کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی ——— اور وہ مذہب اسلام
ہے جو نہ کسی ملک کے لئے مخصوص ہو نہ کسی قوم کے لئے مختص، اس کی دعوت گبر و ترسا
یہود و نصاریٰ، عالم و جاہل، امیر و فقیر، شاہ و گدا، مشرق و مغرب، شمال و جنوب،
ہر طبقہ و ہر ملک کے لئے یکساں ہے۔ اور اسی لئے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے
وہ ایسا جامع، ایسا قرین عقل، ایسا ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک
جاہل اسے قبول کرسکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے۔

وہ زمانہ جب "آسمانی بادشاہت" کا وعظ کہہ کر خدا کو ایک دنیاوی صاحب
جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا ختم ہوگیا۔ وہ عہد جب عقول انسانی صرف
مرئی و محسوس اشیاء پر ایمان لاسکتے تھے اور جب ضرورتاً و مصلحتاً مسیح کو خدا کی صورت میں
پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تھی، گذر گیا، وہ دور انسانیت جب تمرکز نفس
concentration of mind کے لئے رمزی اور اشاری Symbolic
طریق عبادت محسوس کرکے خدا کے وجود کو بتوں، ہیکلوں، تمثالوں اور مجسموں میں تبدیل
کیا گیا، باقی نہیں ہے، یہ تمام زمانے اب سے تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل ختم ہوگئے جب

ریگستان عرب سے ایک انسان کامل کا ظہور ہوا اور اس نے نہایت ہی مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا۔ اس نے ثنویت و تثلیث کی تردید کی، اس نے تجسیم و تشکیل کو غلط ٹھہرایا۔ اس نے تشتت و انتشار کو محو کیا، تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اس نے بتایا کہ خدا تمام مکانیات و زمانیات سے بے نیاز ہے۔ مادیات کی دنیا سے علیحدہ ہے اور تمام ان نسبتوں و اضافتوں سے منزہ جو عقول انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کے لئے متعین کی جاتی ہیں۔

ایک طرف تو اس نے بتایا کہ اس کا قیام عرش بریں پر ہے یعنی ذات انسانی سے علیحدہ کائنات کی فضائے وسیع و لامتناہی میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اس کو شہ رگ سے زیادہ قریب بتایا یعنی جس حد تک ذات انسانی کا تعلق ہے اس کے قرب کی کوئی انتہا نہیں، وہ سانس میں جاری ہے، خون میں ساری ہے، روح میں دوڑ رہا ہے، قلب میں جاگزیں ہے اس کو رحمان و رحیم بتایا اور جبّار و قہار ظاہر کیا۔ بظاہر یہ نام ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن یہیں سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسمائے حسنیٰ کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں نہ صفاتی بلکہ آثاری و مظاہری اسماء ہیں جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل، زندگی کے تمام اصول مادی و ذہنی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے یعنی اگر انسان خوش و پُرامن زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ بھی اسی کا مظہر ہے اور اگر قہر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو یہ بھی اسی ایک ذات کی وجہ سے ہے جس نے اسباب و علل پیدا کر کے عالم کی تمام کیفیات مادی و ذہنی

کو اپنے سے منسوب کیا اور جن کے ترک و اختیار کے لئے انسان کو عقل و تمیز عطا فرمائی۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانیٔ اسلام نے بتایا، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منزہ خیال جو بلند ترین فکر انسانی کے لئے بھی قابل قبول ہو اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصول مذہب جو انسان کو وسیع النظر بناتا ہے، جو تمام افراد کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کر سکتا ہے اور جو دلوں کو تعصب و جہل، کینہ و بغض سے پاک رکھتا ہے لیکن کیا کوئی مسلمان آج ایسا ہے جو کہہ سکے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے جیسا بانیٔ اسلام نے سمجھایا تھا اور اس کی آغوش ہر انسان کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کسی ملک و قوم کا ہو پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں کے علماء مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ و نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتے کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہنچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ و نماز کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قائم ہے اور جس کے سمجھنے پر کائنات کی ترقی، روح کا استعلاء، اخلاق کی پاکیزگی، مادی ارتقاء اور عالم کا امن و سکون منحصر ہے، اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے یہ خیال لے کر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے علیحدہ ہیں اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر اپنے سوا تمام عالم کو غیر خدا کی مخلوق سمجھتا ہے تو مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم!

پھر جب خدا سب کا ہے تمام مخلوق اسی کی ہے جب اس کو نہ مذہب سے فائدہ پہونچتا ہے نہ لا مذہبیت سے نقصان تو پھر یہ عصبیت کیوں، یہ تفوق و برتری کا غلط معیار کیسا، طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی، وضع و لباس کی تفریق، تمدن و معاشرت کے امتیازات پر آویزش کیسی؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود
قطرہ کز موج دامن چید گوہر می شود
ہیچکس را در محبت شرم ہم چشمی مباد
در ہوایت ہر کہ گرید دیدہ ام تر می شود

○

"انسانیت" اب نہیں بلکہ طفولیت ہی سے حسن وجمال کا خواب دیکھ رہی ہے اور جس حد تک اس کا علم اور اس کے مشاعر بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر زیادہ شدت و تنوع کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے چنانچہ ایک صاحب فن اپنے فن میں، ایک شاعر اپنے شعر میں، ایک ادیب اپنی انشا میں، ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں، یہاں تک کہ ایک مادہ پرست بھی (جو اپنی فطرت کے لحاظ سے حسن کے مفہوم سمجھنے کا بہت زیادہ نا اہل ہے) حسن ہی کا خواب دیکھتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جمال کسے کہتے ہیں؟

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے وہ ایک تبسم ہے جو چہرۂ انسانیت کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے وہ حرارت حیات

میں تھک جانے والے تمدن کی جائے پناہ ہے۔ وہ ایک قوت ہے جو مادہ کی قیود سے ہمیں آزاد کرتی ہے، وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے۔ ماں اپنی لڑکی کے سنہرے بالوں کے چھلوں کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے مسکرا پڑتی ہے اور لڑکی ہنس دیتی ہے۔ شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں جمال الٰہی کی چمک محسوس کرتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرے پر نگاہ ڈال کر اپنے قلب کو سکون سے بھر لیتا ہے۔ ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضا کو دیکھ کر آفتاب کو افق لانہایت میں غروب ہوتے ہوئے دیکھ کر جمال فطرت سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک شاعر مغنی اس سے متاثر ہو کر اپنی موسیقی سے فضا میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے پھر اگر اس کا نغمہ عظمت وطن سے متعلق ہو تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکل مقدس پر قربان کر دیتا ہے اور اگر وہ نغمۂ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزاء کو اسپر صرف کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔

"تارد" *Tarde* اپنی کتاب "المنطق الاجتماعی" *Logique Social* میں کہتا ہے "ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے ہم اسے عظیم کہتے ہیں۔ جب اس کے افراد مہذب و شائستہ ہوتے ہیں، یقیناً جمیل ہے۔ وہ وطن جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو نوا حضارت بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہو۔ اسپارٹا حسین تھا جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ وہ بلاد

کرتے ہیں کہ نحیف شانوں کی مدد حاصل کئے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اٹھ سکتا۔

آہ زعمرے کہ گزشت اینچنیں

چند دن سے میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو اگر کسی ایک فقرہ سے ظاہر کر سکتا ہوں تو عنوان کے مصرع کو ملاحظہ فرمائیے۔

آہ زعمرے کہ گذشت ایں چنیں!

ماضی کی ہر یاد خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو، حال کی شیرینیوں سے زیادہ پُر کیف ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر تمنّا خواہ کتنی ہی غیر الحصول کیوں نہ ہو، حالات حاضرہ سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی انسان نام ہے ایک طرف خواہش استرداد کا اُس کے لئے جو گذر گیا اور دوسری طرف دست امید بڑھانے کا اُس کے لئے جو ہنوز عدم میں ہے پھر چونکہ حیات انسانی کا ہر لمحہ حال ہی ہو کر گذرتا ہے اس لئے نتیجہ معلوم لیکن میری حالت اس سے بالکل مختلف ہے، ماضی کے استرداد کی تمنا نہیں اور حال کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

برمن آں می رود امروز کہ گوئی فرداست

کہتے ہیں کہ جہل کا علم، علم کی پہلی منزل ہے، لیکن شاید یقین کی نہیں، معلوم نہیں علم کو جہل سمجھنے والے اس باب میں کیا کہتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی دماغ انسانی کی پہلی بدعت ہے جسے فطرت تو برداشت کر لیتی ہے لیکن روح کی نزاکت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر کتنے ہیں جن کی روحیں اس کشمکش پر سوگوار نہیں اور کہاں ہیں وہ نفوس جو احساس کی اس بے اعتدالی سے داغدار نہیں جہل بہ علم سے زیادہ اہم و ضروری ہے؟ دیکھنا ہے کہ ہم اپنی تسکین کے متلاشی ہیں یا نہیں :

انسان کا وجود اپنی تخلیق کے لحاظ سے سراپا جستجو ہے، روح خواہ وہ مادہ سے مجرد ہو یا وابستہ یکسر اضطراب تمنا ہے، صبح کا جلوۂ زریں، شام کا نقاب رنگیں، آفتاب کی زرپاشیاں، چاند کی نورافشانیاں، شاہد مقصود کی مختلف ستّہ بہرو پنار PHENOMENA ہیں جو ہم کو عین ذات PHENOMENA کی طرف بلاتے ہیں اسی طرح خزاں کی سوگواری، بہار کی نشاط انگیزی، دریا کی روانی، پہاڑ کی استقامت اور ان کو بھی جانے دیجئے خود انسان کے نتائج عمل جو سربفلک عمارتوں، محیر العقول ایجادوں اور زر و سیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ سب دعوتیں ہیں اصل منزل تک پہنچنے کی۔ اُس آغوش رحمت میں جگہ پانے کی، جس کا نام مذہبی کاروبار والوں نے فردوس رکھا ہے، لیکن میں اس کو "دار الصحو د المنام" کہتا ہوں، جہاں روح اپنی جستجو ختم کر کے شیریں خواب میں محو ہو جاتی ہے جہاں تمام امتیازات رنگ و بو مٹ کر صرف ایک احساس امن و سکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں آج علم و حکمت کی ترقیاں اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ زمان و مکان، سمت و جہت کا مفہوم بدل گیا ہے اور تمام محالات، ایک ایک کر کے امکان و قوع کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں،

لیکن کیا انسان بایں ہمہ اقتدار و اختیار روح میں کوئی شائبہ سکون محسوس کرتا ہے؟ آج زر و دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ تمام وہ تمنائیں اور خواہشیں جو انسان کے گوشت و خون سے متعلق ہو سکتی ہیں "شے حاصل" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا روح کی گرسنگی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس کی جاتی ہے؟

انسان آگے بڑھ رہا ہے۔ انسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے، —— دماغ ترقی کر رہا ہے، روح تنزل کر رہی ہے۔ اس وقت کا انسان ایک ایسا مستسقی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور وہ پانی پینے کے لئے آزاد، لیکن اس کی روح جس چیز کے لئے بے تاب ہے اس کا کہیں پتہ نہیں!

دہند شوق دلے رخصت نظر ندہند

دنیا کے تمام مذاہب اسی "فردوس گم گشتہ" کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے آئے۔ انبیاء و رسل، اولیاء و اکابر کی ہستیاں روح کی اسی فریاد کی مختلف صورتیں تھیں جو ابراہیم و اسماعیل، سلیمان و داؤد، یوسف و موسیٰ عیسیٰ و محمدؐ، زردشت و کرشن، بودھ و کنفوشس کی صورتوں میں ظاہر ہوئیں اور آئندہ مختلف ناموں اور شکلوں سے ظاہر ہوتی رہیں گی لیکن ان ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے جو کچھ یاد رکھا وہ صرف یہ تھا کہ فلاں آتش پرست ہے اور فلاں گوسالہ پرست، یہ صلیب کا پرستار ہے اور وہ کعبہ کا، یہ ناقوس پھونکتا ہے اور وہ اذان دیتا ہے، یہ صورت کفر کی ہے اور وہ اسلام کی، حالانکہ یہ تفریق و امتیاز نوع انسانی کی اس روح کے ٹکڑے نہیں کر سکتے جس کا درد و درماں ایک جس کی راحت و اذیت ایک جس کا اوج و حضیض ایک اور جس کی فنا و بقا ایک ہے،

خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی رہے گا خواہ اس کے پہونچانے والے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں اس لئے آج دنیا کی سوگواریوں کا سبب نہ خدا کی دوئی ہے۔ نہ اس کے پیام کا تنوع، بلکہ صرف یہ الجھن کہ پیامبر کا وطن کہاں تھا، اس کا نام کیا تھا، اس کی صورت کیسی تھی، اس کا لباس کس طرح کا تھا، وہ کیا کھاتا تھا، کیا پیتا تھا، پھر خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ اپنی روح ہم تک پہونچائے مگر ہم نے اس کو جسم سمجھ کر اپنے حواس کے تلذذ کو اس کے عرفان کا معیار قرار دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی نکہت سے صرف ہمارے دماغ کو متاثر کرے مگر ہم نے پھول کو اصل چیز سمجھ کر صرف اس کی ظاہری صورت سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا اور جب وہ پھول مرجھا کر فنا ہو گیا تو ہماری روحیں پھر تڑپنے لگیں آج جبکہ پھول کی چادروں سے چنگاری کی سوزش، زرکار طبرس سے شعلوں کی تپش اور زرد سیم کے انبار سے آگ کی لپٹ محسوس ہو رہی ہے سب سے زیادہ ضرورت اسی احساس کی ہے!

بنارس کا مرتاض برہمن ہاتھ میں سمرن لئے ہوئے اٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو" دیوبند اور فرنگی محل کا عباپوش مولوی جبہ بر سر و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری مسجد میں آؤ۔ اذان کی آواز سنو، قبلہ کی طرف منھ کر کے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو" ——— ایک راہب کہن سال نمودار ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالی شان کلیسا میں آؤ۔ گھنٹہ کی صدا پر متوجہ ہو، پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو تاکہ یہ بے چینی دور ہو" ——— جاتریوں کا گروہ جوق در جوق

معبدوں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن ان کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکا کہ ان کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں، جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشان خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اُچھالتا ہوا نظر آتا ہے گروہ کا گروہ کلیسا سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی آغوش ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے ——— ایک نرالا اُبالی، ایک مردِ ژولیدہ مو، جو نہ کبھی کسی مندر میں گیا نہ مسجد میں، نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا نہ کلیسا میں۔ انسان کی اس بیچارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس قوت کے سامنے جس کو اس نے ہمیشہ علائق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا۔ متحیرانہ و متفکرانہ کھڑا ہو جاتا ہے، آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا اس کی آغوش میں گر جاتا ہے اور یہ اسے سینے سے لگائے اپنی راہ لے لیتا ہے۔ صبح کو قدوسیوں کی جماعت اس خاک بسر و چاک گریباں انسان کو دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے، یقیناً وہ شرابی ہے وہ مست ہے ایسا کہ

مستیش را بنود نغمۂ صہبا شاماں

دوسرا گروہ آتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے ملحد و بے دین ہے بے شک وہ ایسا ہی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ

تا زد بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر ست

اس کے مجروح جسم، اس کے داغدار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہیں اور جس وقت وہ بے تاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ

دردیست دردلم کہ بدرماں برابرست

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ تاثرات کب سے مجھے بیتاب بنائے ہوئے ہیں اور ٹھیک اس وقت جبکہ میں چیخ چیخ اٹھنے کے لئے مجبور تھا کس طرح "تاب گفتگو" مجھ سے چھین لی گئی۔ لیکن اب "اشارات" کا رُخ بدل گیا ہے۔ ایماء ربانی کچھ اور ہے، ظلمت کی اس شدت کے بعد روشنی کا نمودار ہونا لازم ہے۔ مجھے بلا پس و پیش اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہیئے کہ وہ لوگ جو اپنے کو اکابر دین کہتے ہیں ان کو گروہ طاغوت سمجھو، وہ جو خانقاہوں میں ہاتھوں کو رسم دست بوسی کے لئے پھیلائے ہوئے پڑے ہیں۔ ان کو دشمن روحانیت جانو، وہ جو تمہیں اپنے آگے جھکنے پر مجبور کرتے ہیں ان کو غول صحرائی سے زیادہ وقعت نہ دو، وہ وقت گذر گیا جب خدا مسجد و مندر میں ملتا تھا کہ اب نہ وہ مسجد و مندر ہیں نہ وہ مسجد و مندر تک پہونچانے والے، اب خدا ملتا ہے نفس کی آزادی میں، ترک تقلید میں، قلب کے اس انبساط میں جو صرف اپنی ہی تدبیر و تفکر سے حاصل ہوتا ہے اور روح کی اس آزادی میں جو صرف اخلاق ہی کی پاکیزگی سے میسر آتی ہے رسمی مذاہب ترک کر دو، کہ اب ان سے "صرف فساد و سفک دماء" کا کام لیا جاتا ہے، مدعیان مذہب کو ٹھکرا دو کہ نوع انسانی کی تفریق کا ذمہ دار گروہ تنہا یہی ہے تمام انسان ایک ہیں اور انسانیت ہی کے رشتہ کو اپنا مذہب قرار دو اگر مذہب کا لفظ تمہارے لئے ضروری ہے۔ ناموں کی تفریق مٹا دو، لباس کی تمیز اٹھا دو، رنگ نسل کا امتیاز محو کر دو، آسمانی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا مگر اُس وقت

جب ہماری نگاہوں کے زاویے بدل جائیں پھر اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو تمہاری روح کی بے چینیاں دور ہوں تو اپنی نگاہوں کا مرکز ایک ہی قرار دو اور حسب و نسب کے تفاخر، دولت و جاہ کے تفوق، حسن و جمال کی تعلی اور علم و فضل کے پندار کو یکسر محو کر دو کہ خدا کی بارگاہ میں شریف و رذیل، شاہ و گدا، عالم و جاہل سب ایک ہیں، اور وہاں اگر کسی جنس کو قبول حاصل ہو تو صرف تمہاری خوئے عجز، جس نے بندگان خدا میں کبھی تفریق نہیں کی اور سب کو اپنی ہی ہستی کا جزو قرار دیا۔

میں جیسا کہ میرے ایک عزیز دوست نے اندیشہ ظاہر کیا ہے، مہدویت کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں نہ میں کبھی نبوت و رسالت کا مدعی ہو سکتا ہوں، کیونکہ اب نہ کسی مہدی کی ضرورت ہے نہ رسول کی، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر کبھی رات کی تنہائی میں، صبح کی خلوت میں طبیعت سکون کی طرف مائل ہو تو جو میں کچھ کہتا ہوں اس کو سامنے رکھیے اور پھر مجھ سے نہیں بلکہ

زخود بجوئے کہ ما را چہ در دل افتادست

نظریۂ اسلام میری نظر میں

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں جیسی آجکل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس نے عوائد و رسوم کی بیخ کنی کرکے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔

سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام اور شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اس لئے اس کا دور ہونا آسان نہیں ہے تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لئے مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں۔

انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جتنا یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ خالق اور خدا کی ذات بالکل بے

نیاز ہے اور انسان کی کوئی بدعنوانی، کوئی نامعقولیت۔ یہاں تک کہ بتوں کو پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا۔ کیونکہ اس کی برہمی نہ انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ خفا ہو جاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی اچھی بات کسی سے ظاہر ہوئی اور ہم اس پر خوش ہوگئے

چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت والم سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا پھر جب اس مفہوم کی جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقتاً ہماری ہی بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری ہی مضرت سے ہے۔ اس لئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدبیر اختیار کرے جیسا کہ ——————

"اِن اُرِیدُ اِلّا الاصلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور ان مکارم اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ انہی اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر و اسلام، شرک توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف استقامت فی العمل کا۔ بلندی اخلاق کا۔ اخوت عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں تنظیم ونسق سے منحرف ہو جانے کو، ترک عمل کو، انحطاط اخلاق کو، انتشار و افتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریق جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔ کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے آئے تھے اسی لئے ان کو "کافۃ للناس" —————— اور "رحمۃ للعالمین" کے لقب سے

یاد کیا گیا۔ رسول نے فرقہ بندی کے خلاف • اخوت عامہ کے موافقت میں جو کیا یا کہا اس کا ثبوت کلام مجید سے ملتا ہے ارشاد ہوتا ہے :۔

قل اٰمنّا باللہ وما اُنزل علینا وما اُنزل علیٰ ابراھیم واسماعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اُوتی موسیٰ وعیسیٰ والنّبیّون من ربھم لا نفرّق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون ؇

پھر کیا نبیوں میں آپ رام۔ کرشن۔ بودھ۔ کنفوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے اور کیا ولقد فی کل امۃ رسولا۔ ارشاد خداوندی نہیں۔ پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ: "ونحن لہ مسلمون" میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشا خداوندی یہی ہے کہ ساری دُنیا ایک جماعت، ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن یضل من یشاء و یھدی من یشاء لتسئلنّ عما کنتم تعملون ؇

"ولو شاء اللہ" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنا رہے ——— لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ رہو خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا۔ تمہارے افعال و اعمال پر وہ تم سے پوچھے گا کہ

کیوں تم نے ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعت نظر سے اپنے رواداری سے اور اپنے اصول زندگی سے اس "اخوت عامہ" کو دنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔

"یضل من یشاء اور یھدی من یشآء" کے معنی بھی بعض مفسرین مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ یعنی انھوں نے "یشآء" کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے حالانکہ حقیقتاً "یشاء" کا فاعل "من" ہے ورنہ "ولتسئلن عما کنتم تعملون" بالکل بے کار ہو جائے گا۔ کیونکہ جب ہدایت و گمراہی صرف خدا کے لئے مخصوص ہو گئی تو بازپرس کیوں، اور کس سے؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے:-

"صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون"

یعنی اے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ:

قل یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوا ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے۔ یہ تعلیم اس قدر سادہ اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر یا جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے

یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس کی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو۔ جو مرکز انسانیت سے انحراف پیدا کرنے والا ہو جس سے اشتراک عمل تباہ ہوتا ہو اور جس سے رشتۂ تمدن اور شیرازۂ تعاون کمزور ہو جانے والا ہو۔ شرک و کفر ہو جحود و انکار ہے، بت پرستی ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا منشاء خداوندی اور اس کی اہمیت سے انکار کرنا ہے خدا کے وجود کو نظر انداز کر دینا ہے اور اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جانا۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کر سکتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہونچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان۔ نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت پہونچتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔

اگر ایک شخص غیر مسلم ہونے کے باوجود تمام انھیں مکارم اخلاق اور محاسن

فطرت سے آراستہ ہے جن کی محمد نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اس کو صرف اس لئے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے کافر، مشرک کہہ کر ناری و جہنمی کہہ دیں گے اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی تو کیا اس کو صرف اس بناء پر کہ اس کا نام آپ ہی کی طرح ہے، آپ کے اعزہ میں اس کا شمار ہوتا ہے نجات و فردوس کا پروانہ دیدیں گے۔

ایک بے رحم قزاق قافلے کو تباہ و برباد کر کے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتہً مغرب کی اذان ہوتی ہے وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کر کے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنت شاقہ برداشت کر کے اپنے متعلقین کے لئے حلال روزی فراہم کرتا ہے۔ گاؤں کے بچوں، بوڑھوں، یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے، مسجد جانے کے بجائے وہ مندر کا رُخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجئے وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہہ دے گا کہ بہرحال اس قزاق کو نجات ملنی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخرکار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔ پھر اگر اسلام نام اسی وسعت نظر و انصاف کا ہے۔ اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں، اگر "فاحکم بینھم بالقسط" کا یہی مفہوم ہے اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آئیے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہو جائیے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ صرف خدا انھیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا ہے ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے، بحیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو چینی ہو یا بدھ، معتزلہ ہو یا اشعریہ ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سنی، خدا کے نزدیک ایک ہے۔ اس کا رب سے ایک ہی مطالبہ ہے پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا اور جو اس کو ترک کرے گا خدا بھی اس کو چھوڑ دے گا۔

بے شک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے۔ لیکن میں اس کی اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو برا کہوں جبکہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں :

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں، اس کی طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کر کے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ مذہب اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہونچنے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کونسا ہے اور میری رائے میں "جادلھم بالتی ھی احسن" کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے، یہ عام اصول اخلاق کا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قائم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہے، تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے، وضع و معاشرت میں تو تبدیلی پیدا کر سکتی ہے لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی ہے۔ اطمینان نفس، طمانیت روح، لطف و رافت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ تعلیم اسلام کی جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے، اُسے تو آپ پیش نہیں کرتے دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انھیں کو جواہر ریزے سمجھے

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے مقلدین میں پائی جاتی ہے اس لئے جو اعتراض میرا اہل اسلام پر ہے، وہی ہندوؤں پر ہے اور وہی دوسرے مذہب والوں پر، نہ تم میں رواداری۔ نہ اُن میں انصاف، نہ یہ صراط مستقیم پر، نہ وہ راہ راست پر، منزل سے دور رہنے میں سب یکساں ہیں اور گمراہی میں برابر کے شریک۔

یہ ہے میرا اعتقاد و یقین مذہب کے متعلق، اور اگر موجودہ حالت افتراق قائم رہی تو یاد رکھئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور وہی وقت تجدید اسلام و احیاء دین محمدی کا ہوگا۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

میری عصبیت

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب بعض حضرات میری تحریروں کو عصبیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ خواہ وہ مذہب، معاشرت سے متعلق ہو یا علم و ادب سے جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف میرے خلوص نیت کا نتیجہ ہے جس کی اگر کوئی تعبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ

شکایتے است ز گنجینہ بدل ز بسیاری

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ تشیع و تسنن تو خیر نہایت ہی معمولی بات ہے میں نے تو اصطلاحی کفر و اسلام کا پردہ بھی نوچ کر پھینک دیا ہے اور بانگ دہل اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر جنت نام ہے صرف سکون روح و طمانیت قلب کا اور اگر یہ جنت ایک زاہد شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ

مغلوب کرنا چاہتی ہے حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانی محمل" کا احساس جس قدر قوی ہوتا جاتا ہے اسی اعتبار سے

ہر پردہ را بو نولہ سنجم ہزار بار

اس لئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں، بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہد مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "پارۂ کتان" چاند کے سامنے اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس نااستواری "نسیج" کا تماشہ دیکھنے کے لئے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی نگاہ پستی کی طرف مائل کروں ——— دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جب تک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اس جستجو میں دعوت شرکت نہ دے کہ

سیلاب را بہ بادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ انتقاد خواہ وہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی۔ اور اس لئے جب مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ میری تحریر سے کسی کو صدمہ پہونچ گیا ہے تو میں بہت ملول ہو جاتا ہوں۔ بنابراں اگر میری کسی تحریر سے، کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اس کی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لئے

فردوس را بدام نگہ می کنم شکار

میں اس چیز سے واقف ہوں جس کی جستجو دیر و حرم میں کی جا رہی ہیں، میں اس مقصود کو جانتا ہوں جس کو مساجد و کنائس میں ڈھونڈھا جا رہا ہے اور میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہوں کہ یہ محراب منبر پر پیشانیاں رگڑنے والے آج تک بھی نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو سجدہ ہائے نیاز کا مسجود ہو سکتی ہے اور وہ کونسا پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد یہ تمام اعتبارات سطحی یہ جملہ ممیزات ظاہری محو ہو کر

چشم وا کردن زمین تا آسماں آغوش داشت

بن جاتے ہیں، پھر اس سے قبل خدا معلوم کتنی زریں صبحیں، کتنی رنگین شامیں، کتنی خنک راتیں میں نے صرف اس غور و تامل میں صرف کر دیں کہ کیا منصور کا انا الحق کہہ کر دار و رسن کی منزل سے گذر جانا واقعی شاہد مقصود کے چہرہ سے حجاب کا اٹھا دینا تھا اور کیا میں بھی اگر ایسا دعویٰ کروں تو بے جا ہوگا، لیکن میں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچا کہ اول تو وہ منزل ہے

مرا کردہ اند آشکارا بہ من

کہتے ہیں کہ کوئی ایسی بلند منزل نہیں جس کو ہر شخص بادنیٰ تامل نہ پا سکتا ہو، چہ جائیکہ اس میں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے اس لئے میں بے نیازانہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا، لیکن حیرت ہے کہ دنیا اس کے بھی سمجھنے کے لئے آمادہ نہیں اور جس وقت میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ "یکسے ز آبگینہ د ساغر برآورم" تو وہ مجھ سے منہ پھیر لیتی ہے مجھے کافر کہتی ہے، دہریہ و ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو

مغلوب کرنا چاہتی ہے حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانیٔ محمل" کا احساس جس قدر قوی ہوتا جاتا ہے اسی اعتبار سے

ہر پردہ را بو نولہ سنجم ہزار بار

اس لئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں، بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہد مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "پارۂ کتاں" چاند کے سامنے اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس نااستواریٔ "نسیج" کا تماشہ دیکھنے کے لئے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی نگاہ پستی کی طرف مائل کروں ——— دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جب تک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اس جستجو میں دعوت شرکت نہ دے کہ

سیلاب را ببادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایک طرف یہ عزم استوار ہے کہ انتقاد خواہ وہ معاشرت و اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی۔ اور اس لئے جب مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ میری تحریر سے کسی کو صدمہ پہونچ گیا ہے تو میں بہت ملول ہو جاتا ہوں۔ بنابراں اگر میری کسی تحریر سے، کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اس کی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اس لئے

مستم چناں کہ گل نشناسم زرنگ خار

اس سلسلہ میں مجھے بُرا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو انتقام لینے کے لئے صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں اور گالیوں سے آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلۂ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی فحاشی وغیرہ کے نقائص نکال کر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح ان کا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا یزداں میرے ساتھ ہے اور اس لئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور موخرالذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوق ادب انشا کی طرف سے سوا اس کے اور کچھ نہیں عرض کر سکتا کہ

نظارۂ خوباں و مے و نغمہ حرام است

دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا!

میں پہلے بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف ترک رسوم کا۔ تفریق قومی کے محو کر دینے اور جامعۂ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا۔

اسلام مسجد و مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے۔ زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ نہ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے۔ نہ پیکرماں اور طواف کا فرق اس کا مطمح نظر۔ وہ تمام عالم کو ساری کائنات کو، جملہ نوع بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کر کے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے، اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما، کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے

نہ دولت اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف ذاتی جذبۂ ایثار و فدویت کو۔ اور محض اس اضطراب کو جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کی اعانت کے لئے پیدا ہونا چاہیئے پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتلانے کے لئے سب سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو محو کر دینے کی جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دے کر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علیحدہ کر رہا ہے اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرے کو نہایت مکروہ پیش کر رہے ہیں۔

اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے تو یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جس کے بغیر "اخوت عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس لئے جس ایثار و قربانی جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے وہ ہم میں سے سرمد و منصور کی طلبگار ہے۔ سقراط و حسین کی آرزومند ہے۔ اور اُن مردانِ خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس راز کا اعلان کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کے لئے آمادہ ہو جائیں اور خدمت اسلام کے لئے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پس پشت ڈالنے کے لئے تیار ہو جائیں تو نہایت آسانی سے حقیقی مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور دنیا ازخود ان مولویوں۔ ان ملّاؤں۔ ان عالمانِ دین ان پیرانِ طریقت، ان تصوف پیشگانِ حرم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے؛

◎

بلقیس رعنا کے دو خطوں کا جواب

(پہلا خط)

نیازِ بے نیاز!

• مسٹر لکھنا آپ کی توہین ہے اور مولانا کہنا آپ کی چھیڑ۔ اس لئے صرف نیاز پر اکتفا مناسب تھا ــ ... ... مگر بے نیاز کے اضافہ سے تھوڑی سی شاعری بھی کر دی گئی ہے۔ معلوم نہیں آپ اس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں

میں عرصہ سے اُن تمام انقلابات کا مطالعہ کر رہی ہوں جو تدریجاً آپ کے ذہن و دماغ میں پیدا ہوتے جاتے ہیں اور نہیں کہہ سکتی کہ ان کا سلسلہ کب اور کس طرح ختم ہوگا لیکن اگر میں قیاس سے کام لوں تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ بہت جلد خدا اور خدا کی آخری الہامی کتاب سے بھی انکار کرنے والے نظر آتے ہیں جس کا ثبوت ماہ جون کے استفسارات میں بآسانی مل سکتا ہے۔

میں آپ کی آزادانہ تنقید کو بے حد پسند کرتی ہوں لیکن مجھے ابھی تک اس چیز کی حقیقت کا علم نہیں ہوا جو اصل باعث آپ کے لٹریچر کا ہے کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈال کر مجھے ظن و گمان کی معصیت سے بچا لیں گے؟

بہرحال میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتی کہ اگر آپ کے تمام مقالات خلوص نیت پر مبنی ہیں تو میں خدا سے انکار کرنے کی حد تک بھی آپ کے ساتھ ہوں اور اگر کسی مصلحت سے فی الحال اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتے جو چند ماہ یا چند سال بعد آپ پیش کرنے والے ہیں تو میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ اس پردۂ مصلحت کو فوراً چاک کر دیجئے جو اصل مقصود ہے اسے بھی ظاہر کر دیجئے کیونکہ میں آپ میں اخلاق کی اتنی کمزوری بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔"

(۱) آپ نے تو خیر مسٹر اور مولانا کا قصہ پیدا کر کے بے نیازانہ انداز میں کچھ شاعری سے کام لے لیا۔ لیکن میں کیا کروں جبکہ مجھے یہی علم نہیں کہ آپ واقعی کیا اور کون ہیں تاہم میں بہت خوش ہوتا اگر آپ اس نیاز مند کو ــ ــ ــ صرف نیاز کے لفظ سے یاد کرتیں۔ لیکن بے نیاز کے اضافہ نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس کو قبول کروں یا نہیں۔ میں اس وقت شاعری سے کام نہیں لے رہا اس لئے یہ رد و قبول کا قصہ بھی پیش آیا ورنہ تسمیہ و خطابت کے متعلق ایک عربی شاعر مجد الدین طوسی عجیب و غریب دلنشین نکتہ بتا گیا ہے ؎

اصم اذا نودیت باسمی واننی	اذا قیل لی یا عبدها لسمیع
لا تدعنی الا بیا عبدها	فانه اشرف اسمائی[۱]

۱؎ جس وقت لوگ میرا نام کہہ کر پکارتے ہیں تو میں بہرا ہو جاتا ہوں اور جب اے فلاں کے غلام کہہ کر پکارتے ہیں تو میں سن لیتا ہوں۔ اس لئے اے دوست! مجھ کو تم "اس کا غلام" ہی کہہ کر پکارا کرو کہ میرا یہی نام سب سے بہتر ہے

چہ جائیکہ آپ خود کوئی نام تجویز کریں اور میں لے گردن جھکا کر قبول نہ کروں "نازم بہ بت گی کہ نشانے نہادہ" میری طرف سے "پسندیدگی و عدم پسندیدگی" کی خلش میں آپ کے دشمن مبتلا ہوں، جب تک "خون دو عالم" اپنی گردن پر لینے والے دنیا میں موجود ہیں۔ آپ کیوں اپنی "عشق" کی ناکامی کے خیال سے فکرمند ہوں۔

جلوہ برخود کن و مارا بہ نگہے دریاب

(۲) آپ عرصہ سے میرے ذہنی انقلاب کا مطالعہ کر رہی ہیں" اس سے زیادہ خوش بختی میری اور کیا ہو سکتی ہے "خستگاں را دل بہ پرسشہائے پنہاں بردہ" لیکن معاف فرمایئے اگر میں عرض کروں کہ آپ نے میرے "انقلابات ذہنی" کے انجام پر صحیح رائے زنی نہیں فرمائی اور آپ بھی وہی کہنے لگیں جو دنیا کہہ رہی ہے ع

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ "نام ہے

اگر آپ باور کریں تو میں کہوں کہ میں دنیا میں ہر چیز سے انکار کر سکتا ہوں یہاں تک کہ آفتاب کے طلوع و غروب کا بھی انکار کر سکتا ہوں جو کائنات کا روشن ترین مشاہدہ ہے لیکن خدا کا انکار مجھ سے ممکن نہیں کیونکہ اس کی عظمت و جلال، اس کی وسعت ہمہ گیری، اس کی ابدیت و لانہایت کا علم مجھے نہایت عمیق مطالعہ کے بعد حاصل ہوا ہے اور میں اس کو حد درجہ عزیز رکھتا ہوں۔

خدا نام ہے "خالق کل کا" لیکن مذہب والوں نے اس کے ٹکڑے کر کر کے ہر ٹکڑے کا نام علیحدہ علیحدہ خدا رکھ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خدا نام ہے "محبت" کا اور محبت ہی سے کائنات کو معمور ہونا چاہیئے کہ یہی ہے اصل مفہوم خدا کے "محیط" ہونے کا۔ "اور اسلام کا درس بھی یہی ہے،

میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کو میری نیت کے خلوص کی طرف سے کیوں شک پیدا ہوا۔ کیونکہ وہ شخص جو تمام افرادِ نوعِ انسانی کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس کے باب میں تو غرض و مصلحت کے سوال کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ ہاں البتہ اگر آپکو میرے مقصود کی طرف سے کوئی شبہ پیدا ہوتا تو بے شک آپ کا یہ فرمانا ایک حد تک معقولیت پر مبنی ہو سکتا ہے۔

(۳) میں گذشتہ ماہ کے استفسار کا جواب دینے کے بعد سمجھتا تھا کہ بعض حضرات اس سے وہی نتیجہ نکالیں گے جو آپ نے فرمایا۔ لیکن میں اس کا جواب دینے پر مجبور نہیں ہوں جب تک اس مسئلہ پر منھ کھول کر کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کے اسرائیلی قصص کو "واقعات تاریخی" کی حیثیت سے ثابت کرنے کا مدعی ہے، تو اس کو چاہیئے کہ پہلے ان باتوں کا جواب دے جنھیں میں نے بائبل کے سلسلہ میں ظاہر کیا ہے۔

اس کے بعد میں ظاہر کروں گا کہ قرآن مجید میں ان قصص کو کس انداز سے اور کس مقصود کے لئے بیان کیا گیا ہے۔

(۴) آپ نے آخر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر میں یہ سب کچھ خلوصِ نیت کے ساتھ کہتا ہوں تو آپ منکرِ خدا کی حیثیت سے بھی میرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں اس کے متعلق اس کے سوا کیا عرض کروں کہ میں تو اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کہتا ہوں وہ خلوصِ نیت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اگر آپ پھر بھی میرا ساتھ نہ دیں تو میری بد قسمتی ہے۔ لیکن اگر آپ کی معیت کی تنہا شرط خدا کا انکار ہی ہے تو پھر تیئے یہ بھی کر دیکھیں

من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

(دُوسرا خط)

آپ نے جولائی کے نگار میں جس کیفیت کے ساتھ میری تحریر کا جواب عنایت فرمایا ہے اس کا شکریہ قبول فرمائیے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی "ادبیت" ایک افسوں ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کی تحریروں سے خاص لطف اٹھاتے ہیں۔ آپ نے مذہبی تنقیدوں میں بھی اپنے زورِ قلم سے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے کہ جی چاہے یا نہ چاہے لیکن ان کو دیکھ کر ایمان متزلزل ہی کرنا پڑتا ہے" کا فرماجرائی" کی ایسی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔ میں پہلے بھی سمجھتی تھی کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ خلوص سے خالی نہیں اور اب آپ کے جواب سے اور زیادہ یقین اس کا ہو گیا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کی "تلقین" کو ماننے ہی ایک قسم کا خوف معلوم ہوتا ہے اور جی ہچکچاتا ہے،

کیا آپ اس کا سبب بتا سکتے ہیں؟

فی الحال میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کے نزدیک سب سے بہتر مذہب کون سا ہے اور کیوں؟ اصولِ اسلام میں آپ کو کیا خرابیاں نظر آتی ہیں اور وہ کیونکر دور ہو سکتی ہیں؟

○

نگار، آپ نے میری "ادبیت" کی "فسوں زائی" اور انشا پردازی کی تعریف میں جو کچھ سپردِ قلم فرمایا ہے وہ خواہ کتنا ہی خلافِ حقیقت کیوں نہ ہو لیکن مجھے مغرور بنا دینے کے لئے کافی سے زائد ہے۔

خوش لطافت، انداز، ادا بھی

اگر میں اپنی زندگی میں کسی ایک ہی کا ایمان (بقول آپ کے) "متزلزل" کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے خود بھی اس "کافر ماجرائی" پر فخر کرنا چاہیئے مگر اے میری محترم خاتون، کبھی آپ نے اس حقیقت پر بھی غور فرمایا ہے کہ جس کیفیت کو دنیا "کفر و ایمان" سے تعبیر کرتی ہے وہ صرف لفظی نزاع تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ایک ہی چیز کے دو جدا جدا نام رکھ کر محب دلہ ہو رہا ہے، آہ دنیا کی عمر اس بحث و اختلاف میں گزر گئی ہے کہ پردہ جمال کو "حجاب" کہیں یا "نقاب" اور یہ ہوش کسی کو نہیں کہ طرف نقاب اٹھا کر شاہد مستور کا مشاہدہ کریں جو ان تمام ظاہری امتیازات سے بہت بلند واقع ہے۔ منصور و فرہاد کی سرگذشت پر جو تنقید چاہے کر لیجئے لیکن آخر کار حقیقت وہی ایک نظر آئے گی کہ ؎

آشفتہ نوائے بہ سر دار بر آمد

شوریدہ ادائے بدم تیشہ روان داد

کیا اب بھی آپ مجھ سے دریافت کریں گی کہ میرے نزدیک سب سے بہتر مذہب کون ہے؟ دیکھئے ان لوگوں سے جن کا مذہب صرف "مسلک عشق" ہو اس قسم کے سوالات نہیں کئے جاتے کیا آپ نے نہیں سُنا۔

با دل شدگان ہر کہ در افتاد بر افتاد

کبھی "حیران" سے یہ نہ دریافت کیجئے کہ اُسے "جلوۂ محبوب" کہاں نظر نہیں آتا اور ایک "عاجز و سرگشتہ" سے یہ نہ پوچھئے کہ اس نے شاہد مقصود کو کس جگہ پایا۔ وہ تو آسانی سے کہہ دیگا کہ "ہر جگہ اور کہیں نہیں" لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس جواب کو سن

کہ اپنی ہنسی ضبط کر سکیں گی؟

بیدل کہتا ہے ؎

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست — چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم — کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست
اے سمندر بہوس داغ فروشِ آتش کو — ماہیاں تشنہ بہ میرید دم آب کجاست

لیکن وہ حضرات جن کی سطح بیں نگاہیں صرف الفاظ کو دیکھتی ہیں اس پر ہنستے ہیں۔ آپ کو میری "تلقین" پر یقین لاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے، جی جھجکتا ہے" ——— یوں کیوں نہ کہیئے کہ "کلیجہ دھڑکتا ہے" اس کا جواب بہت عرصہ ہوا دہلی کا ایک شاعر ان الفاظ میں دے چکا ہے کہ:-

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی — پکڑ لیں چور کا دل ہم یہیں سے

مجھے آپ کے اسی خوف اور اسی دھڑکن سے محبت کا سراغ ملتا ہے اور غالباً وہ وقت دور نہیں جب میں آپ کو اپنے "حلقۂ خیال" کا اسیر دیکھ کر آزادی سے کہہ سکوں گا

کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگانِ مائی

میں کوشش کروں گا کہ آپ کے "خدشات" دور کرنے میں کامیاب ہوں اور بالکل اسی طرح (جس طرح آپ چاہتی ہیں)

دل را بطرہ ہائے خم اندر خم افگنم

◎

مذہبی بیماری

جس طرح جلدی بیماریاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ لازم و متعدی۔ اسی طرح دماغی بیماریوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ لازم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو خود دوسروں کا اہل نہ سمجھے اور متعدی یہ کہ دوسروں کو بھی یہ سوچنے دے۔

اسلام نے ایمان و اعتقاد کو دو چیزوں پر منحصر کیا ہے: تصدیق بالجنان و اقرار باللسان۔ یعنی ضمیر کا اطمینان اور اس کا زبان سے اقرار۔ ظاہر ہے کہ جب تک نفس مطمئن نہ ہوگا ایمان و اعتقاد میں استحکام و رسوخ پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب یہ نقش اچھی طرح دل نشین ہو جائے گا تو زبان سے اس کا اقرار اور گفتگو کے ذریعہ سے اس کا اظہار بھی ایک اثر پیدا کرے گا۔ اس اطمینان نفس و ضمیر کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے یہاں تک کہ جب ایک پیغمبر نے خدا کے مشاہدۂ عینی کی خواہش کی تو اس کا سبب بھی یہی اطمینان قلب بتایا گیا۔ ہر چند دنیا اب اس منزل پر نہیں ہے کہ وجود باری پر یقین لانے کے لئے وہ رویت ظاہری کو ضروری قرار دے تاہم ریب و شک، وہم و ظن، اشتباہ و التباس کی کارگاہ ہنوز

قائم ہے اور غالباً زیادہ وسعت و قرآن کے ساتھ زیادہ الجھن اور پیچیدگی لئے ہوئے، پھر یہ کس قدر عجیب و غریب ذہنیت ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی بھی تصدیق کی جاتی ہے کہ ایک شخص کے اطمینانِ قلب کے لئے خدا نے اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا اور دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دی جاتی کہ ہم ان جانشینانِ رسول سے صرف یہ سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بناء پر اپنے آپ کو حاملِ دین سمجھتے ہیں اور وہ دین متین کیا ہے جو فطرتِ انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے۔

اسلام دنیا کا تنہا فطری مذہب ہم کو ہر ہر موقعہ پر غور و فکر، تامل و تدبر کی تعلیم دیتا ہے، وہ ہم کو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل روح نظامِ عالم پر غور کرنا، کائنات اور اس کے مظاہر و آثار کو دیدۂ تنقید و اعتبار سے دیکھنا ہے لیکن مذہب کا علمبردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی، دین درجۂ کمال کو پہنچ گیا اور وہ تعلیم وہی ہے جو وہ بتاتا ہے، وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ بلند سے ظاہر کرتا ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جا سکتا تھا، دیا جا چکا ہے اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو اپنے کسی عمل، کسی قول، کسی حجت و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقلِ انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ترقی کی حد کیا ہوگی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لئے تڑپنے والا اب تک یہی درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی اور ہرزہ کاری کا، دین نام ہے صرف گرانہ اتباع کا اور زبان سے ہر اس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہ ہو، اس کا نام

اس نے "اعلاء کلمۃ الحق" اور "امر بالمعروف" رکھ چھوڑا ہے، درآنحالیکہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام کی اور اس سے زیادہ اشاعت کفر و الحاد کی کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیین و سجین کے ہفت طبقات کی تعیین، کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتش دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ جاہلوں پر ہیبت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا، انکشاف حقائق کا، استقراء و مشاہدہ کا۔ اور اس لئے ٹھیک اس وقت جبکہ وہ منبر پر بیٹھ کر معجزہ و کرامات کا ذکر کرتا ہوتا ہے صاحبان عقل و دانش اس پر ہنستے ہیں اور جن اصول کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے اسی کو دیکھ کر لوگ اور زیادہ اس سے ہٹتے جاتے ہیں، حالانکہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ تعلیم و صداقت کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے، کیونکہ دنیا سے مذہب کے اوہام مٹ چکے ہیں، اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی۔ پھر اگر کوئی اس دور کی ذہنیت میں واقعی صحیح اصول اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔

کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامہ مادیات میں جبکہ انسان صرف ایک میکانکی چیز ہو کر رہ گیا ہے، روح کا اضطراب سکون کا طلبگار ہے جسے اخلاقی یا تمدنی اصطلاح میں دنیا کا امن کہا جاتا ہے، لیکن مبلغین مذہب کو اس کا علم نہ ہوگا کہ وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے اس کے لئے مذہب میں ایک نہایت ہی جامع و پر معنی لفظ صراط مستقیم کا استعمال کیا گیا ہے جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی غور نہیں کیا جاتا جس طرح دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں اس منزل تک پہونچنے کے لئے بھی جو ارتقاء انسانیت کا نصب العین ہے، ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے

قائم ہے اور قانون ازلی وسعت و تغیرات کے ساتھ زیادہ الجھا اور پیچیدگی لئے ہوئے،
پھر برکس تو عجیب و غریب ذہنیت ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی بھی تصدیق کی جاتی ہے
کہ ایک شخص کا طغیان قلب کے لئے خود اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا اور
دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دی جاتی کہ ہم ان جانشینان رسول سے صرف یہ
سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بنا پر اپنے آپ کو حامل دین سمجھتے ہیں اور وہ دین متین
کیا ہے جو فطرت انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے۔

اسلام دنیا کا تنہا فطری مذہب ہے ہم کو ہر موقع پر غور و فکر، تامل و تدبر کی
تعلیم دیتا ہے، وہ ہم کو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل اور نظام عالم پر غور کرنا،
کائنات اور اس کے مظاہر و آثار کو دیدۂ تنقید و احتساب سے دیکھنا ہے لیکن مذہب
کا علمبردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی، دین درجۂ کمال کو پہنچ گیا
اور وہ تعلیم وہی ہے جو وہ بتاتا ہے، وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ بلند سے ظاہر کرتا ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جا سکتا تھا۔ دیا
جا چکا ہے اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس حقیقت
کو اپنے کسی عمل، کسی قول، کسی حجت و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس
دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا
کہ اس کی ترقی کی حد کیا ہو گی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لئے تڑپنے والا اب تک یہی
درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی اور ہرزہ کاری کا۔ دین نام ہے صرف گردن اتباع
کا اور زبان سے ہر اس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہ ہو سکا۔ اس کا نام

اس نے "اعلاء کلمۃ الحق" اور "امر بالمعروف" رکھ چھوڑا ہے، درآنحالیکہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام کی اور اس سے زیادہ اشاعت کفر و الحاد کی کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیین و سجیین کے ہفت طبقات کی تعیین، کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتش دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ جاہلوں پر ہیبت طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا، انکشاف حقائق کا، استقرار و مشاہدہ کا۔ اور اس لئے ٹھیک اس وقت جبکہ وہ منبر پر بیٹھ کر معجزہ و کرامات کا ذکر کرتا ہوتا ہے صاحبان عقل و دانش اس پر ہنستے ہیں اور جن اصول کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے اسے دیکھ کر لوگ اور زیادہ اس سے ہٹتے جاتے ہیں، حالانکہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ تعلیم و صداقت کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے، کیونکہ دنیا سے مذہب کے اوہام مٹ چکے ہیں، اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی، پھر اگر کوئی اس دور کی ذہنیت میں واقعی صحیح اصول اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔

کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ مادیات میں جبکہ انسان صرف ایک "میکانکی" چیز ہو کر رہ گیا ہے، روح کا اضطراب سکون کا طلبگار ہے جسے اخلاقی یا تمدنی اصطلاح میں دنیا کا امن کہا جاتا ہے، لیکن مبلغین مذہب کو اس کا علم نہ ہوگا کہ وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے اس کے لئے مذہب میں ایک نہایت ہی جامع و پرمعنی لفظ "صراط مستقیم" کا استعمال کیا گیا ہے جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی غور نہیں کیا جاتا جس طرح دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں اس منزل تک پہونچنے کے لئے بھی جو ارتقاء انسانیت کا نصب العین ہے، ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے

جس اسلام نے بتایا اور جو تمام نوع انسانی کو بلا تفریق نسل و قومیت بلا امتیاز ملک و ملت یکساں طور پر دعوت دیتا ہے۔

لیکن کیا اسلام کی یہ صلح کل تعلیم، یہ ہمہ گیر درس اخلاق و عمل آج بھی باقی ہے؟ اس کا جواب ان کلید برداران فردوس سے چاہو، ان اجارہ داران خلد سے طلب کرو ان قائدین اسلام و رہنمائے ملت حنیفی سے دریافت کرو جن کے یہاں اخلاق اسلامی نام ہے صرف ایک خاص وضع و صورت کا، ایک مخصوص رسم و رواج کا اور جو آفرینش انسان کی حقیقی غایت حور و قصور اور کوثر و سلسبیل کے حصول کے سوا کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا، پھر وہ لوگ جو خدا کے وجود کے ساتھ مخصوص انداز کی عبادت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا ان سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کس مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ اگر اس سے مدعا وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا ہے —— تو خیر ورنہ ازراہ کرم مجھے بتائیں کہ کلام پاک میں لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر کا کیا مفہوم ہے اور لکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ" سے کیا مراد ہے؟ کیا عبادت و تنسک ایک ہی چیز نہیں۔ کیا نماز اور منسک ایک ہی مفہوم کے دو لفظ نہیں؟

ہمارے علماء کرام کا دینی نظریہ

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو میں نے ایک استفتا مرتب کیا جس کا مضمون یہ تھا:

ایک شخص خاندانی مسلمان ہے اور خود بھی نہایت پابند صوم و صلوٰۃ ہے۔ تہجد گزار ہے، ذکر و شغل کا بھی عادی ہے، وضع ظاہری بھی بالکل شریعت اسلام کے مطابق رکھتا ہے۔ لیکن زندگی اس کی کر و فریب، کذب و افترا، ایذا رسانی و قطع رحم میں بسر ہوتی ہے۔

دوسرا شخص قوم کا برہمن پشتینی کا فرد مشرک ہے، اس کے گلے میں بتوں کی ہیکل پڑی رہتی ہے، رات دن پوجا پاٹ کرتا رہتا ہے مگر اسی کے ساتھ اس کی زندگی ابنائے جنس کی خدمت، یتامیٰ کی پرورش، بیواؤں کی ہمدردی میں بسر ہوتی ہے اور اس کی ذات یکسر امن و سکون ہے۔

براہ کرم مذہب اسلام کے نقطۂ نظر سے بتلائیے کہ ان دونوں میں کون ناجی ہے اور کون ناری یا دونوں ناجی ہیں یا دونوں ناری، اگر آپ چاہیں

تو استناداً قرآن حدیث، اقوالِ اکابر کا حوالہ دے دیں ورنہ اس کی چنداں
ضرورت نہیں ہے مجھے صرف جناب کی رائے بحیثیت ایک عالمِ دین ہونے
کے درکار ہے۔

اس کی مطبوعہ نقلیں بغرض حصول جواب ہندوستان کے ۳۲ مشہور علمائے کرام کے نام روانہ کی گئیں جن میں صرف ۱۴ حضرات نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی۔

ان جوابات کو اگر ان کی مختلف ذہنیتوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو ان کو چار علیحدہ علیحدہ قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ضعیف و کمزور یا مصلحت اندیش ذہنیت جو کسی قسم کا جواب دینا پسند نہیں کرتی۔ دوسری وہ جسے ہم "مذبذبین" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، تیسری وہ جس کا تعلق "راسخون" سے ہے اور چوتھی وہ جو بالکل غیر جانب دار رہنا چاہتی ہے اور عدم علم کا اظہار کرتی ہے۔

اول الذکر ذہنیت کی مثال آپ کو صرف مولانا اشرف علی صاحب کے جواب میں نظر آئے گی کہ انھوں نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ اس کی بھی کوشش کی کہ ان کی شخصیت کا پتہ نہ چلے۔ کیونکہ انھوں نے جواب میں نہ اپنے دستخط ثبت فرمائے اور نہ مقام درج کیا۔

انھوں نے جو جواب دیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے کہ:۔

" سوال تنقیح طلب ہے جو تحریر میں خالی از تکلف نہیں ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے"

مولانا کا منشا اس جواب سے غالباً یہ ہے کہ اس استفسار یا استفتا پر بعض

تنقیحیں (عدالتی نہیں بلکہ دینی و مذہبی) قائم ہونا چاہیئے اور ان تنقیحوں کے قائم کرنے میں انہیں تکلف ہے تکلیف کا اندیشہ ہے اس لئے ایسے سوال کا جواب زبانی ہو سکتا ہے کیونکہ کوئی شخص لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے کی زحمت اختیار کرے گا۔ (ورنہ مولانا کو جواب دینے کی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ یہی وہ "نازک فرائی" ہے جو سودا کے زمانہ میں صرف "مرغ قبلہ نما" کو تڑپا دیتی تھی لیکن اب "حطیم کعبہ" کو متزلزل کر رہی ہے۔

شکر ہے کہ اس ذہنیت کی مثال مجھ کو تمام جوابوں میں صرف ایک ہی ملی اور وہ بھی ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو شاید مسائل روزہ و نماز سے زیادہ کسی ایسے استفسار کا جواب دینے کی اہل نہیں ہے جو فلسفۂ مذہب سے متعلق ہو یا جو کسی اصولی گفتگو سے۔

باقی تین ذہنیتوں میں سے وہ ذہنیت جس کو میں نے "راسخون" میں داخل کیا ہے یا جدید سیاسی اصطلاح میں قدامت پسند یا کنسرویٹیو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حسب ذیل حضرات کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے۔

قاضی صاحب بھوپال۔ مفتی صاحب رام پور۔ مفتی صاحب حیدر آباد۔ مولانا حسین احمد صاحب مفتی دیوبند۔ مولانا نثار احمد صاحب مفتی آگرہ۔ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب۔ مولانا احمد سعید صاحب دہلی۔ مولانا محمد عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان شاہ پھلواروی۔ مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی لکھنؤ، مولانا محمد عبد العزیز صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب،

ان حضرات نے نہایت صفائی اور پورے رسوخ و یقین کے ساتھ حکم لگایا ہے کہ مسلمان چاہے کچھ کرے۔ بہر حال ناجی ہے بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہو اور بت پرست کافر کتنا ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو اس کا ناری ہونا یقینی ہے۔

غیر جانبدار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے والی ذہنیت مولانا عبدالستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اوّل الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ "لب کشائی" نہیں کر سکتے۔ اس کا علم مالک الملک کو ہے۔ اس طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی،

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے:

"دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اس "لیکن" پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے اور ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

یہ تھا ایک سرسری اور مختصر سا جائزہ یا عمومی تبصرہ جو علماء کرام کے جوابات پر کیا گیا ہے۔ اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک اصولی گفتگو اس مسئلہ پر کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ عقل انسانی یا فطرت انسانی جس پر اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا بیان کیا جاتا ہے ان جوابات میں سے کسی جواب پر مطمئن ہو سکتی ہے یا کسی پر نہیں،

مولانا عبدالستار صاحب لاہوری اور مولانا احمد صاحب کے جوابات تو قطعاً لائق اعتناء نہیں کیونکہ جب وہ اسلام کی صداقت کے مدعی ہونے کے بعد اس کی پیروی کر رہے ہیں تو ان کا یہ کہنا کہ ہمیں علم نہیں کون ناری ہے اور کون ناجی اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلام سے بہتر کسی اور مذہب کے ہونے کا امکان باقی ہے اور وہ ایک ایسے مسلک کے ماننے والے ہیں جو خود ان کے اندر کوئی کیفیت یقین و رسوخ کی پیدا نہیں کرتا،

غیر جانب دار یا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے والی ذہنیت مولانا عبدالستار لاہوری اور مولانا احمد احمدی کے جوابات سے ظاہر ہوتی ہے، اوّل الذکر نے صاف طور پر لکھا ہے کہ ناری اور ناجی ہونے کے متعلق وہ "لب کشائی" نہیں کر سکتے۔ اس کا علم مالک الملک کو ہے۔ اسی طرح ثانی الذکر صاحب نے صفائی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ اس کو خدا بہتر جانتا ہے کہ کون ناری ہے اور کون ناجی،

اب صرف ایک جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا رہ گیا جس کو میں نے مذبذب ذہنیت کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ وہ جواب شروع کرتے ہیں ان الفاظ سے کہ:

"دونوں ناری ہیں" اور ختم کرتے ہیں اس "لیکن" پر جس میں مسلمان کے بخشے جانے اور کافر کے نہ بخشے جانے کا امکان ظاہر کیا ہے اور ایک شخص کے لئے دشوار ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کس کا اعتبار کرے اور کس کو صحیح جواب خیال کرے۔

یہ تھا ایک سرسری اور مختصر سا جائزہ یا عمومی تبصرہ جو "علماء کرام" کے جوابات پر کیا گیا ہے۔ اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک اصولی گفتگو اس مسئلہ پر کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ عقل انسانی یا فطرت انسانی جس پر اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا بیان کیا جاتا ہے ان جوابات میں سے کسی جواب پر مطمئن ہو سکتی ہے یا کسی پر نہیں،

مولانا عبدالستار صاحب لاہوری اور مولانا احمد صاحب کے جوابات تو قطعاً لائق اعتناء نہیں کیونکہ جب وہ اسلام کی صداقت کے مدعی ہونے کے بعد اس کی پیروی کر رہے ہیں تو ان کا یہ کہنا کہ ہمیں علم نہیں کون ناری ہے اور کون ناجی اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلام سے بہتر کسی اور مذہب کے ہونے کا امکان باقی ہے اور وہ ایک ایسے مسلک کے ماننے والے ہیں جو خود ان کے اندر کوئی کیفیت یقین و رسوخ کی پیدا نہیں کرتا،

اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کیوں مذہب اسلام کو صحیح مذہب مانتے ہیں تو اصولاً وہ یہی جواب دیں گے کہ اسلام ان کے نزدیک سب سے بہتر مسلک ہے لیکن اس کے بعد اگر ان سے دریافت کیا جائے کہ کیا اسلام کا بہترین مسلک ہونا ان کے نزدیک اس لئے نہیں ہے کہ اسی پر ان کی نجات منحصر ہے، تو کیا ان کو یہی جواب دینا چاہیئے کہ اس کا علم ان کو نہیں ہے، حیرت ہے کہ وہ اس عالم ریب و شک میں کس طرح اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں اسلام کا متبع کہہ سکتے ہیں اور دوسروں کو دعوت اسلام کیونکر دے سکتے ہیں جبکہ خود انہیں اس امر کا یقین نہیں کہ اسلام نجات کا ضامن ہے۔ مجھے مولانا احمد احمدی کے اس جواب پر بہت زیادہ حیرت ہے کیونکہ احمدی جماعت بالکل تبلیغی جماعت ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ کسی کو بھی اپنے مسلک کی طرف دعوت دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا جواب بھی زیادہ توجہ طلب نہیں۔ کیونکہ انھوں نے کوئی یقینی بات نہیں کہی۔ اگر وہ صرف دونوں کے ناری ہونے پر حکم لگاتے تو گفتگو ہو سکتی تھی لیکن چونکہ اخیر میں انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ "ممکن ہے پہلا بخشا جائے اور دوسرا نہیں۔ اس لئے جو گفتگو راسخون کے جوابات کے سلسلہ میں ہو گی، وہی مولانا ندوی کے فتوے کے خلاف پیش کی جا سکتی ہے

جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے منجملہ سولہ حضرات کے بارہ نے پورے وثوق کے ساتھ مسلمان کے ناجی ہونے پر حکم لگایا ہے، خواہ وہ کتنی ہی معصیت کرے اور برہمن کے ناری ہونے کا فتویٰ دیا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں اس لئے کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لئے پہلے چند تنقیحوں کا قائم کر لینا ضروری ہے۔

(۱) مذہب کا مقصد صحیح کیا ہے؟
(۲) اخلاق حسنہ کی غایت کیا ہو سکتی ہے؟
(۳) مادی و ناجی ہونا کسے کہتے ہیں؟
(۴) خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے؟

اگر ہم ان چار باتوں کا فیصلہ کر سکے تو ان علماء کرام کے جوابات پر بھی تنقید کر سکیں گے۔ اور خود بھی اپنے استفتاء کا جواب دے سکیں گے جو ھندوستان کے اتنے حاملین شریعت کے پاس بغرض حصول فتویٰ بھیجا گیا تھا۔

●

چونکہ مختلف اوقات میں مختلف مذہبی مباحث کے تحت نگار میں ان تمام امور پر اس سے قبل کافی گفتگو ہو چکی ہے، اس لئے زیادہ میں تفصیل و طوالت سے کام نہ لوں گا بلکہ مختصراً صرف انھیں امور کو پیش کروں گا جو مسئلہ زیر بحث پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری ہیں۔

تنقیح اول کے متعلق ساری دنیا کی متفقہ رائے یہی ہے کہ مذہب کا مقصد اصلاح اعمال، تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسی طرح تنقیح دوم کے متعلق بھی یہی ایک رائے پائی جاتی ہے کہ اخلاق حسنہ کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان دنیا کے نظام تمدن میں عضو مفید کی حیثیت اختیار کر کے دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے۔ ابنائے جنس کے نظام عمرانی میں ایک فرد معاون ہو کر زندگی بسر کرے اور نفسی و ذاتی اغراض سے شیرازۂ اخوت عامہ کو درہم برہم نہ ہونے دے چنانچہ یہی وہ اصل اصول تھا جس کی بناء پر شریعتیں مرتب ہوئیں، قوانین وضع

گنے گئے اور اچھے بُرے افعال کی فہرست ترتیب دے کر عوام کے سامنے گناہ و ثواب اور سزا و جزا کی تعیین کی گئی تاکہ جو لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں وہ بھی اصل راہ سے منحرف نہ ہوں اور قانونی پابندی سے ان کی بے راہ روی کو متعذر بنایا جائے۔

تیسری تنقیح سب سے زیادہ اہم تنقیح ہے کیونکہ استفتاء میں یہی دریافت کیا گیا تھا اور اسی میں مجھے اکثر علماء کرام سے اختلاف ہے۔ عام طور پر ناری و ناجی ہونے کا تعلق "حیات بعد الممات" سے سمجھا جاتا ہے یعنی جب انسان مرجائے گا تو جو اعمال دنیا میں اس نے کئے ہیں ان کے لحاظ سے اس کو انعام یا سزا ملے گی اور اس انعام و سزا کو بہشت و دوزخ کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عذاب و ثواب جسم کے ساتھ ہوگا اور دوزخ میں واقعی سانپ بچھو، اور آگ کے شعلے ہوں گے اور جنت میں حقیقتاً حوریں، غلمان، باغ اور میوے وغیرہ ہوں گے، لیکن بعض کہتے ہیں کہ عذاب و ثواب روحانی ہوگا۔ اور دوزخ و جنت کا بیان صرف تشبیہی و تمثیلی ہے، بہرحال وہ انعام و سزا جسمانی ہو یا روحانی، نتیجہ ہے اعمال حسنہ یا افعال سیئہ کا جو اس دنیا میں انسان سے سرزد ہوتے ہیں۔

اس وقت اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ مرنے کے بعد سزا یا جزا کا مفہوم نتیجہ خیز و قابل یقین امر ہے یا نہیں بلکہ میں اس کو حرف بحرف صحیح ماننے کے بعد ناجی و ناری کے مفہوم پر ایمان لاتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ناری و ناجی ہونے کا تعلق علاوہ اعمال حسنہ کے کسی اور چیز سے ہے اور اگر ہے تو کیوں؟

جو کچھ اوپر بیان ہوچکا ہے اس سے لازماً ہر شخص اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ چونکہ مذہب کا مقصود اصلی اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے اس لئے ناری و ناجی ہونے کا انحصار صرف اخلاق انسانی پر ہونا چاہیئے اگر وہ بُرے ہیں تو ہم کہیں گے کہ وہ ناری ہے

حیات بعد الموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے، بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوعِ انسانی ——— اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی تو وہ اپنے مُردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور پس ماندگان کے ساتھ ان کا وہی تعلق باقی ہے جو زندگی میں پایا جاتا تھا۔ اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ رُوح اور جسم دو بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور جب رُوح جسم سے جدا ہوتی ہے تو اس کی ہستی کسی نہ کسی طرح قائم رہتی ہے چنانچہ اسی بناء پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں تاکہ اس کو حیات بعد الموت کے طویل سفر میں تشنگی و گرسنگی کی تکلیف نہ پہنچے (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی عہد وحشت اور اسی اعتقادِ جاہلانہ کی یادگار ہیں)

خیر، اگر عہدِ قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھا جاتا تو جائے حیرت نہیں کیونکہ وہ غریب حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا لیکن اب کہ آغازِ حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہو گیا ہے روح کے بقا کا قائل ہونا سخت حیرتناک امر ہے۔

حیاتِ حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد صرف ایک خلیہ یا کریا (cell) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو[1]۔ اس پیوند کے بعد بے شمار خلایا بنتے رہتے ہیں یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور ایک وقتِ معینہ کے بعد وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے پھر حیاتِ دنیاوی

---

[1] نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پاکر اور اپنے اندر سے کثیر خلایا پیدا کرکے نشوونما کا باعث ہوتا ہے۔

اور اچھے ہیں تو حکم لگائیں گے کہ وہ ناجی ہے۔

اس لئے ہمارے علماء کرام کا فاسق و فاجر مسلمان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ بہر حال وہ ناجی ہے اور خوش اخلاق برہمن کی نسبت یہ فتویٰ صادر کرنا کہ وہ کچھ کرے نجات اس کی ممکن نہیں یقیناً مت ذکرہ بالا اُصول سے علٰحدہ کسی اور اصول پر مبنی ہوگا پھر آئیے غور کریں وہ اُصول کیا ہو سکتا ہے ؟

میں نے جہاں تک غور کیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علماء کرام نے مذہب اسلام اور اخلاق حسنہ کو علٰحدہ علٰحدہ دو چیز قرار دیا ہے اور ان کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے وہ اس طرح ہے کہ ان دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اور افتراق بھی، یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو لیکن اخلاق حسنہ نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی میں اخلاق حسنہ موجود ہوں اور وہ مسلمان نہ ہو۔ یعنی اصل چیز ان کے نزدیک اخلاق انسانی نہیں بلکہ محض مسلمان ہونا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں ؟

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض مسلمان ہونا ہی نجات کا ضامن ہے اور انسان کے اچھے اعمال کوئی چیز نہیں ہیں تو پھر اسلام کا مقصد کیا ہے اور اسلام کس چیز کا نام ہے ؟

جن علماء کرام نے بدکار مسلمان کے ناجی ہونے اور نکوکار برہمن کے ناری ہونے پر حکم لگایا ہے وہ گویا بہ الفاظ دیگر اس بات کے معتقد ہیں کہ محض خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کر لینا یا یوں کہیئے کہ ان کی مقرر کی ہوئی ایمان مجمل و مفصل کی عبارت کو ایک اشلوک کی طرح پڑھ کر اعتقاد کر لینا کافی ہے اور کائنات میں انسان کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ ان چند الفاظ کو یاد کر لے۔ کیونکہ خدا اور اس کی خدائی کائنات

اور اس کا جملہ نظام عبارت ہے انھیں دو سطروں کے حفظ کر لینے سے۔

اگر حقیقتاً اسلام یہی ہے اور اس کی تمام تعلیمات کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے تو ہم کو تنقیح چہارم کا پہلے فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ کہ خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے یعنی خدا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا وہ ضرورت صرف ایک شخص کے اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے پوری ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ میرے نزدیک زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ خود انھیں علماء کرام کے اعتقاد کے مطابق خدا کی ذات بے نیاز ہے اور وہ ہماری عبادت، ہماری نیایش بلکہ خود ہماری اس ساری کائنات کی ہستی کی طرف سے بالکل بے پروا ہے۔ نہ آفرینش سے اس کی کوئی غرض وابستہ ہے نہ ہلاکت و فنا سے، اس نے اگر عالم کو پیدا کیا تو اس طمع و غرض سے نہیں کہ کوئی اس کا نام لے گا اور اگر وہ سب کو تباہ و برباد کر دے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اگر وہ ہمارے انسانی بادشاہوں اور رئیسوں کی طرح نہیں ہے تو نہ اس میں جذبۂ انتقام کی پرورش ہوتی ہے اور نہ جذبۂ استحسان کی۔ کوئی عمر بھر اگر اس کی عبادت کرے تو وہ اپنے اصول بدلنے والا نہیں اور اگر کوئی ہر وقت اسے گالیاں دے تو اس سے متاثر نہیں ہوتا اس لئے اب سوال نہ اصطلاحی عبادت کا رہا نہ اصطلاحی کفر کا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہماری عبادتیں اگر کسی غرض سے وابستہ ہو سکتی ہیں تو وہ خدا سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ خود ہماری فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا اثر ہماری ہی دنیاوی زندگی پر پڑنا چاہیئے، دنیاوی زندگی کی تخصیص میں نے اس لئے کی کہ اخروی زندگی کے ماننے کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کیوں اس سلسلہ کو قائم رکھے اور اس سے حیات انسانی و تمدن انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور جبکہ

بقول مقتدایان مذہب دو بارہ عالم آب و گل میں آنا نہیں ہے تو جزا و سزا نتیجہ کے لحاظ سے بالکل بے کار چیز ہو جاتی ہے۔ سزا و جزا کا مدعا یہ ہے کہ ایک شخص آئندہ فعل مذموم سے احتراز کرے، لیکن جب اس کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی ہے اور دار العمل ختم ہو جاتا ہے تو سزا و جزا محض ایک لایعنی شے ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہر حال جو صورت ہو یہ بالکل یقینی ہے کہ خدا سے ہماری عبادت و نافرمانی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی خدا اس سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر خود ہمارے اوپر ہوتا ہے اور وہ اثر فلاح و بہبود یا ہلاکت و زوال کے سوا کچھ نہیں

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے کیوں اعمال حسنہ کو تنہا ذریعۂ نجات قرار نہیں دیا۔ سو آئیے سب سے پہلے قرآن میں جستجو کریں کہ اس کا کیا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اس کے فیصلہ سے علماء کرام کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں جہاں کہیں ایمان و اسلام کا ذکر آیا ہے وہیں اعمال صالحہ کو بھی اس کے ساتھ لازم کر دیا ہے اور بغیر افعال حسنہ کے ایمان کا کوئی مفہوم قرار نہیں دیا گیا۔ قرآن میں کثرت سے اس مفہوم کی آیات موجود ہیں مثلاً چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

انما المومنین اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم یعنی مومنین کی پہچان یہی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور باہم گر امن و صلح صلاح و فلاح کی زندگی بسر کریں۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ۔ یعنی جو کوئی (خواہ وہ کسی ملک و قوم کا ہو) ذرہ برابر نیکی کریگا اس کا نتیجہ دیکھ لیگا

اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اس کا نتیجہ پائے گا۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم

یعنی اللہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر بُری یا بھلی کوئی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

ان اللہ لا یظلم الناس شیئا ولکن الناس انفسہم یظلمون بلکہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود انسان ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی متعدد آیات ایسی پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کا مفہوم ہی عمل صالح ہے۔ چنانچہ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوتا ہے۔

ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وما ھم بمومنین۔ یعنی بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے درآں حالیکہ وہ مومن نہیں ہیں۔

کیوں؟ اس لئے کہ ان کے اعمال اچھے نہیں ہیں، اور اُن کے اخلاق بُری ہیں پھر کیا اس آیت کے تحت وہ مسلمان جن کا ذکر میں نے اپنے استفسار میں کیا ہے، ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا؟ اور اس کو ناری نہیں کہہ سکتے؟

اسی طرح کثرت سے کلام مجید میں اعمال و نتیجۂ اعمال کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

لیس للانسان الا ما سعی۔ یعنی انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی ہے اور وہی ملے گا جو اس کے عمل کا تقتضاء ہے۔

پھر کیا اس اصول کے ماتحت وہ برہمن اپنے اعمالِ حسنہ کا اجر نہ پائیگا اور وہ مسلمان اپنے افعالِ سیئہ کی سزا کا مستوجب نہ ہوگا اور کیا اس اجر و سزا کو ناجی و ناری کے الفاظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی الجھن جس چیز نے پیدا کر دی ہے وہ شرک و توحید یا کفر و اسلام کی تفریق ہے۔ چونکہ مشرک و کافر کے لئے قرآن میں جابجا ناری ہونے کی وعید آئی ہے، اور مشرک و کافر کا مفہوم بُت پرست یا غیر مسلم قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے ایک مولوی نہایت آسانی کے ساتھ ایک غیر مذہب والے کے ناری ہونے پر فتویٰ صادر کر دیتا ہے، خواہ اس کے اعمال کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں۔

میرے نزدیک کفر و اسلام یا شرک و توحید کا مفہوم ہی اُن لوگوں نے بالکل غلط سمجھا ہے جس طرح توحید کے معنیٰ زبان سے خدا کو ایک کہہ دینے کے نہیں ہیں اسی طرح شرک کے معنی بُت پرستی کے نہیں ہیں۔ توحید سے مقصود خدا کو ایک کہنا نہیں۔ کیونکہ ایک کی نسبت بھی اس کے شان کے منافی ہے، بلکہ اس سے مراد اس کو کل سمجھنا ہے اور اپنے آپ کو بھی اسی کل کا جزو قرار دے کر تمام قوائے عمل سے کام لے کر تمام ان مدارج ارتقاء کو طے کرنا ہے جو اس کل یا قدرت نے سعی و عمل کے لئے مخصوص کر دئے ہیں چونکہ بت پرست اقوام، یعنی وہ قومیں جو تمام کاموں کا انحصار بتوں کی خوشنودی پر رکھتی ہیں، رفتہ رفتہ اپنے تمام عزائم و قوائے کاسبہ کو مضمحل بنا لیتی ہیں اس لئے رفتہ رفتہ انسانی عمران و تمدن کو تباہ کر کے خود بھی تباہ ہوتی ہیں۔

چونکہ عہدِ رسالت ... مشرکین عرب کی حالت بالکل اسی طرح درجۂ انحطاط پر پہونچ گئی تھی اس لئے شرک کفر کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا بغیر اس کے کہ انھیں

فلسفۂ کفر و اسلام کو سمجھا جاتا جس کے سمجھنے کے وہ اہل نہ تھے۔

اس لئے معلوم یہ ہوا کہ محض کفر و شرک بغیر کسی سبب کے معصیت نہیں ہے اور خود خدا کی خوشنودی یا برہمی یا اس کے اعزاز و توہین کا سوال اس میں پنہاں نہیں ہے اگر کوئی رسول پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی قوم کے لئے قوانین وضع کرتا ہے یا کوئی اسلوب حیات متعین کرتا ہے تو اُس سے مراد اس کی یہ ہوتی ہے کہ قوم ان پر کاربند ہو کر ترقی کرے محض ان قوانین کا حفظ کر لینا یا بالکل مادی طور پر رسم و رواج کی طرح اس اسلوب زندگی پر عامل ہو جانا مفید مدعا نہیں۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان باوجود نماز روزہ و دیگر احکام کی شریعت کی پابندی کے اپنے اندر کوئی معنوی یا روحانی تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان اعمال و شعائر کی پابندی اس کی نجات کے لئے کافی ہے (جیسا کہ ہمارے علماء کرام نے اپنے فتاوے میں ظاہر کیا ہے) تو میں اس کو بھی شرک و کفر ہی قرار دوں گا اور ایک بدکار بُت پرست کے مقابلہ میں اس کو کوئی ترجیح نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان سوا اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک نے بُت پتھر کا بنایا ہے اور دوسرے نے وہم و خیال کا۔ ... وہ اگر صرف مورت کی پرستش کو انجام مقاصد کا ذریعہ سمجھتا ہے تو یہ صرف نماز و روزہ کو اصل ایمان قرار دیتا ہے اس کا خدا پارۂ سنگ ہے اور اس کا بُت نماز،

اسی طرح اگر کوئی شخص بُت پرستی کے بعد اعمال حسنہ کا حامل ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کے اخلاق کی پاکیزگی کو بے نتیجہ و لایعنی قرار دیں۔ اگر یہ نتیجہ اس کی بُت پرستی کا نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ آپ اس کی بُت پرستی کو ایک لایعنی شے کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی حکم لگا سکتے ہیں کہ اگر وہ بُت پرست نہ ہوتا تو بھی چونکہ

فطرت کی طرف سے اس کو طبع سلیم عطا ہوئی تھی، اس لئے اسی طرح کا پاکیزہ اخلاق کا انسان ہوتا۔ لیکن یہ حق آپ کو کب حاصل ہے کہ اس کے افعالِ حسنہ کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ پس اس صورت میں کیا اسلام کا مفہوم بُت پرستی کے علاوہ کچھ اور رہ جاتا ہے؟ کیا اس صورت میں آپ اس کے قائل نہیں ہوتے کہ اسلام کا مقصود صرف ظاہری مراسم کی پابندی ہے اور کیا قرآن میں اس سے انکار نہیں کیا گیا ہے اس لئے میرے نزدیک اس فتویٰ کا صحیح جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ:

"ایک بدکار مسلمان قطعاً ناری ہے اور ایک نکوکار برہمن یقیناً ناجی"

سید سلیمان ندوی سے

معاصر معارف کے فاضل محرر نے فروری ۱۹۳۱ء کے شذرات میں جو ابتدائی دو صفحے تحریر فرمائے ہیں خواہ وہ کتنے ہی عام مصلحانہ انداز میں کیوں نہ لکھے گئے ہوں لیکن لکھنے والے کی تعمیم میں ایک ایسی تخصیص اور اس کی نگاہ غلط انداز میں ایسی پرسش پنہاں موجود ہے کہ ہم کیا دنیا جان سکتی ہے کہ کس کو بسمل کرنے کے لئے مولانا نے اپنے "دست و بازو" کو رنج پہونچانے کی زحمت گوارا کی ہے۔

"قربان نگہے تو شوم باز نگاہے"

جنوری کے نگار میں اس مضمون کو دیکھ کر جس میں علمائے کرام کے فتاوی اور ان کے نظریہ دینی پر تنقید کی گئی تھی، سب سے زیادہ جس کو متوجہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی ہی تھے کیونکہ انھیں کا فتویٰ ایسا تھا جو صنعت تندیس میں لکھا گیا تھا اور اس لئے انھیں پر اس کی شرح و تفسیر واجب تھی لیکن ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے شذرات کے صرف دو صفحات پر کفایت فرمائی جو حقیقتاً بہ اندازۂ نیم

نگاہ" بھی تسکین بخش نہیں، پھر اس سے زیادہ ہماری نارسائی بخت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ٹھیک اس وقت جبکہ نگار جنوری کی اشاعت کے بعد ہم اپنے آپ کو ساری دنیا کی طرف سے "نوید" قتل و ذبح" پہونچا رہے تھے ترکش سلیمانی سے ایک تیر صرف بھی کیا جاتا ہے تو شکستہ پر، گستہ سوفار، نشانہ سے الگ اور سست رفتار،

کیا یہی ہے جسے ناوک فگنی کہتے ھیں۔

ہم کو محترم مولانا سے جو دار المصنفین ایسے خانوادۂ علم و فضل کے چشم و چراغ اور شبلی اسکول کی ذہنیت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ یہ توقع تھی کہ وہ نگار کے فتاوی والے مضمون کو دیکھ کر ہماری غلطیوں کی اصلاح فرمائیں گے جو شکوک و اوہام ہم ایسے عامی و جاہل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں: انھیں اپنے فاضلانہ طرز استدلال سے دور کرنے کی سعی کریں گے، اور اگر یہ سب نہیں تو کم از کم وہ اس قدر عنایت تو ضرور روا رکھیں گے کہ اپنے "مکن والے" معمہ کو حل کر کے فتوے کے صحیح مفہوم سے دنیا کو آگاہ کر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ انھوں نے اپنے منصب دینی کے لحاظ سے اس مسئلہ پر کوئی توجہ کی اور نہ دوستانہ حیثیت سے ہم کو لائق اعتنا سمجھا ہے

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مولانائے محترم نے اپنے شذرات میں جو کچھ اظہار خیال فرمایا ہے وہ ان کے نزدیک ایسے اصول راسخہ سے متعلق ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے (اور تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں) تو پھر وہ اصول از خود باطل ہو جاتے ہیں جن پر فتاوے والے مضمون کی بنیاد قائم کی گئی تھی اور اس طرح کسی تفصیلی گفتگو کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اچھا

آیئے تو ان اصول پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جو مولانا نے قائم کئے ہیں اور غور کریں کہ ان میں کون سی نئی چیز پائی جاتی ہے۔

شذرات میں ابتدائی چار ٹکڑے اسی موضوع کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

> "ہر قسم کی کامیابی صرف دو چیزوں پر موقوف ہے ایک تو چند طے شدہ اصولوں کو دل سے تسلیم کر لینا۔ اور دوسرا ان طے شدہ اصولوں کے مطابق سختی سے عمل کرنا ان کو عام محاوروں میں اصول و عمل کہو یا مذہب کی زبان میں ایمان و عمل۔ بات ایک ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے اصول، پھر عمل، یا پہلے عمل اور پھر اصول ظاہر ہے فلسفیانہ حیثیت سے یہی جواب ملے گا کہ پہلے اصول پھر عمل ——— یہ کہنا کس قدر حماقت ہے کہ پہلے پابندی پھر اصول یا پہلے عمل پھر ایمان"

ہم کو بھی اس سے حرف بحرف اتفاق ہے اور کون ہے جو اصول کی تعیین سے پہلے پابندی اور ایمان کی تعیین سے قبل عمل کا مطالبہ کرے گا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ آجکل مسلمانوں نے جس چیز کو اصول یا ایمان قرار دے رکھا ہے وہ حقیقتاً اصول یا ایمان ہے بھی یا نہیں،

مولانا معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کر دوں کہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں میرا اصل اعتراض تو یہی ہے کہ اصول ایمان کی صحیح تعیین ہی باقی نہیں رہی اور پابندی یا اعمال ہی کو اصول یا ایمان قرار دینے کی حماقت میں دنیا مبتلا ہے میں کب کہتا ہوں کہ کسی منزل کی تعیین نہ کیجئے۔ کوئی مقصود سامنے نہ رکھئے کوئی غرض مشترک

ذبح کیجئے کیونکہ بغیر اس کے جہد و عمل، سعی و اقدام، کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ میں خود اس وقت ایک مولوی سے ہراس صاحب جبہ و دستار سے جو خود کو تنہا آلۂ رشد و ہدایت سمجھ کر عوام کی دسترس سے دور، قدیم روما و یونان کے غضب آلود دیوتا جیوپیٹر کی طرح کبر و غرور کی شکنیں چہرہ پر ڈالے ہوئے ایک مرتفع مسند پر اپنے آپ کو اس قدر بلند کھینچے ہوئے ہے۔ میں یہی دریافت کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اور اس رسول کے لئے جس کا تو جانشین بنا ہوا ہے، بتا اور صحیح صحیح بتا کہ ایمان کیا ہے، اصول مذہب کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے "نماز و روزہ و تسبیح و توبہ و استغفار" میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایمان نام درستی اخلاق کا نہیں، اصول خیر و نجات تزکیۂ نفس و روح سے متعلق نہیں۔ وہ اس کے جواب میں "ہاں" تو کہہ دیتا ہے لیکن اس کا وعظ یہی ہوتا ہے کہ اصل چیز صرف نماز ہے ایک مخصوص طریقۂ عبادت ہی کا نام ایمان ہے اور کوئی شخص اس طریق سے علیحدہ ہو کر چلتا ہے تو وہ گمراہ رہے گا خواہ اس کے اخلاق کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں؟

پھر اب میں خود مولانا ندوی سے پوچھتا ہوں کہ اصول کی تعئین ایمان کی تخصیص کو کس نے نظرانداز کیا، طریق کار اور راہِ عمل کو کس نے اصل ایمان قرار دیا، میں نے جو صرف نکوکاری کو اصول و ایمان قرار دیتا ہے، یا اس مولوی نے جو کہتا ہے کہ "اخلاق حسنہ سے نجات ممکن نہیں، جب تک ایک شخص خاص وضع، خاص لباس، خاص قسم کی داڑھی اور متعین حرکات کے ساتھ نماز پڑھنے والا نہ ہو"

خدارا اب آپ ہی فیصلہ کیجئے، داوری آپ ہی کے ہاتھ ہے کہ وہ کون ہے جو ذریعہ کو صرف ذریعہ سمجھتا ہے اور وہ کون ہیں جنہوں نے ذریعہ کو اصل مقصود قرار دے لیا ہے۔

○

شذرات کا دوسرا ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"کسی سمجھدار انسان سے کوئی کام نتیجے کے بغیر صادر نہیں ہو سکتا وہی نتیجہ اس کام کی غرض وغایت ہوتی ہے، اخلاق، محض اخلاق کا تصور غرض وغایت اور نتیجے کے بغیر ممکن نہیں، اخلاق کا کمال اعمال میں نہیں بلکہ ان کی غرض وغایت کی بلندی اور ذاتی خواہشوں اور طلب معاوضہ سے انتہائی پاکی میں ہے۔ انسان کے اعمال کا پست اور ذلیل جذبات نفسانی ہوا اور ہوس سے پاک ہونا اخلاق کی بلندی اور طہارت کے لئے ضروری ہے انسان کا کام صرف اس قدر نہیں ہے کہ کسی غریب آدمی کو چند پیسے دیدے بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ یہ کام اس طرح کیا جائے کہ کرنے والے کا مقصود اپنی ناموری نمائش، معاوضہ، فریب اور اس غریب کو ممنون احسان بنانا نہ ہو بلکہ صرف اخلاص قلب ہو۔ ان قلبی جذبات اور دل کے رجحانات کی اصلاح و پاکی سوا اس کے ممکن نہیں کہ ایک دانائے رموز و عالم الاسرار ہستی کا یقین کیا جائے جو دلوں کے ایک ایک رگ کی جنبش اور ایک ایک ریشہ کی حرکت کو دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے اس لئے خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل اور حسن خلق کا تصور ممکن ہی نہیں کہ جوارح کے اعمال کی درستی، سراسر قلب کے اعمال کی درستی پر موقوف ہے۔"

مولانا کا مقصود اس تحریر سے غالباً یہ ہے کہ اخلاق کی بلندی کا معیار صرف اخلاص ہے اور اخلاص حاصل ہونا ممکن نہیں جب تک خدا پر ایمان نہ رکھا جائے۔ یقیناً مجھے بھی لفظاً بہ لفظاً اس سے اتفاق ہے۔ لیکن تھوڑے لفظی و معنوی اختلاف کے ساتھ اور وہ

یہ کہ جس چیز کو وہ اخلاص قلب کہتے ہیں میں اسے "احساس فرض" کہتا ہوں اور یہ بھی صرف اس لئے کہ "نفسانی ہوا وہوس" کا کوئی لگاؤ باقی ہی نہ رہے۔ اگر ایک شخص خدا پر ایمان رکھنے کے بعد اخلاص قلب سے کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ اس کا اجر خدا سے چاہتا ہے اور اس طرح گویا وہ بندے سے نہیں تو اس کے خدا سے بیع و شریٰ کرنا چاہتا ہے اور یہ جذبہ کلیتاً ہوا وہوس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تعلیم یہ دی جائے کہ کسی کے ساتھ نیکی کرنا ہر انسان کا فرض ہے جو قدرت یا خدا کی طرف سے اس پر عائد کیا گیا ہے تو پھر کسی قسم کا شائبہ نفسانی خواہش یا غرض ذاتی کا پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ کسی پر احسان کرنا گویا خود ممنون ہوتا ہوگا کہ اس طرح وہ ایک فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

جب تک اعمال کے ساتھ خدا کا ڈر یا اس کی خوشنودی و برہمی کا خیال شامل رہے گا انسان صحیح معنی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے تمام افعال حسنہ یا تو اس طمع کے زیر اثر ظہور پذیر ہوں گے، جو حور و غلمان، یا کوثر و سلسبیل سے متعلق ہو سکتے ہیں، یا اس ڈر سے جو فطرتاً آگ، اژدہا، سانپ بچھو جیسی شے سے انسان کو ہوتا ہے۔ خدا کو ماننا اور اس طرح ماننا کہ گویا وہ ہندوستان کی کسی ریاست کا نواب ہے، جس کے جاسوس ہر وقت، ہر جگہ لگے ہوئے ہیں اور جو ذرا ذرا سی بات میں دار پر کھنچوا سکتا ہے۔ کم از کم میرے خیال میں کسی طرح نہیں آتا۔ میں خدا کو بے نیاز مطلق جانتا ہوں، جس کو نہ ہمارے افعال بد سے واسطہ ہے نہ اعمال حسنہ سے کوئی تعلق، کائنات کے اور تمام نظام کے ساتھ اس نے انسان کی تمدنی زندگی کا بھی ایک قانون بنا دیا ہے جس کو انسان نے اپنی ارتقائی دور کے مختلف منازل میں اچھی طرح سمجھ لیا ہے پھر اگر وہ اس پر کاربند ہوگا تو خود اسی کی ہیئت اجتماعی کو فائدہ ہوگا ورنہ تباہ و برباد

ہو جائے گا خواہ بجائے پانچ کے چالیس وقت کی نماز کیوں نہ پڑھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ :۔

"خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل کا تصور ہی ممکن نہیں"

میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں کیونکہ دنیا میں بعض افراد ایسے بھی مل سکتے ہیں جو باوجود انکار خدا کے اچھے خصائل رکھتے ہیں اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں، صرف اس خیال کے تحت کہ یہ ہر انسان کا فطری فرض ہے۔ میں حیران ہوں کہ مولانا اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں جبکہ وہ خود بھی اسی کے قائل ہوں گے کہ "نیکی خود آپ اپنا بدلہ ہے" اور اس نظریہ کے تحت خدا کے ماننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اصولی گفتگو ہوئی۔ اب رہا وہ مسئلہ جس کے سلسلہ میں مولانا نے یہ اظہار خیال کیا ہے سو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جو ایک نیکو کار برہمن کو ناری بتاتے ہیں تو کیا وہ خدا کا قائل نہیں ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک بت پرست (اصطلاحی معنی میں) حقیقتاً ایک اسی قوت کا قائل نہیں ہوتا جسے سوا خدا سمجھنے کے کوئی چارہ نہیں اس لئے میری رائے میں مولانا کو یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ "بغیر مسلمان ہوئے حسن خلق کا تصور ممکن نہیں" اور یہ ثابت کرنے کے بعد وہ بے شک نیکو کار برہمن کو ناری اور بدکار مسلمان کو ناجی کہہ سکتے تھے۔

O

اس کے بعد مولانا زیادہ کھل کر اصل مدعا کی طرف آئے ہیں اور فرماتے ہیں :۔

"آج جبکہ مسلمانوں کو عملاً کام کرنا ہے صرف باتیں بنانا نہیں، کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس پر بحث نہیں کرتے کہ ایمان ہو یا حسن خلق، عملاً حاصل کرنا چاہیئے بلکہ اس پر بحث کرتے ہیں کہ نجات اخروی کا ذریعہ محض ایمان ہے

یا حسنِ عمل صرف حسنِ عمل ہی سہی۔ بلکہ داعی اس کا نمونہ بن کر دکھائیں اس کی اہمیت نمایاں کر کے بتائیں، وہ کبھی اس کی دعوت نہیں دیتے کہ نماز پڑھنی کس قدر ضروری ہے ملے دے کے دعوت یہ ہے کہ نماز پانچ وقت ہو کہ تین وقت، تین ہی وقت سہی، مگر ان تینوں وقتوں میں پڑھی بھی تو جاتے یہ وہ لوگ ہیں جو ایجابی اسلام کے بجائے صرف سلبی اسلام کو مسلمانوں کی ہر ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں۔ حالانکہ پانچ وقتوں والا غازی سلطان صلاح الدین سلطان محمد فاتح اور سلیمان اعظم پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے سے اپنی سلطنت کھو بیٹھے، ورنہ اس عہد کے ملاحدہ ترک صلوٰۃ و عدم ایمان کے باوجود ملک کا چھوٹا سا گوشہ حاصل کر سکے، اگر ملک ہی حاصل کرنا ترقی ہے:

مولانا نے اس بیان میں چند در چند غلطیاں کی ہیں اوّل تو "وہ کچھ لوگ جو ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو نجاتِ اُخروی سے کوئی بحث نہیں کرتے" اس میں سے اگر آپ لفظ اخروی نکال دیں تو بے شک آپ کا یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کیونکہ اخروی کا جو مفہوم آپ کے یہاں ہے اس سے وہ کوسوں دور ہیں اور اگر بطور معارضہ یا استفادہ اخروی نجات سے گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ آپ اس کے قائل ہیں اور آپ ہی کے مسلّمہ اصول کو سامنے رکھ کر اصولاً بحث کرنا چاہیئے،

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ ان لوگوں کو صرف باتیں بنانے والا ظاہر کیا گیا اور عملاً حسن خلق سے بالکل بیگانہ۔ اگر اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ دوسرے گھر کی تیز روشنی کو گل کر کے اپنے گھر کی ضعیف روشنی کو نمایاں کیا جائے تو میں حیران ہوں کہ مولانا نے کیسے کہہ دیا کہ ایسے لوگ حسن اخلاق سے معرّا ہوتے ہیں اور عمل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے،

اس وقت اظہار انکسار کی ضرورت نہیں، مجھے صاف صاف دریافت کرنا چاہیے، کہ مولانا مجھے کیوں اخلاق حسنہ سے معرا جانتے ہیں اور کس روایت کی بنا پر وہ مجھے بداخلاق کہہ سکتے ہیں۔ و اتنا لکھنا مجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھ صرف باتیں بنانے والے کے اخلاق بدرجہا بہت سے مولویوں سے اچھے ہیں جو مولانا کے نزدیک علاوہ حسن اخلاق کی تعلیم دینے والے ہیں اور باتیں نہیں بناتے۔

اب رہا یہ الزام کہ ایسے لوگ تین ہی وقت نماز پڑھنے کی دعوت لوگوں کو کیوں نہیں دیتے، سو اس کا جواب زیادہ دشوار نہیں جبکہ صدیوں سے پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور پڑھانے والوں کے اخلاق سامنے موجود ہیں "تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ کنی" گفتگو تو اسی میں ہے کہ مولویوں نے لوگوں سے اس قدر نمازیں پڑھوائیں، اتنے روزے رکھوائے کہ وہ نماز روزہ ہی کو اصل ایمان سمجھ گئے۔ اس لئے اب وقت کا تقاضا کیا ہے نماز کی اہمیت کا درس دینا یا اُس چیز کا جس کے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ نماز بھی تھی اور جواب اپنی اہمیت ذریعہ ہونے کے بھی کھو چکی ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین وغیرہ پانچ وقت نماز پڑھنے سے اپنی سلطنت نہیں کھو بیٹھے تھے تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ سلطنت ان کو پانچ وقت کی نماز ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہ آج تمام مولوی پنج وقتہ نماز پڑھ کر کم از کم "صوبہ برار" ہی انگریزوں سے چھین کر حضور نظام کو دلوا دیں، یا خود ہی لے لیں اور خیر صوبہ برار یا کوئی حصہ ملک تو خیر بڑی چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بجائے پانچ وقت کے وہ چالیس وقت کی نماز ۴۰ ہزار برس تک ادا کرتے رہیں تو بھی وہ ایک انچ زمین حاصل نہیں کر سکتے۔

اب رہا دوسرا الزام کہ ملاحدہ ترکِ صلوٰۃ و عدمِ ایمان کے باوجود کیوں نہیں ملک کا کوئی چھوٹا سا گوشہ حاصل کر لیتے، سو یہ بالکل بے محل ہے۔ کیونکہ انھوں نے تو اس کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ سلطنت یا ملکگیری نماز سے متعلق ہے اور اگر الزامی جواب دینا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں کہ آج دنیا میں حکمرانی کس قوم کا حصہ ہے، کیا وہ بڑی خدا ترس ہے۔ کیا وہ بڑی مسلمان ہے۔ کیا وہ ملحد بے دین نہیں، اور دُور کیوں جائیے خود ترکی کو دیکھئے کہ اس کے احیاء ثانیہ کا کیا راز ہے، اور کیا ترکوں پر الحاد و بے دینی کا الزام عائد نہیں کیا جاتا۔ نماز کے متعلق آپ گفتگو کا ایسا پہلو کیوں اختیار کرتے ہیں جو بالکل بے محل و غیر متعلق ہے میں نے کب کہا کہ نماز بُری چیز ہے۔ یقیناً وہ ایک بہتر طریقہ اصلاحِ نفس کا ہے، اور میں پابندِ صوم و صلوٰۃ کو اچھا سمجھتا ہوں بشرطیکہ وہ آپ ہی کے نظریہ کے مطابق ایمان و عمل میں امتیاز پیدا کر سکے۔ نماز اگر نفسِ ایمان سمجھ کر ادا کی جائیگی تو یقیناً وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر ناجائز چیز قرار دی جائے گی۔ لیکن اگر اس کو محض ایک ذریعۂ اصلاح سمجھ کر اختیار کیا گیا اور جذبۂ رأفت و لطف اس کی وساطت سے اپنے اوپر طاری کیا گیا تو اس کے بہتر ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے

○

اخیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

اصل یہ ہے کہ آجکل یورپ کی نقالی ہر چیز میں ہے مذہب و اصلاح مذہب میں بھی نقالی ہے۔ یورپ کے ریفارمیشن کی تاریخ پڑھ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لوتھر بننے کا خیال ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ اسلام د

مسیحیت میں اشتراک کیا ہے، جس کے لئے اسلام کو دعوت کی ضرورت پیش
لئے عیسائیوں نے عیسائیت لانے کے بعد سو برس بعد عیسائیت کو چھوڑ کر
سلطنت پائی لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی
اور جب اسلام چھوڑا سلطنت بھی چھوٹی! کیا یہ فرق ہمارے نئے مصلحین کے
سامنے ہے۔ غلط رسوم و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب نہیں ہے
جس کی تصویر آپ اپنے ذہن سے کھینچ کر دکھائیں:

اس کے جواب میں ہم اسی عبارت کو دہرا کر خود مولانا سے سوال کریں گے کہ وہ اسلام کہاں گیا جس کے ساتھ ساتھ سلطنت آئی تھی۔ اگر سلطنت کا ساتھ آنا، اسلام کا لازمی نتیجہ ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے کہ ترقی ملک گیری کا نام نہیں ہے۔ اگر آج اسلام کہیں نہیں ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا علماء کا گروہ اس الزام سے بری ہو سکتا ہے، یا تو اس کا اعتراف کیجئے کہ اس وقت کوئی عالم دین، کوئی ہادیٔ شریعت، کوئی مصلح مذہب و ملت موجود نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان اسباب کو تلاش کیجئے جنہوں نے سلطنت کو اسلام سے جُدا کر دیا وہ لوگ جنہیں آپ نئے مصلحین کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ بھی اس جستجو میں ہیں اور آخرکار اس نتیجہ پر پہونچ رہے ہیں کہ یہ سارا ادبار انہیں کا لایا ہوا ہے جو اپنے آپ کو علماء کرام اور ہادیانِ مذہب کہتے ہیں، اور آپ بھی اس جستجو میں ہیں لیکن آپ کی جستجو خود اپنے اندر سے شروع نہیں ہوتی اور اس لئے آپ کو اس "لنکا ڈھانے والا" کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ آپ صرف زبان سے کہتے ہیں کہ "غلط رسوم اور خارجی بدعات" کا نام اسلام

رکھ لیا گیا ہے لیکن ان رسوم و بدعات کے مٹانے کے لئے آپ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ آپ میں ایسا کرنے کی جرأت و جسارت نہیں ہے اور یہ جرأت و جسارت کیوں نہیں ہے؟ اس لئے کہ جب تک نصیحت دوسروں سے متعلق ہوتی ہے، بہت دلچسپ ہے لیکن جہاں اپنی ذات کا سوال آیا تو پھر وہی "کشف ساق" کا پیش آجاتا ہے جس کا تحمل آسان نہیں۔

بندہ نواز اگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تو ہمارے پاس اس کا ایک معقول جواب بھی ہے کہ ہم اس کے اہل نہیں۔ لیکن آپ تو ایسا نہیں کہہ سکتے۔ اٹھیئے اور ان رسوم و بدعات کو مٹائیے جن میں اسلام گم ہو گیا ہے اگر ہم سلبی اسلام والے ہیں تو آپ ایجابی اسلام والے کیوں نہیں سامنے آتے اور ان اوہام و شکوک کو کیوں نہیں رفع کرتے جنھوں نے مسلمانوں کو نصف سے زیادہ تعداد میں ملحد، بے دین اور کافر بنا رکھا ہے

آپ لوگوں کو صرف کافر و ملحد کہہ کر ذہن کی اس رفتار کو نہیں روک سکتے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہے بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ خود اس سیلاب میں پڑ کر بہہ نکلنے والوں کو طوفان سے بچائیں لیکن اگر آپ اس سے معذور ہیں تو پھر یہ وعظ و نصیحت بھی ترک کیجئے کہ اس سے بجائے فائدے کے اور نقصان ہے اور کبھی کبھی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیا کیجئے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں کیا وہ واقعی صحیح اور درست ہیں؟

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

نگار کی الحاد پروری

غالب، مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"سنو صاحب شعراء میں فردوسی، فقراء میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سردفتر و پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے اور عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو ... ... "

اسی میں اگر یہ اضافہ کر دیا جائے کہ ایک صداقت پرست، ایک حق شناس اور ایک بے لاگ تنقید کرنے والے کی انتہا یہ ہے کہ وہ کافر و مرتد بنا دیا جائے۔ ملحد و بیدین کے نام سے پکارا جائے تو میرے لئے اس سے زیادہ فخر کا موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج میں بھی اسی منزل میں ہوں جو کسی وقت فردوسی، حسن بصری اور مجنوں کو اپنے فن میں نصیب ہوئی تھی، اور ناشکری ہوگی اگر اس سے زیادہ کوئی اور سعادت طلب کروں،

ما بہ جائے کہ ز جم ماند قناعت کردیم   بہ سکندر بدہید آنچہ ز دارا ماند

○

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس و ضمیر کے سکون کا تھا جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ و ارشادات سے بلند تھا جب دین حنیف میں جبر و اکراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارا نہ کیا جاتا تھا اور جب عہد بنی عباس میں آزادی کے ساتھ ہر شخص کو اسلام کا صحیح مفہوم جاننے کے لئے جرح و تنقید کی اجازت تھی۔ اس وقت کفر و ارتداد کا مفہوم صرف یہ تھا کہ اصول اخلاق کو پس پشت ڈال کر انسانیت کی ترقی کو روک دیا جائے۔ لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ اس قدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں، اگر آج غزالی اور رازی زندہ ہوتے تو اُن کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا۔ غضب خدا کا میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا کہ رسول کی صداقت و بلندئ فطرت پر جس طرح ایمان لایا ہوں، شاید ہی کوئی ایمان لایا ہو، لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں ملحد ہوں۔ مرتد ہوں۔ پھر اگر اسی اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو۔

نازم بہ کافری کہ بہ ایماں برابر است

لاؤ ساری دنیا کی بے دینی مجھے دے دو، تمام عالم کا ارتداد میرے حوالے کر دو اور کائنات کے ہر ہر گوشے کا الحاد میرے قلب میں بھر دو کہ اس دولت کے ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بنائے بغیر نہیں جا سکتا۔

ایں چہ شورے ست کہ در دورِ قمر می بینم

اس دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے زیادہ منظم طور پر میری بے دینیوں کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی گئی۔ یہاں تک کہ بعض انجمنوں نے جو مقامی مولوی جماعت کے زیر اثر تھیں میرے اور نگار کے الحاد کو ناقابل برداشت قرار دے کر نگار کی خریداری سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی۔ صوبہ بہار کے کوئی بزرگ مولوی عبدالحکیم یا حکیم الدین صاحب ہیں انھوں نے اپنے صوبے کے اخبار اتحاد میں ایک خطیبانہ مقالہ کے ذریعے ابنائے وطن کو نگار کے فتنہ سے آگاہ کر کے اس کے مطالعہ کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ یہاں تک کہ یہیں لکھنؤ میں بعض اکابر قوم و مذہب نے جلسہ کر کے یہ بھی ارادہ کیا کہ میری اس عارضی زندگی ہی کو ختم کر دیا جائے۔ بعض حضرات نے متعدد خطوط اس نوع کی تخویف و ترہیب کے بھی میرے پاس روانہ کئے۔ مقامی اخباروں میں روزنامہ ہمت اور ہفتہ وار سچ نے اس کار ثواب میں زیادہ اہتمام و توجہ سے کام لیا۔ الغرض اس دوران میں وہ سب کچھ ہوا جو صحافت و پروپاگنڈہ کی مدد سے ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے ان تمام حملوں کے جواب میں صرف سکوت سے کام لیا۔ کیونکہ ان تمام حضرات میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کی ہو اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے یہ سب ظن و قیاس اور عوام کی افواہ کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتی ہے یا پھر دیدہ و دانستہ کتمان حقیقت ہے اور میرے خلاف میری ہی تحریر کی غلط تعبیر جو ممکن ہے اصول جنگ کے لحاظ سے ان کی شرع متین میں جائز قرار دی گئی ہو یا جنھوں نے میرے خلاف تبلیغ و اشاعت ہی کے ذریعہ سے فردوس میں ایک قصر تازہ کی تعمیر کا عزم راسخ کر لیا ہو۔

ہمارے مسٹر عبدالماجد صاحب دریابادی (زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا) نگار

کی الحاد پروری کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی کوئی ضعیف سی کوشش انہوں نے اس امر کی بھی کی ہے کہ وہ عصبیت سے علیحدہ ہو کر میرے خیالات پر غور فرماتے اور پھر فیصلہ کرتے کہ میرا حقیقی مقصود اسلام کی خدمت ہے، یا اس کی تخریب و توہین۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود اپنے ہمہ دعوائے ادبیت و تفلسف وہ تعصب و برہمی کے زیر اثر یہ بھی نہ غور کر سکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انہیں سے ان کی تردید ہوتی ہو۔ میر بکائی کے فکاہی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالات پریشان ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مخبوط الحواس کی طرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہے، جس اصول کے تحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے ————

میں نہیں سمجھ سکتا کہ "وانتم سکاریٰ" کو علیحدہ کر کے صرف "لاتقربوا الصلوٰۃ" پیش کرنے والی ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کو کس مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح انہوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے خیالات سمجھنے میں غلطی سے کام لیا (گو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصد و ارادہ کے تحت تھی یا تعصب و ناانصافی کی بنا پر) میرا مقصود ان مضامین سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بنا پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے۔ پھر جب تک کہ جناب دریابادی یا انہیں کی طرح کوئی اور حامئ دین یہ ثابت نہ کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذات سے ہے اس وقت تک میرے ان مضامین کو توہین مذہب یا مخالفت اسلام کی صورت میں کس طرح پیش

کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتاب احادیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیتاً اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے علی الخصوص مذہب اسلام جو دنیا کا تنہا فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے، کیا جناب دریابادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو ان کے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تدلیس و تحریف یا حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ ان کے مجموعۂ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ سے منسوب کر کے مذہب اور رسول کی توہین کی جائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث ماننے کے لئے تیار نہیں، مذہب کا مخالف قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترک مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا کہ بحالت موجودہ اگر شروع سے لے کر اخیر تک تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر انسان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہوگا اُسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہے اس کا قرار دے لیجئے۔

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے ۲۵ ر ستمبر کے سچ میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کئے ہیں وہ سب تحریف مفہوم کا نتیجہ ہیں اور میرے مقصد سے بالکل علیحدہ ہیں۔ میں نے جن اکابر ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ہے ان سے مراد صرف

کی الحاد پروری کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی کوئی ضعیف سی کوشش انھوں نے اس امر کی بھی کی ہے کہ وہ عصبیت سے علٰحدہ ہو کر میرے خیالات پر غور فرماتے اور پھر فیصلہ کرتے کہ میرا حقیقی مقصود اسلام کی خدمت ہے، یا اس کی تخریب و توہین۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود اینہمہ دعوائے ادبیت و تفلسف وہ تعصب و بدہمی کے زیر اثر یہ بھی نہ غور کر سکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انھیں سے ان کی تردید ہوتی ہو۔ میر بکائی کے فکاہی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالات پریشان ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مخبوط الحواس کی طرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہے جس اصول کے تحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے ———

میں نہیں سمجھ سکتا کہ "وانتم سکاریٰ" کو علٰحدہ کر کے صرف "لاتقربوا الصّلٰوۃ" پیش کرنے والی ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کو کس مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے خیالات سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے گو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصد و ارادہ کے تحت تھی یا تعصب و ناانصافی کی بنا پر۔ میرا مقصود ان مضامین سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بنا پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے۔ پھر جب تک کہ جناب دریابادی یا انھیں کی طرح کوئی اور حامیٔ دین یہ ثابت نہ کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذائذ سے ہے اس وقت تک میرے ان مضامین کو توہین مذہب یا مخالفت اسلام کی صورت میں کس طرح پیش

کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتاب احادیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیتہً اعتماد کرکے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے علی الخصوص مذہب اسلام جو دنیا کا تنہا فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے، کیا جناب دریابادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو ان کے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تدلیس و تحریف یا حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ ان کے مجموعۂ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ سے منسوب کرکے مذہب اور رسول کی توہین کی جائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث ماننے کے لئے تیار نہیں، مذہب کا مخالف قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترک مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا کہ بحالت موجودہ اگر شروع سے لے کر آخیر تک تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر ان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہوگا اُسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہیے اس کا قرار دے لیجئے۔

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے ۲۵ ستمبر کے سچ میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کئے ہیں وہ سب تحریف مفہوم کا نتیجہ ہیں اور میرے مقصد سے بالکل علیحدہ میں نے جن اکابر ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ہے ان سے مراد صرف

آجکل کے بعض ایسے نام نہاد علمائے کرام ہیں جو صداقت کو محو کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں اور جن کا باطن ان کے ظاہر سے بالکل مختلف ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلہ میں انھوں نے ابوحنیفہ وغیرہ کو کیوں شامل کر لیا۔ کیا عبارت کے سیاق و سباق سے وہ یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ میری مراد اکابر ملت سے کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگست ۳۰ئہ کے ملاحظات میں اپنا ذکر دیکھ کر وہ بیتاب ہو گئے اور فرط غضب میں محض انتقام لینے کے لئے انھوں نے میرے فقرہ کا محل بدل کر خواہ مخواہ ایسے معنی پیدا کئے جو لوگوں کو مشتعل کر دینے والے ہوں۔

پھر یہ سب کچھ جانے دیجئے۔ میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں یا جو مضامین نگار میں شائع ہوتے ہیں وہ یکسر الحاد و شرک ہیں لیکن خدارا کبھی ان کا جواب دینے کی بھی تو سعی فرمائیے۔ بفرض محال یہ بھی مان لیجئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ غیر مسلم ہونیکی حیثیت سے کہتا ہوں، تو کیا آپ کا فرض بحیثیت ایک مسلم ہونے کے یہ نہیں ہے کہ میرے شبہات کو دُور کریں، مجھے راہ راست پر لائیں۔ یا یہ فرض اس طرح پُورا ہو جاتا ہے کہ مجھے ملحد و مرتد بنا کر خدا کے حوالے کر دیا جائے اور نگار کے مطالعہ کو حرام قرار دے کر میری تاریک ذہنیت میں اور اضافہ کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے، یہ کس نوع کی خدمت اسلام ہے یہ کس انداز کی تبلیغ ہے۔

تمام رسائل میں صرف "معارف" ہی ایک رسالہ ایسا ہے جو کبھی کبھی جواب دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے اور محض "کفر گری" کو ذریعہ حرب و دفاع قرار نہیں دیتا لیکن افسوس ہے کہ نگار میں جس نقطۂ نظر سے گفتگو ہوتی ہے اس سے وہاں بھی اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس لئے میری تشنہ کامیاں بدستور باقی رہتی ہیں۔

میرا دعویٰ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے جو وقت و زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے اور یہی ایک تنہا مسلک ہے جس نے اخوت عامّہ اور انسانیت کبریٰ کو منزل حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کو اشتراک عمل کی دعوت دی اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ یوں تو ایک مولوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے کیونکہ جب تک وہ یہ دعوے نہ کرے مذہب اسلام کا امتیاز اور اس کی ہمہ گیری کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جس وقت اصول و عقائد، شعائر و عمل کا سوال آتا ہے تو پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے جو یقیناً کسی پیرو اسلام کا نہیں ہو سکتا

اس لئے اس وقت جو برہمی علماء کرام کی میرے خلاف ہے اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں ان کے سامنے سر بسجود نہیں ہوتا، اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا جن حضرات نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اسلام نام صرف یزداں پرستی کا ہے تو اس کے متعدد شواہد اس میں نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اسلام کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں اور فاش و برملا کہتا ہوں کہ میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں اور نہ دنیا میں کوئی انسان مسلمان ہو سکتا ہے۔

آج زمانہ جس دورِ اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بُت شکن نبی پیدا ہو، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی مذہب شکن رسول آئے اور دنیا سے مذہبیت کی اس گرانباری کو دُور کر دے جس نے دنیا کا امن و سکون غارت کر رکھا ہے پھر اگر آپ ایسے نازک وقت میں اسلام کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں اور

اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا نصب العین دنیا میں امن و سکون قائم کرنا ہے تو اس کی صورت وہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کرتے ہیں، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ:

یک دو نفس نالہ شو از دلِ دیوانہ برآ

اسلام کے چہرے کو ان تمام داغوں سے پاک کیجئے جنھوں نے اس کے اصلی خط و خال کو پوشیدہ کر رکھا ہے اور وہ حقیقی سادگی، وہ بلند نظری، وہ فراخ دلی اور علوئے نگاہ پھر پیدا کیجئے جو اسلام کے عناصر ترکیبی تھے۔ اس وقت تک آپ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے صرف ——— "بہ آواز دولاب مستی کنند" کو اپنا ایمان قرار دئے ہوئے ہیں اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ان حرکات مذبوحی پر جرح و تنقید کرے۔ لیکن اگر آپ نے کبھی یہ دعوے کیا کہ آپ اپنے اصول کی تبلیغ بھی چاہتے ہیں تو پھر معاف کیجئے۔ اس وقت آپ کا مجھے فرد ملحد کہہ دینا، نگار کے خلاف لغو و غلط پروپگینڈا قائم کر کے عوام میں ہیجان پیدا کر دینا، مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شاید آپ کو علم نہیں کہ اس وقت دماغ انسانی جس اضطراب میں مبتلا ہے۔ اس کی تشفی آپ کے پروپیگنڈہ سے نہیں، بلکہ نگار ہی کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے ——— پھر ممکن ہے کہ آج کا ماحول اس کی قدر نہ کرے، لیکن ایک وقت آئے گا جب نگار کے صفحات ہی میں آپ کو پناہ لینا پڑے گی اور آپ کے پاس کوئی ذریعۂ فلاح نہ ہوگا مگر وہ جسے نگار اور صاحب نگار قائم کر چکا ہے وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام اللہ کے بعد جس مذہبی لٹریچر (یعنی مجموعۂ احادیث) کو آپ اپنا مقصود سمجھے ہوئے ہیں اس نے اسلام کی جڑوں کو کس قدر متزلزل کر دیا ہے

عیسائیوں کے اعتراضات، آریوں کے حملے اور تمام غیر مسلم اقوام کی نکتہ چینیاں کلام مجید پر اتنی منحصر نہیں ہیں جتنی احادیث پر۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آجتک ڈاکٹر ٹسڈل کی مشہور کتاب ینابیع الاسلام کا جواب ہمارے ہاں کے کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا، کیونکہ اس کے تمام اعتراضات کا بڑا ماخذ مجموعۂ احادیث ہے اور آپ اس پر مجبور ہیں کہ جو واقعہ یا لفظ رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا ہے اُسے غلط نہ قرار دیں خواہ وہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہو ——— یعنی یہ تو آپ گوارا کرسکتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے لیکن مجموعۂ احادیث پر آپ سے کبھی تنقید نہ ہوگی۔ اور اگر دوسرا اس کی جرأت کرے گا تو اسے ملحد، بیدین، فتنہ پرداز اور خدا جانے کیا کیا کہیں گے۔ درآنحالیکہ ان تمام الفاظ کا بہترین مخاطب تو واضعین احادیث ہی کی ذات بابرکات ہو سکتی ہے۔

بہرحال میں ان تمام معذرت نگاریوں کے بعد بھی ہر وقت اپنے آپ کو ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں جانتا اور اس کے لئے تیار ہوں کہ ہندوستان کا کوئی ایک مولوی یا مولویوں کی کوئی بڑی سے بڑی جماعت مجھے سمجھا دے اگر میں غلطی پر ہوں لیکن اس کا طریقہ شاید یہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مذہبیات کے سلسلہ میں اس مقصود سے ہٹ جاؤں جس کا نام میں نے صرف معرفت انسانی رکھا ہے اور خواہ مخواہ وہ الجھنیں عوام کے سامنے لے آؤں جو مجموعۂ احادیث اور علمائے کرام کی تنگ نظری سے پیدا ہو گئی ہے۔

کورانہ تقلید

صنم کہ بر دل و دین خود اہتمام نیست
بہ نیم غمزہ ہم این را ربائے و ہم آن را
(غالب)

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جب وہ محوِ خواب ہوتا ہے لیکن انسانیت بیدار ہوتی رہتی ہے۔ اس کے قوا بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد و تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکون جاں" کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑتی ہے۔ قلب و دماغ نشۂ کامیابی و نشاط سے سرشار ہو جاتے ہیں اور ——
آخر کار انسان بھی چونک پڑتا ہے۔ اس کے اعضاء بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتیِ جسم و روح" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اسی کا دوسرا نام دنیائے عمل ہے اسی کو "عالم تگ و دو" کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو شاعرانہ زبان میں "شکست میاں رفت و نیتیں جلوہ گر"

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر تا ایں دم کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو کہوں گا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے جس میں قدرت کے اس نظامِ فطرت کے اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سُنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو۔ جواہر فرد اور قوت کا باہمی تعلق، مادہ کی مختلف صورتیں، ایتھر بلکہ ماورائے ایتھر عناصر آفرینش کا نواۃ اور برق پاروں کی صورت اختیار کرنا، لطخات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مختلف کروں، سیاروں، چھوٹے چھوٹے ستاروں، چاندوں اور شہاب ثاقب میں تبدیل ہو جانا۔ یہ کیا ہے؟ کیا سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں۔ کیا مادہ کا تفاعل اس کی بیداری نہیں۔ کیا برق پاروں کی گردش ان کا نشاطِ عمل نہیں، کیا آفتاب کی طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس ابتسام خداوندی کی جھلک موجود نہیں جس کے پرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعتہً جگمگا اٹھتی ہیں۔

ابراہیم کی بت شکنی کیا اس بیداری کا نتیجہ نہ تھی۔ موسیٰ کا فرعون کی قوت قہرمانی کے مقابل میں آ جانا کیا رُوح و جسم کے اتحاد کا نتیجہ نہ تھا۔ عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا۔ مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ پھینک دینا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا، رام چندر جی کی صحرا نوردیاں کیا کسی جذبۂ غیر روحانی سے متعلق تھیں، کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں، کنفوشیوس کی ذات کیا کسی غیر مادی کیفیت کا مظہر تھی، زردشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی، سرزمین عرب سے پیدا ہونے والے سب سے بڑے انسان کا کوہ فاران پر چڑھ کر کفار عرب کو پیام خداوندی

پہونچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا، حسین کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور رُودادِ عمل تھی، منصور کے ساتھ دار ورسن کا معاملہ بھی اسی معمہ کی گرہ کشائی تھی اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی کا اعادہ تھا۔

لیکن جس طرح قدرت عرصہ تک محوِ خواب رکھنے کے بعد نوعِ انسانی کو بیدار کرنے کے لئے اس کے کسی فرد کا انتخاب کر لیتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دوبارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کر دیتی ہے۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کے لئے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا ——— اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار کر لیتی ہے جیسے مُردہ میں از سر نو جان پڑ جائے۔

❁

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چیز جہل کے دُور کرنے کے لئے آئے گی۔ اس کی ابتداء عہدِ تاریک ہی سے ہوگی اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منوّر کر چکیں گی تو دَورِ اصلاح ختم ہو جائے گا۔ اگر اس کا مقصود کسی انسان کو محدود منزل تک پہونچا کر ٹھہر جانا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جس کے دائرۂ عمل سے تعینِ منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ ودو کی جولانگاہ قرار دیا ہے یا جس کا مدعا عقولِ انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منوّر کرتے رہنا ہے یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے، جس کی دعوت عالمِ انسانی کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ

سے وابستہ کر سکتی ہے اور جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہو کر اقتضائے فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہو جانا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک تعلیم اخلاق کا سوال ہے اس وقت تک جتنی اصلاحیں دنیا میں بروئے کار آئیں ان سب کا مقصد ایک ہی تھا۔ جتنے بھی تعلیمیں کے اچھے کام اچھے اور بڑے بڑے ہیں لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قواعد انھوں نے مقرر کئے وہ وقت اور زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انھیں مختلف ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ان کا عقول انسانی کے مطابق ہونا ضروری تھا اور عقل انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی لیکن جس وقت ہم تقابلاً ان کا مطالعہ کریں گے، ان کے مقاصد تعلیم اور ان کے اصول اصلاح سے اور ہم ان کے اس پیغام پر غور کریں گے جو انھوں نے نوع انسانی تک پہونچایا تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی تمام کائنات کا احاطہ کر لینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر ابنائے جنس کی خدمت کرنا چاہیئے تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہر فطرت انسان کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتا دیا کہ انسان حقیقتاً نام ہے اس قوت عمل کا جولانیاں نہایت تک برابر اسباب ترقی کا ساتھ دیتی چلی جائے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلک کا حقیقی پیغام یہی ہے جو بیان کیا گیا تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اور اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہو سکتا ہے غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں ڈھونڈھتی ہیں اور میں اس کو تاریخ میں پاتا ہوں یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتی ہیں کہ شاید اس کے اصول تعلیم ہی ایسے ناقص و نامکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور میرا دعوے یہ ہے کہ اس انحطاط کا سبب ہی یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

جس وقت آپ نوع انسانی کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کوئی مصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے ایک عام انقیاد و اطاعت اور قیام عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی لیکن جس وقت وہ اٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قوائے عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اختلاف آراء پیدا ہونے لگتا ہے جو اجتماعی روح کے لئے سم قاتل سے کم نہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہمدردی، عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہو کر ملوکیت و استبداد کی بنیاد پڑنے لگتی ہے اور انسانی برتری کا معیار اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت، دنیاوی نمود و نمائش قرار پا جاتا ہے اور آخر کار ہر ہر فرد خود غرضی، نفسانیت اور آسائش جسم و جان کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے، یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمع یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور پھر دوسرا وقت وہ آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی اور اپنی

کمزوریوں، اپنی نااہلیوں کا اندیشہ اس قدر غالب آجاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالبؔ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ:

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنس وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات، ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام، الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہو۔ کسی نظامِ زندگی سے وابستہ ہو، بالکل ویسی ہی ہے جیسے اندھوں کی وہ نزاع جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضا کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا، اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا اور دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کیا درآنحالیکہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دُور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے آج جن باتوں کو ہم حقائق و مسلمات کہہ کر بیان کر رہے ہیں وہ صرف مزخرفات و ترہات ہیں، دنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے۔ زندگی نئی ہے اور اس کے امیال و عواطف نئے، پہلے سانس لینے کا طور اور تھا اور اب جینے کی راہیں اور ہیں۔ اب سے ایک صدی قبل جو انسان پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقلِ انسانی کے جو دروازے مقفل نظر آتے تھے اب بالکل کھلے ہوئے ہیں، ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں، فراستِ انسانی آزاد ہے اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے جو آزادی سے بول سکتا ہے جس نے آزادی ہی کے لئے مرنا اور جینا اپنا شعار قائم کر لیا ہے اور جو دنیا کی آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے۔

پھر کیا انسان کی یہ مسرت اس لئے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو گیا ہے۔ کیا یہ جذبۂ سرور اس بناء پر ہے کہ خونخواری و درندگی سے باز رکھنے کے لئے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی ——— نہیں ——— یہ مسرت صرف اس لئے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اس نے خدا کی پرستش کی کیونکہ قدرت کا یہی وہ مظہر ہے جو انسان کو انسان اعلیٰ یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے۔

اے خدا

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا
با ہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

اے خدا، اُس وقت بھی جب کہ قرونِ مُظلمہ کی دنیا تجھے صرف غصے کی آگ برسانے والا دیوتا سمجھ رہی تھی۔ مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف و رافت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے۔

اول دن سے میں ڈرایا جا رہا تھا کہ میں نے ایسا کیا تو، تو خفا ہو جائے گا، ایسا نہ کیا تو، تو برہم ہو کر مجھے آگ میں ڈال دے گا۔ لیکن میں نے تجھے قلب کی گہرائیوں، اپنی روح کے اعماق میں ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا۔

ٹھیک اس وقت کہ لوگ تیرے غصے کے اندیشے سے کانپتے ہوتے تھے، تیری محبت و شفقت کے حضور میں سکون کے ساتھ تیری تعریف کے گن گایا کرتا تھا۔ وہ روتے تھے، میں ہنستا تھا۔ وہ تیرے سامنے جھکتے تھے تجھ سے ڈر کر، اور میں تیرے حضور میں سر بسجود ہوتا تھا۔

تیری محبت سے بیتاب ہو کر

دلے دارم خراب از التفاتِ چشم بیارت
ہمہ از جور می ترسند من از لطفِ بسیارت

ایک زمانہ گزر گیا کہ اس کارگاہِ عالم میں، ان کا خوف اور میری محبت دونوں اسی طرح متوازی چلتے رہے، نہ ان میں یہ جرأت کہ میری محبت کی آنکھوں سے تیرے متبسم و درخشاں چہرے کا نظارہ کرتے، نہ مجھ میں اسکی ہر شکن کہ ان کے آئینۂ خوف میں تیری پیشانی کی شکنوں کو دیکھتا۔ دن گذرتے گئے۔ آفتاب کے طلوع و غروب کے نہ جانے کتنے مناظر میرے دل میں حسنِ مجرد کے نقوش قائم کرتے رہے۔ چاند کے عروج و زوال کی مختلف منزلوں میں تو ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے تجھے کس کس آن میں دیکھا۔ بہار و خزاں کی متضاد کیفیات میں، دریاؤں کی روانی میں، پہاڑوں کے سکوت میں، آبشاروں کے شور میں جنگل کے سناٹے میں، قصرِ دولت کے مخملیں فرش پر، جھونپڑوں کی بوسیدہ چٹائیوں پر خواجگانِ کبار کی چینِ ابرو میں۔ کاسبانِ ضعیف کی عرق آلود پیشانی میں، امیروں کے زرکار لبادوں میں، کسانوں کے تار تار کرتوں میں۔ الغرض اے اعداد و شمار سے باہر، اے زمان و مکان کی قید سے آزاد۔ میں نے ہر جگہ تجھی کو کارفرما دیکھا اور جہاں دیکھا

شفقت و رافت کے لاکھوں پھول برساتا ہوا

میں حیران تھا کہ دنیا والے تجھ سے ڈرتے کیوں ہیں، محبت کیوں نہیں کرتے تیری ہیبت کیوں اُن کے دلوں میں طاری ہے، تیری رحمت سے الفت کرنے پر کیوں مجبور نہیں ——— اس حال پر بھی ایک زمانہ گزر گیا اور میں خاموش پروانہ دار تیری شمعِ حسن کا طواف کرتا رہا ——— ایک دن ناگہاں تجھ سے ڈرنے والوں میں سے

ایک ڈرنے والا میرے پاس آیا اور بولا کہ "چل ہمارے معبد میں ہمارے خدا کی جستجو کر" میں
بولا "تمہارا معبد! تمہارا خدا! کیا وہی معبد جسے آسمان کا صاعقہ، زمین کا زلزلہ مسمار کر دیتا ہے،
کیا وہی خدا جس کے تصور کی ابتدا خوف وہراس سے ہوتی ہے مجھے نہ یہ چاہیئے نہ وہ ———
میرا معبد میرے دل کے اندر ہے جسے کوئی چیز تباہ نہیں کر سکتی میرا خدا میری روح کے اندر
محبت کا زرّیں نقاب ڈالے ہوئے جگمگا رہا ہے؟"

پھر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ایک بے آب و گیاہ قطعۂ زمین سے رُونما ہونیوالی
ہستی نے مجھ سے کہا کہ "چل ہماری پرستش گاہ میں خدا کی پرستش کر" ———————
میں نے پوچھا وہ پرستشگاہ کیسی ہے اور وہ خدا کیسا ہے "جواب ملا" وہ معبد کسی مکان میں
مقید نہیں، بلکہ انسان کے ہر سجدہ کے ساتھ از خود پیدا ہوتا ہے اور وہ خدا یکسر محبت و
شفقت ہے جو میرے ذریعے تمام دنیا کے بسنے والوں کو اپنی رحمت کا پیام دینا چاہتا ہے"

میں فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا۔ لاکھوں برس کے انتظار کے بعد وہ آواز کان
میں آئی جس کے لئے روح بیتاب اور دل دیوانہ تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ
دے دیا۔ اس کے سامنے اپنا دل ڈال دیا۔ اس کے دامن سے اپنا دامن باندھ دیا۔
اس نے مسکرا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میری ہستی اس کی ہستی کا ایک جزو ہو کر سکون
کے شیریں خواب میں محو ہو گئی ——————— ہر بات کے کہنے کا ایک محل ہوتا ہے
ایک مخصوص ہستی ہی اس کو کہہ سکتی ہے، اور مخصوص زبان میں ——————— دنیائے
اثر و تاثر میں کامیابی کا انحصار انھیں تین چیزوں پر ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک چیز
کی بھی کمی ہوئی تو سمجھ لو کہ ناکامی یقینی ہے۔ میخانہ میں ایک رند کی طرف سے صلاح و تقویٰ
کی گفتگو ویسی ہی بے معنی ہے جیسے معبد میں ایک زاہد مرتاض کی جانب سے دعوت

جام و سبو، نہ اس طرح وہاں حلقۂ تسبیح و تہلیل قائم ہو سکتا ہے اور نہ یہاں بزمِ نشاط برپا۔ بالکل یہی حال رُوحِ انسانی کے ان رازوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً زبان پر بے اختیارانہ آجاتے ہیں لیکن ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف محرابِ مسجد ہی میں کہے جا سکتے ہیں اور بعض وہ جو

بردار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

اس لئے اگر کوئی شخص محراب و منبر سے جُدا رہنا چاہتا ہے تو وہاں کی ہر بات باہر کیوں کہے اور جو دار پر چڑھائے جانے سے ڈرتا ہے وہ اس کے راز کو کیوں زبان پر لائے۔

دنیا اس دورِ آزادی میں مذہبی پابندیوں، اخلاقی بندشوں سے علٰحدہ ہو کر محض اپنے ذہن و دماغ کی پرستش کرنا چاہتی ہے صرف اپنے سمجھے ہوئے اصولِ اخلاق کی پابندی پسند کرتی ہے لیکن جس طرح عالم نظامِ اجتماعی اس انفرادی سرکشی کو برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح یہ "ذہنی انفرادیت" بھی اب آسانی سے انقیاد و اطاعت قبول نہیں کر سکتی ——————

یہ ہے وہ عظیم الشان جنگ، جو اس وقت انسانوں کے قلوب کو غیر مطمئن بنائے ہوئے ہے، جس نے ذہنی توازن کے سکون کو تباہ و برباد کر رکھا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ "استردادِ حیوانیت" کی صورت میں ظاہر ہوگا یا "قیامِ انسانیتِ کبریٰ" کی شکل میں۔

قانونِ انسانی کا اقتدار و اثر انسان کے صرف ظاہری اعضاء تک محدود ہوتا ہے لیکن خدائی قانون دلوں پر حکومت کرتا ہے اس لئے یہ اضطراب کسی ملکی آئین سے دُور نہیں ہو سکتا۔ اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہی ضابطۂ خداوندی جو خوف و جبر سے نہیں بلکہ محبت و رأفت کے ساتھ سب کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے

اور انفرادی اغراض کو دل سے نکال کر اجتماعی فلاح کی بنیاد پر نوع انسانی کو رودا داری کے درد و ایثار کے جذبے سے معمور کر دیتا ہے ——— پھر آج ہے کوئی مذہب ایسا جو دنیا کے اس دماغی، روحانی اور اخلاقی ہیجان پر قابو حاصل کر سکے ؟

کوئی نہیں، ——— آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا ——— اخلاقی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ مذہبی بندشیں یکسر فنا ہو جائیں گی۔ درندگی و خونخواری کا نام تہذیب انسانی قرار پائے گا۔ ہر فرد کا ہاتھ دوسرے فرد کے خون سے رنگین نظر آئے گا اور آخر کار جب انسان تھک کر خستہ و درماندہ ہو کر ہانپنے لگے گا۔ ایک جگہ گر پڑے گا۔ تو افق سے ایک روشن ستارہ طلوع کرتا ہوا اسے نظر آئے گا جس کی روشنی سے راحت و سکون محسوس ہوگا جس کی تیز کرنیں اس کے دکھتے ہوئے اعضاء اور زخمی جسم پر مومیائی کا سا کام کریں گی اور افراد نوع انسانی پھر ایک بار اسی کے درخشاں فضا میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوں گے ——— اور یہی ہے وہ حقیقت جس کو غالب نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ "ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں" پھر یہ بات نہ محراب و منبر کی ہے کہ مجھ سا رند معصیت کوش اسے نہ کہہ سکے، نہ حدیث دار و رسن ہے کہ میرا ضعیف قلب اس کے اظہار سے خائف ہو۔ یہ ایک ایسے واقعہ کی پیشین گوئی ہے جس کو میری نگاہیں ابھی سے دیکھ رہی ہیں اور ہر چند اس وقت میں نہ ہوں گا لیکن جو ہوگا وہ دیکھ لیگا کہ آخر کار نوع انسانی اسی ایک مرکز پر جمع ہو کر رہی جسے آجکل کی اصطلاح میں نہیں بلکہ مستقبل کی اصطلاح میں سچے مذہب کے نام سے پکاریں گے کیونکہ وہ عبارت ہوگا محض انسانیت سے جس کی سب سے پہلے اسلام نے دعوت دی اور آخر میں بھی وہی اس کو انجام تک پہونچانے والا ثابت ہوگا۔

○

دنیا میں کوئی چیز بذات خود نہ بری ہے نہ اچھی۔ اس سے اچھائی یا برائی کا خلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا استعمال کیا جائے پھر اگر اس سے خیر و فلاح کا کام لیا جاتا ہے تو اس کی تعریف کی جاتی ہے ورنہ نہیں —— زنگ خوردہ لوہے کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اگر اسی سے زخم پہونچایا جانے لگے تو لوگ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ تیغ و تفنگ اپنی جگہ بے حقیقت چیزیں ہیں لیکن ان کے استعمال کی تاریخ اس قدر خونیں ہے کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی خائف ہو جاتے ہیں، درآنحالیکہ اگر ان سے انسان کا خون نہ بہایا جاتا تو آج لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل ہوتا کہ بندوق کی گولی انسانی سینہ کے اندر پیوست ہو سکتی ہے اور تلوار کی دھار انسان کے اعضاء کو قطع کر سکتی ہے۔ بالکل یہی حالت دنیا کی ان تمام تحریکوں کی ہے جن کو اصلاح نوع انسانی اور قیام امن و سکون کے لئے بروئے کار لایا گیا پھر جب تک ان سے مقصد اصلاح پورا ہوتا رہا لوگ متوجہ ہوتے رہے اور جب ان کی حقیقی روح مفقود ہو گئی تو لوگوں نے ان سے روگردانی اختیار کر لی اور وہ فنا ہو گئیں —— اصلاح اخلاق کی دنیا میں سب سے بڑا مرتبہ مذہب کا سمجھا جاتا ہے یعنی کوئی تحریک دنیا میں قیام امن و سکون کے نام سے ایسی پیش نہیں کی گئی جس کا نام مذہب نہ رکھا گیا ہو لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مذاہب عالم خواہ اپنی تعلیم کے لحاظ سے کتنے ہی امن پسند کیوں نہ ہوں لیکن تاریخی حیثیت سے ان کی خونریزیاں دخون آشامیاں نوع انسانی کے مصائب کی نہایت دردناک داستانیں ہیں۔ یقیناً اس سے زیادہ حیرت ناک امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو مذاہب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دنیا سے قتل و غارت گری، وحشت و درندگی مٹانے آئے ہیں اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں کے متبعین نے دنیا میں خونریزیاں کیں اور مذاہب کا نام لیکر

قتال وجدال کا بازار گرم کیا گیا یقیناً ایک سوچنے والے دماغ کے لئے یہ مسئلہ بڑی الجھنیں پیدا کر دینے والا ہے اور وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اس سے وہ کس نتیجہ پر پہونچے آیا یہ کہ مذہب کا خیال ہی دنیا میں ایک لغو خیال ہے یا یہ کہ واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی۔

——— اس حقیقت پر نگار کے صفحات میں بارہا روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے اور نوعِ انسانی کی ترقی کے لئے کسی ایسے نظام کا قائم ہونا جو امن و سکون کی بقا اور اخلاق کے قیام کا ضامن ہو خود انسان کی فطرت کا اقتضا تھا خواہ اس کا نام مذہب رکھا جاتا یا کوئی اور اس لئے اس پر بحث کرنا صرف لفظی نزاع ہوگی کہ اس کا نام مذہب کیوں رکھا گیا۔ کسی اور نام سے کیوں نہ موسوم کیا گیا۔ بہرحال فی نفسہ مذہب کی ضرورت یا اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس لئے لامحالہ ہم کو دوسری صورت پر غور کرنا پڑے گا کہ کیا واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ——— لفظ مذہب کا مفہوم طریقِ حیات یا طریقِ عمل ہے جو اپنی جگہ کس قدر معصوم معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی معصوم لفظ دنیا میں کتنی خونریزیوں اور معصیت کوشیوں کا سبب بنا اور وہی چیز جس کو پیامِ امن و نجات کی صورت سے ہمیشہ پیش کیا گیا اس نے کتنا ہنگامہ اور فتنہ و فساد عالم میں برپا کیا لیکن آپ جس وقت جنگوں کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک حقیقتاً دنیا میں کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہب کے نصب العین سے منسوب کیا جا سکے یا کسی مذہب نے اسے روا رکھا ہو۔ بلکہ تمام لڑائیاں صرف ہوسِ ملک گیری کی بنا پر لڑی گئیں یا خود غرضی یا نفسانی خواہشات پر۔ پھر یہ تو ہوا کہ بعض اہلِ مذہب نے محض مدافعت و حفاظت کے لئے واقعی خلوص و صداقت کے ساتھ اسلحہ اٹھائے لیکن جارحانہ جنگ کوئی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہبی ضرورت کی صورت میں پیش کیا جا سکے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ اس نے اپنی عسکریت کی نمائش اسی وقت کی جب مدافعت و حفظ

نفس کے خیال نے ان کو اس پر مجبور کر دیا طاغوتی قوتوں نے دنیا کے امن و سکون کو خراب کرنا چاہا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دنیاوی اغراض کے لئے اسلام نے کسی کا خون بہایا ہو۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیا انسانی خود غرضی اور نفس پرستی کی اس سے زیادہ کوئی مکروہ مثال اور مل سکتی ہے کہ اس نے جنگ تو کی ہمیشہ اسباب عیش و تنعم فراہم کرنے کے لئے۔ جاہ، زر و دولت و حکومت کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے۔ دشمنوں سے قبائلی و ذاتی عناد کا انتقام لینے کے لئے لیکن منسوب کیا اسے مذہب سے، اور مذہب کا نام لے لے کر اس نے ہمیشہ لوگوں کی جانیں لیں۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مذہب کا اولین دور ہمیشہ اس نوع کے جذبات سے صاف و پاک رہا ہے۔ لیکن جب بعد کو اس میں ایک جماعت دنیا پرست لوگوں کی پیدا ہوئی تو جنگ و جدال، کشت و خون سبھی کچھ ہوا اور لوگوں نے غلطی سے اس کو مذہب کی تعلیم سے منسوب کیا پھر جب حقیقت یہ ہے تو خدا کے لئے آج باہم نوع انسانی کے افراد میں مذہبی تفریق کو استخوان جنگ نہ بناؤ اور مذہب کو بدنام نہ کرو کیونکہ مذہب پیام امن و سکون ہے اور وہ فساد کو کبھی پسند نہیں کرتا اس لئے میرے نزدیک سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک دنیا میں وہ ہے جو قومیت اور وطنیت کے رشتہ کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور بڑا ظالم وہ تھا جس نے اول اول اس بدعت کو رواج دیا آج ھندوستان اسی لعنت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہنوز غلام نظر آ رہا ہے درآنحالیکہ اس سے بہت چھوٹے چھوٹے ملک کبھی کے آزاد ہو کر ترقی کی راہوں پر لگ گئے ہیں۔ غضب خدا کا کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے صدیاں گزر جائیں۔ وہاں کی آب و ہوا کا اثر پشتہا پشت سے ہمارے ذوق و مزاج پر ہوتا چلا آ رہا ہو۔ ایک ہی قسم کی بہار و خزاں میں ایک زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر زندگی بسر ہو رہی ہو لیکن پھر بھی بیگانگی کا یہ عالم کہ باہم مل کر کھانا بھی نہ کھا سکتے ہوں

محبت و الفت کے ساتھ ایک رات بھی کسی جگہ بسر کر سکیں۔

مذاہب کا شعائر و مراسم کے لحاظ سے مختلف ہونا عیب نہیں لیکن ان کی وجہ سے باہم گر نفرت و احتراز، بغض و عناد پیدا ہونا یقیناً مذاہب کی توہین ہے بلکہ کھلی ہوئی ہلاکت نوع انسانی کی ہے اور دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس کا مقصد انسان یا انسانیت کو ہلاک کرنا ہو اس لئے ہم کو شرم کرنا چاہئے کہ ہم مذہب کا کتنا غلط استعمال کر رہے ہیں اور انسانیت کی قربانی اپنے اغراض نفسانی کے دیوتا پر چڑھا کر اسے مذہب کا خراج سمجھتے ہیں۔

کیا خدا کا وجود ہے

دنیائے شاعری میں وجود باری پر سب سے زیادہ پاکیزہ خیال مرزا عبدالقادر بیدل کا ہے جنہوں نے احساس بےچارگی و بےکسی کا نام خدا رکھا ہے، لکھتے ہیں:۔

علاجے نیست داغِ بندگی را — اگر بیشم و گر کم آفریدند

اسی خیال کو اکبر الہ آبادی نے اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

خیر یہ تو شاعرانہ باتیں ہیں اور ان لوگوں کے تاثرات ہیں جن سے انکار خدا پر بھی بازپرس نہیں ہو سکتی، لیکن لطف تو یہ ہے کہ جب ہم شاعری سے قطع نظر حکمت و فلسفہ علم و تحقیق سے مدد چاہتے ہیں تو بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو بیدل یا دوسرے شعرا نے سمجھا یا ہے اور یہاں بھی اعتراف عجز ہی سے معرفت الٰہی کی بصیرت شروع ہوتی ہے:۔

آیئے آج کی صحبت میں اس اجمال کی تفصیل پر متوجہ ہوں۔

کائنات اور اس کی وسعت کو تو خیر جانے دیجئے کہ ضرورت اس آسمان پیمائی کی

نہیں ہے بلکہ اسی زمین پر رہنے اور بسنے کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے کارزمین ہی کو دیکھنا چاہیئے کہ خدا نے اپنے آپ کو ہم سے قریب الفہم بنانے کے لئے کچھ دلائل و شواہد یہاں چھوڑے ہیں یا نہیں

زمین کے موجودات تین قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جو زندگی رکھتی ہیں اور حرکت ارادی کے بھی مالک ہیں مثلاً انسان، شیر، مچھلی، چڑیا وغیرہ، اور اس قسم کو حیوان کہتے ہیں، دوسری قسم میں وہ مخلوقات ہیں جو زندہ تو ہیں لیکن حرکت ارادی سے محروم اور ان کا نام نباتات ہے، تیسری قسم وہ ہے جو نہ زندہ ہے، نہ حرکت ارادی پر قادر، جیسے مٹی، پانی، پتھر اور اسے جمادات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں اور کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ پتھر کا ٹکڑا ترقی کر کے گلاب کا درخت ہو جائے اور گلاب ترقی کر کے انسان بن جائے لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس قدر ظاہری و معنوی بُعد و تفریق کے جس وقت ان تینوں کی کیمیاوی تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی یہ سب کے سب پیدا ہوئے ہیں انھیں "مواد جامدہ" سے جو نہ جان رکھتے ہیں نہ حرکت ارادی پر قادر ہیں اور جن کا نام علمی دنیا میں "عناصر" رکھا جاتا ہے۔

آپ گیہوں کا دانہ زمین میں ڈالتے ہیں اور یہ دانہ مٹی، پانی اور ہوا سے بعض عناصر جذب کر کے رفتہ رفتہ درخت کی شکل اختیار کرتا ہے جس سے وہی گیہوں پیدا ہوتا ہے۔ آپ لیموں کا تخم بوتے ہیں اور لیموں ہی حاصل کرتے ہیں۔ آپ مرغی کے انڈے کو ایک متعین مدت تک گرمی پہونچا کر اس سے مرغی ہی کا بچہ پیدا کرتے ہیں۔ مرغابی کے انڈے سے مرغابی اور کچھوے کے انڈے سے کچھوے ہی نکلتے ہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ ان سب کی ترکیب انھیں عناصر سے ہوتی ہے جو بے جان ہیں جن میں کوئی حرکت ارادی نہیں لیکن کیا ممکن ہے کہ گیہوں کے تخم سے نارنگی اور

طاؤس کے انڈے سے سانپ پیدا ہو سکے۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب بنیاد سب کی ایک ہے تو یہ تفریق کیسی، اور حیات کی صورتوں میں یہ تنوع، یہ نیرنگی، یہ بوقلمونی کہاں سے آئی؟

اہل علم اس راز کے دریافت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ مختلف زندہ اجسام کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ حیوانات و نباتات کے اجزاء ترکیبی اور نباتات و جمادات کے اجزاء حیات میں کیا فرق ہے لیکن جب انھوں نے یہ عمل کیمیاوی کیا تو ہر صورت میں وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ تمام موجودات خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان چند عناصر بسیط سے مرکب ہیں جو بالکل بے جان ہیں۔ پھر انھوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے ان کو علٰحدہ علٰحدہ کرنے سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے آؤ ان کو پھر ملا کر دیکھو لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ وہ عناصر کو ایک بار علٰحدہ کرنے کے بعد باہم گر ملا ہی نہیں سکتے اور اگر کسی طرح ملا دیں تو اُن میں کوئی آثار حیات پیدا نہیں ہوتے۔

ایک عندلیب ہمارے سامنے چہچہا رہا ہے۔ پاس ہی ایک گلاب کا درخت ہے۔ جس کے رنگین پھولوں کی خوشبو ہمارے دماغ کو معطر کر رہی ہے اور وہیں ایک پتھر کا وزنی ٹکڑا ہے جس کو ہمارے ہاتھ آسانی سے نہیں اٹھا سکتے لیکن جب ہم عندلیب کو ہلاک کر کے اس کی ترکیب حیات کی جستجو کرتے ہیں، گلاب کا پھول توڑ کر اس کے عناصر دریافت کرتے ہیں۔ پتھر کے اجزاء تحلیل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجزاء بالکل جامد ہیں بے جان ہیں۔ نہ اُن میں کوئی آواز ہے نہ نغمہ، نہ خوشبو نہ وزن، اور مطلق ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چیز تھی جو بلبل کے حقیر جثہ میں ایک دنیائے نغمہ، پھول کی ضعیف و نازک شکل میں ایک ہنگامۂ نکہت اور پتھر کے سکون بار وجود میں ایک وزن اعصاب شکن کی کیفیت رکھتی تھی پھر جب یہ صورت تحقیق و تفتیش کی کسی نتیجہ تک نہ پہونچا سکی تو اہل علماء

نے جستجو کی ایک اور راہ اختیار کی جو یقیناً زیادہ بالغ نظری پر مبنی تھی انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام خوردبین ہے اور جو اجسام صغیرہ کو لاکھوں کروروں گنا بڑا کرکے دکھاتا ہے اس کے ذریعہ سے جب انھوں نے زندگی کے راز کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زندہ اجسام میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جراثیم پائے جاتے ہیں جو شفاف ہیں بے رنگ ہیں اور کچے انڈے کی سپیدی کی طرح لیسدار ہیں۔ یہ جراثیم مختلف شکل کے ہیں اور نباتات، حیوانات کے اندر ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مشغلہ یہ ہے کہ آس پاس سے بطور غذا مواد جاذبہ حاصل کرکے کسی ایسے طریقہ سے جس کا علم اس وقت تک انسان کو حاصل نہیں ہو سکا، ان کو زندگی بخشتے ہیں اور پھر اعصاب، شرائین، عضلات وغیرہ میں تحلیل ہو جاتے ہیں لیکن یہ نظام اتنا مکمل ہے کہ جو جراثیم ہڈی بنانے کے لئے متعین ہیں وہ ہڈی ہی بنائیں گے جو پتی کی تشکیل پر مامور ہیں وہ پتی ہی ترتیب دیں گے اور جن کے سپرد پھل بنانے کی خدمت ہے وہ سوائے پھل کے کچھ نہ بنا سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان جراثیم کو ایک ہی قسم کا ماحول غذا کے لئے ملتا ہے، لیکن باوجود اس کے نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے یعنی پھل کی جگہ نہ کونپل اُگتی ہے اور نہ ٹہنی کے بجائے پھول اور آخرکار یہ جراثیم تمام جسم میں۔ شرائین میں، اعصاب میں، عضلات میں الغرض ہر جگہ اس قدر کثرت کے ساتھ پھیل کر ایک ہستی کا جزو ہو جاتے ہیں کہ سوئی کی نوک کے ہزارویں حصے کے برابر بھی جسم کا کوئی حصہ اُن سے خالی نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ تمام جراثیم چند ابتدائی جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے زندہ جرثومہ جو ان جراثیم کی آفرینش کا باعث ہوا کیا تھا؟ اس کو زندگی کس چیز نے بخشی اور پھر اس سے مختلف خواص و کیفیات رکھنے والے لاکھوں کروروں سے بھی زیادہ ناقابل شمار جراثیم کیونکر پیدا ہوئے۔ یہ سوال ایسا ہے جس کا جواب اب تک کسی بڑے سے بڑے عالم

سے بن نہیں پڑا، اور یہی وہ عجز ہے جو کسی قوت برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے کی طرف ایک شخص کی رہبری کرتا ہے۔

آپ کسی کارخانے میں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ بڑے بڑے دیو پیکر آہنی پہیئے ——— ہر وقت گردش میں ہیں۔ بہت سے آلات اِدھر سے اُدھر تیزی سے حرکت کر رہے ہیں ایک منظم طریقے سے مشین کے تمام پرزے اپنا کام کر رہے ہیں۔ لیکن دیکھنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال کسی کو پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تمام حرکت و جنبش، یہ تمام نظام و عمل از خود پایا جاتا ہے۔ یقیناً عقل انسانی اس کا سبب دریافت کرے گی اور جب اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب اس بھاپ کی قوت سے ہو رہا ہے جو کوئلہ اور پانی کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔ پھر جب ایک معمولی مشین کا وجود اور اس کی حرکت و عمل بغیر کسی موجد و محرک کے نہیں ہو سکتی تو قدرت کے یہ بے شمار مظاہر آثار موجودات کی گوناگوں صورتیں کس طرح از خود ظہور میں آسکتی ہیں۔

خیر اس مشین کی مثال چھوڑ دیئے کہ یہ ایک نہایت ہی فرسودہ طریق استدلال ہو آپ ان چھوٹے چھوٹے جاندار کیڑوں کو لیجئے جن کو نگاہ نہیں دیکھ سکتی اور جو اس حد تک غیر مرئی ہیں کہ اگر ہزار اندر ہزار اُن کو جمع کیا جائے تو بھی سرسوں کے دانے سے زیادہ ان کا حجم نہیں ہوتا پھر لطف یہ ہے کہ یہ تمام خوردبینی کیڑے اور نباتات بالکل اسی طرح پیدا ہوتے بڑھتے اور فنا ہوتے ہیں جیسے تمام ذی حیات مخلوق اور علم انسانی آج تک نہ اُن کی حقیقت آفرینش کو دریافت کر سکا اور نہ اس امر پر قادر ہوا کہ ان تمام حقیر مخلوقات میں سے کسی ایک ہی مخلوق کے کسی ایک عضو کو بنا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان ہوا میں پرواز کرتا ہے، برق و کہربا کے ذریعہ سے زمین کی طنابیں کھینچے ہوئے ہے، اپنی ایجادات و اختراعات سے اس نے انسانی زندگی

کے اصول کو بالکل بدل دیا ہے لیکن بایں ہمہ تم ساری دنیا کے ماہرین کیمیا، حیاتیات و فضلائے تشریح کو جمع کر کے دریافت کرو کہ کیا وہ مچھر کی ایک آنکھ کی طرح کوئی آنکھ بنا سکتے ہیں، مکھی کی ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرح کوئی عضو بنا کر دکھا سکتے ہیں؟ تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور آخر کار ان سب آسمان و زمین کے قلابے ملا دینے والوں کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ اُن کے امکان سے باہر ہے۔

یہی انسان کا اعتراف عجز یہی اس کی عقل و فراست کی حیرانی، اور یہی اس کی بےچارگی و بےبسی ہے جہاں سے وجود باری کے وجوب کے حدود شروع ہوتے ہیں اور آخر کار بقول رازی انسان کو کہہ دینا پڑتا ہے کہ اس کے پہچاننے کے لئے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ کسی حجت و برہان کی، کیونکہ کائنات کے ایک ایک ذرہ کی تکوین اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے اور اسی کو ایک شاعر نے "ہر رتے دفتریست معرفت کردگار" کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے

اسی سلسلہ میں ایک امر اور بھی قابل غور ہے یعنی یہ کہ کیا خدا آفرینش کے اس سلسلہ کو قائم کر کے علٰحدہ ہو گیا ہے اور اب اسے دنیا کے نظام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا؟ — بعض کا خیال یہی ہے آیئے اس مسئلہ پر بھی ایک نگاہ جستجو ڈال لیں۔

ابھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ تمام اجسام، شفاف ولیسدار جراثیم سے بنے ہیں اور ان جراثیم کی ترکیب تمام حیوانات و نباتات میں ایک ہی ہے۔ اچھا اب دیکھئے کہ ان جراثیم کی ترکیب کیمیاوی کیا ہے؟

یہ علم غالباً اکثر حضرات کو ہوگا کہ یہ جراثیم چار عناصر بسیطہ سے مرکب ہیں۔
آکسیجن۔ ہیڈروجن۔ نیٹروجن اور کاربن۔
کاربن ایک زہریلی گیس ہے، آکسیجن ایک گیس ہے جو اجسام کو مشتعل کر دیتی ہے

اسی طرح ہائیڈروجن ایک شفاف گیس ہے جو آکسیجن سے ہلکی ہوتی ہے اور نائٹروجن بھی، لیکن ان کے باہم امتزاج سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسکول کے ہر طالب علم کو معلوم ہوں گے کہ جب آکسیجن اور ہیڈروجن دونوں گیسیں ملتی ہیں تو پانی وجود میں آتا ہے چنانچہ سمندر، دریا، نہر اور بادل وغیرہ میں ہر جگہ پانی کا وجود انھیں دونوں گیسوں کے امتزاج سے ہے۔ نیٹروجن اور آکسیجن جب دونوں ملیں گے تو تیزاب پیدا ہوگا۔ آکسیجن و کاربن جب ملیں گے تو ایک زہریلی گیس پیدا کریں گے اور ہیڈروجن و کاربن مل کر قابل اشتعال گیس کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اور اگر یہ چاروں مل جائیں تو ظاہر ہے کہ انھیں مذکورہ بالا مرکبات میں سے کوئی نہ کوئی شکل پیدا ہوگی۔ اور یہ مخفی نہیں کہ ان میں سے کوئی صورت حیات کے لئے مفید نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ان عناصر بسیط کو مرکب کر کے جراثیم پیدا کرتی ہے اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ نباتات پیدا کرنے والے جراثیم نباتات ہی پیدا کریں گے حیوانات کے جراثیم حیوانات ہی بنائیں گے۔ کبھی ایسا نہ ہوگا کہ پھول کے جراثیم کسی طائر کی ساخت میں معروف ہو جائیں اور طائر کے جراثیم کسی انسان کی ترکیب میں،

اگر یہ نظم و اہتمام جسے صرف نگہداشت ایزدی کہنا چاہیئے شامل حال نہ رہے تو آکسیجن ہمارے جسموں کو جلا ڈالے۔ ہیڈروجن سے مل کر تمام دنیا کو عالم آب بنا دے، نیٹروجن کے ساتھ ترکیب پا کر ہمارے اوپر تیزاب کا سا کام کرنے لگے گوشت بنانے والے جراثیم صرف خون بنانے لگیں اور ہم ایک رقیق چیز کی طرح ادھر سے ادھر بہتے پھریں اس طرح ایک کاشتکار گیہوں بوئے اور مینڈک اُگنے لگیں۔ مرغی کو انڈوں پر بٹھائیں اور ان سے سانپ پیدا ہونے لگیں۔ الغرض تمام نظام عالم درہم و برہم ہو جائے۔

اگر خدا کے وجود کو تسلیم کرنا فطرتِ انسانی سے متعلق ہے تو اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر استنتاجی ہے تو شواہدِ طبیعت اور مظاہرِ کائنات سے زیادہ کوئی برہان مقصود تک پہونچانے والی نہیں۔

شیعہ، سنّی نزاع

لکھنؤ اپنی شیعہ آبادی کی کثرت اور اپنی مرکزیت کی وجہ سے ہندوستان میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو سرزمین ایران کو حاصل ہے اور اگر یہاں کے مراسم عزاداری اور شیون وبکا کی شدّت و وسعت کو سامنے رکھا جائے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن سے زیادہ بلند اخلاق کی جماعت دنیا میں کوئی اور ہو سکتی ہے، اگر ان تمام ظاہر داریوں کیساتھ سو میں ایک حصہ بھی سیرتِ حسین کی کیفیتوں کو وہ حقیقتاً اپنے اوپر طاری کر لیں —

———— یوں تو میرا تعلق کسی خاص مسلک ومشرب سے نہیں ہے لیکن چونکہ میرا خاندان ہمیشہ سے حنفی المذہب رہا ہے اس لئے ممکن ہے مجھے مذہبی حیثیت سے مستحق نہ سمجھا جائے کہ حضرات شیعہ کے کسی دینی اعتقاد یا رسم ورواج کے متعلق کوئی رائے پیش کروں، تاہم اس حیثیت سے جو ایک شخص ثالث کو حاصل ہوتی ہے غالباً مجھے آزادی سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو صرف اظہارِ رائے کی حد تک بلاقید ملک وملّت ہر شخص کو ملنی چاہیئے علی الخصوص اس وقت جبکہ لکھنؤ کی موجودہ فضا میں یہ تفریق امن وسکون کو خطرہ میں ڈالنے کی حد تک پیچیدگی اختیار کر چکی ہو ————

بہرحال جس وقت میں اس مسئلہ پر قلم اٹھا رہا ہوں اس لحاظ سے نہیں کہ میں ان دونوں فریق میں سے کسی ایک فریق کا فرد ہوں، اور نہ اس حیثیت سے کہ میں اس سلسلہ میں کسی مناظرۂ مذہبی کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہوں، بلکہ میری یہ جسارت صرف اس خیال کے تحت ہے کہ میں بھی اسی قطعۂ زمین میں سانس لے رہا ہوں جہاں یہ لوگ آباد ہیں اور وہاں کا ایک ادنیٰ باشندہ ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے خواہ وہ کیسی ہی ادنیٰ اور ناقابلِ لحاظ کیوں نہ ہو —————— ہاں، تو جیسا میں نے اوّلین سطور میں ظاہر کیا، لکھنؤ کو اپنی شیعہ آبادی کے لحاظ سے جو خصوصیت حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں، لیکن چونکہ تناسبِ آبادی کے لحاظ سے اکثریت سنیوں ہی کی ہے اور فرنگی محل کے وجود نے ان کی مذہبی مرکزیت بھی بڑی حد تک یہاں قائم کر رکھی ہے اس لئے باوجود کثرتِ آبادی کے شیعہ جماعت کو یہاں بھی اپنے سے زیادہ بڑی جماعت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ یہاں ہر دو فریق کے علماء اپنے اپنے کام میں برابر لگے ہوئے ہیں اس لئے دونوں جماعتوں کے افراد میں ہر وقت ایک قسم کی گرمی پائی جاتی ہے علی الخصوص محرم کے زمانہ میں کہ جب دونوں جانب کے مبلغین و واعظین اپنے اپنے ترکش کا ایک ایک تیر صرف کرنے میں اپنی انتہائی قوت سے کام لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک اس سے زیادہ لعنت ایک انسان کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ مذہب کے لئے لڑے اور مذہب کی خاطر جامعۂ بشری میں تفریق کا باعث ہو۔ میں حیران ہوں کہ اگر تمام دنیا میں "انسان" ایک ہے تو پھر اس کا مذہب کیوں نہ ایک ہو جبکہ یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب سب کو ایک کرنے والا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو دیکھ کر ایک شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دنیا کی خونریزیاں اور خون آشامیوں کا ذمہ دار صرف مذہب ہے اور جب تک اس کا

خیال لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیگا۔ عالم انسانی ہمیشہ یوں ہی جس طرح ...

آپ کسی مذہب کی تعلیمات اٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ امن وسکون کا خواہشمند کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ وحشت و درندگی کا ثبوت شاید ہی کسی اور دوسرے نے دیا ہو۔ عیسوی مذہب کو لیجئے جو اپنی تعلیمات کے لحاظ سے کیسا گوشہ نشین، کتنا خلوت پسند، کس درجہ امن خواہ اور صابر و ضابط مذہب ہے۔ لیکن جب آپ اس کی تاریخ پڑھیں گے تو حیران رہ جائیں گے کہ انسانی خون بہانے میں شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس سے سبقت لے گیا ہو۔ اسی طرح آپ اسلامی تعلیمات پر غور کیجئے کیا ان کے مطالعہ کے بعد کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ عافیت طلبی کی خواہش کسی اور طریق تعلیم میں پائی جاسکتی ہے، لیکن تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ اس عافیت طلب جماعت، اسی امن پسند گروہ اور "رحمۃ للعالمین" کی اس محبت پرست امت نے کیسی کیسی خونریزیاں کیں ٹھیک اسی وقت جبکہ ان کی زبانوں پر لاتفسدوا فی الارض کا وعظ جاری تھا۔ یہ زمین کے امن کو تباہ و برباد کر رہے تھے اور اسی لمحہ میں جب یہ غیروں کے ساتھ بھی اپنوں کا سا سلوک کرنے کی تلقین فرمارہے تھے، خود اپنوں سے غیروں کا سلوک کر رہے تھے، گوشت سے ناخن جدا ہو رہا تھا اور انھیں پروا نہ تھی۔ بھائی بھائی کو ذبح کر رہا تھا اور یہ مسرور تھے۔

دنیا میں کوئی تعلیم محض تعلیم ہونے کے لحاظ سے بے معنی چیز ہے اگر عملی زندگی میں اس سے کوئی تغیر نہ پیدا ہو۔ پھر تعلیمات مذاہب کو عملی زندگی کے لحاظ سے اگر کسوٹی پر کسا جاسکتا ہے تو وہ صرف صفحات "تاریخ" ہیں اور یہ جس طرح خون سے رنگین نظر آتے ہیں کسی سے مخفی نہیں۔ یقیناً یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب کا خیال دنیا

میں ایک نئو خیال تھا۔ کیا دنیا نے عمل کے لحاظ سے مذاہب عالم ناکام ثابت ہوئے۔ کیا انسانی اخلاق پر ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہوا۔ اس کا جواب مجھ سا آزاد خیال انسان تو کچھ اور دے گا لیکن ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتا ہے اور مذہب کی ضرورت کا قائل ہے۔ آپ کے سامنے بہت سی ایسی مثالیں پیش کر دے گا جن سے مذہب کی برکات آپ پر ثابت ہو جائیں۔ پھر آپ اس سے یہ پوچھئے کہ اگر یہ صحیح ہے تو اب وہ برکات کیا ہوئیں اور اب وہ تعلیمات کیوں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں تو وہ اس کا جواب یہی دے گا کہ ان تعلیمات پر عمل کرنا ترک ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ یہ سوال کیجئے کہ جب ہر مذہبی انسان اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ وہ تعلیمات مذہب پر عامل نہ ہونے سے تباہ ہو رہا ہے تو کیوں عمل نہیں کرتا جان بوجھ کر کیوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے تو وہ اس کے جواب میں صرف اپنی "بدنصیبی" اور "کم بختی" کا شکوہ پیش کر دے گا۔ مگر وہ لوگ جو کسی بات کی تہہ تک پہونچنے کے شائق ہیں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دنیا میں اب مذہبیت کی عمر ہی ختم ہو گئی ہے اور خدا اب کار و بار عالم چلانے کے لئے بالکل جدید آئین پیدا کرنا چاہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ حقیقت یہی ہو، لیکن میرے نزدیک اس کا ایک سبب اور بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق نہ بدنصیبی سے ہے نہ عدم ضرورت مذہب سے اور وہ یہ کہ کہیں ایسا تو نہیں جس کو اب مذہب سمجھا جا رہا ہے وہ سرے سے مذہب ہی نہ ہو اور جن باتوں کو ہم تعلیمات مذہب قرار دے رہے ہیں وہ حقیقتاً مذہب سے کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں۔ دنیا نام جذبات و جذبات پرستی کا نہیں ہے۔ اگر آپ محبت کو اچھی چیز سمجھتے ہیں اور محبت نہیں کرتے تو آپ کے درس محبت کو کون سنے گا۔ آپ کی جو حالت آنکھوں کے سامنے ہے اسی کو دیکھ کر آپ کے خیال و اعتقاد پر حکم لگایا جائے گا۔ زمانہ کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ آپ کی دینی و اخلاقی

گتھیاں بیٹھ کر سلجھایا کرے، اور آپ کی مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کرے، وہ تو صرف آپ کو اور آپ کی زندگی کو دیکھے گا اور آپ کی ساری قوم اور آپ کی تمام تعلیمات مذہبی پر اسی کے مطابق حکم لگا کر صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ کرے گا۔

پھر آئیے تھوڑی دیر کے لئے ہم خود بھی غور کریں کہ ہماری حالت کیا ہے؟

اس وقت گفتگو نہ سیاست سے ہے نہ ترقی علم و دولت سے بلکہ ہیئت اجتماعیہ کے اس اساسی و ابتدائی مسئلہ سے جس کو خدائے پاک نے "حبل اللہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پھر یقیناً خدا کی یہ رسی کوئی لوہے کی رسی نہیں ہے، فولاد کی زنجیر نہیں ہے بلکہ اس رشتۂ اخوت کی زنجیر ہے جس سے تمام نوع انسانی کو وابستہ کیا گیا ہے اور جسے فولاد و آہن سے کہیں زیادہ مستحکم ہونا چاہیئے۔ مگر نوع انسانی کا تو خیر کیا ذکر ہے۔ یہاں تو اس جماعت کے افراد بھی اس سے وابستہ نہیں جس میں جماعت کا مفہوم ہی اس حبل اللہ کے اعتقاد نے پیدا کیا تھا۔ پھر کوئی بتائے کہ کیا شیعہ سنیوں کا افتراق اسی ایک جماعت کے افراد کا افتراق نہیں ہے؟

میں نے ان دونوں جماعتوں کے اختلاف و نزاع پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو سنی سمجھ کر حالات کا مطالعہ کیا۔ کبھی شیعہ بن کر واقعات پر نگاہ ڈالی کسی وقت ایک شخص ثالث کی حیثیت سے اس کو سمجھنا چاہا، لیکن آپ باور کیجئے کہ ان کے اختلاف کا حقیقی سبب سوا حماقتوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو دونوں فریق کے نزدیک "استخوان جنگ" بنا ہوا ہے بعض خلفاء و صحابہ سے متعلق ہے لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ اس کا تعلق دین اسلام سے کیا ہے اور اس پر جنگ و خوں ریزی کے کیا معنی ہیں؟ فرض کیجئے کہ کسی کے باپ کے پاس مختلف رنگ

آتے ہیں اور وہ ان سب سے دوستی کا سا برتاؤ کرتا ہے، باپ کے مرنے کے بعد دو بیٹوں میں یہ بحث آن پڑتی ہے کہ باپ کے پاس آنے والوں میں سے کون شخص سچا دوست تھا اور کون نہیں۔ ایک کہتا ہے سب وفادار دوست تھے، دوسرا کہتا ہے نہیں بعض مخلص تھے اور بعض غیر مخلص، وہ بھی اپنے دلائل پیش کرتا ہے اور یہ بھی، یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں لیکن اگر اختلاف نگاہ رحجت ایسی صورت اختیار کرے کہ دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جائے تو اس کو سوا حماقت کے اور کیا کہیں گے، اول تو یہ پوچھئے کہ اس وقت جبکہ نہ باپ زندہ ہے نہ اس کے پاس کے بیٹھنے والے احباب اس بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر ضرورت مان لی جائے تو بھی اس گفتگو کا اس حد تک بڑھ جانا کہ دو بھائی ایک دوسرے پر تلوار کھینچ کر جان لینے کے لئے آمادہ ہو جائیں، سوا حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اعتقاد کے لحاظ سے اسلام نام ہے صرف خدا کی وحدانیت اور رسول رسالت کے اقرار کا، سو اس میں شیعہ سنی دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر حضرات شیعہ بعض خلفاء صحابہ کو اچھا نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے کہ اس کے کچھ اسباب و دلائل اُن کے پاس ہوں گے اس لئے اس مسئلہ کا تعلق صرف تاریخ و تحقیق تاریخی سے ہونا چاہیئے نہ کہ مذہب سے۔ یعنی ہم کو تاریخ کے صفحات میں جستجو کرنا چاہیئے کہ وہ اسباب جو بیان کئے جاتے ہیں واقعی صحیح ہیں یا نہیں۔ اگر کسی کے نزدیک صحیح ہیں تو اس کو ایک تاریخی حقیقت کی صورت سے پیش کر کے خاموش ہو جانا چاہیئے۔ بُرا بھلا کہنے یا گالیاں دینے سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر کسی کے نزدیک غلط ہیں تو ان پر تنقید کر کے علیحدہ ہو جانا چاہیئے اور اس جستجو میں نہ پڑنا چاہیئے کہ کوئی اپنے گھر میں کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

آج میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمام شیعہ حضرات اپنی تاریخی کتب کو متفقہ طور پر صحیح تسلیم کرتے ہیں یا اہل سنن بغیر کسی اختلاف باہمی کے تمام روایات کو متفق و درست باور کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کرنا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ شیعہ و سنی کی تاریخی کتابوں میں ہم کثرت سے اختلاف پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس طرح خود شیعہ علماء و مورخین بہت سے تاریخی واقعات پر مختلف رائیں رکھتے ہیں اسی طرح سنی علماء بھی باہم کر متفق نہیں۔ تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جب اور تاریخی واقعات پر اختلاف ہونے کی وجہ سے آپس میں نزاع نہیں ہوتی تو خاص صحابہ کے مسئلہ پر کیوں جنگ کی جاتی ہے اور کیوں ایک دوسرے سے اس قدر علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ ایک کا مذہب ہی امامیہ یا شیعہ کہلاتا ہے، اور دوسرے کا حنفی یا سنی، اس پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف کا سبب محض اختلاف تاریخی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے جس کی بنیاد آج نہیں بلکہ اسی وقت پڑ چکی تھی جب رسول اللہ بقید حیات تھے اور اسلام ایک جیتا جاگتا مذہب تھا

جب کوئی پیغمبر رونما ہوتا ہے تو وہ ایک خاص خیال کے تحت اصول اصلاح و تبلیغ کو متعین کر لیتا ہے جو نتیجہ ہوا کرتے ہیں وقت کا، ماحول کا اور ان خاص خاص واقعات کا جو اس زمانہ میں رونما ہوئے۔ اسی کو ایک مذہب کی سائیکالوجی کہتے ہیں اور یہیں سے اس کے مستقبل پر حکم لگایا جا سکتا ہے، مثلاً آپ ہندو مذہب کو لیجئے اور اس کی سائیکالوجی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ مزارعین و فلاحین کا مذہب ہے اور اسی لئے اب تک اس کے متبعین کی معاشرت و زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ایک خاص قسم کی نباتیت پائی جاتی ہے اور عیسوی مذہب کی ابتدا ایک مظلومانہ صبر و استقلال سے ہوئی اور اس کیفیت کے بعد جو عزم راسخ ایک قوم میں پیدا ہو جاتا ہے وہ اس وقت بھی

عیسوی جماعت میں پوری طرح نظر آتا ہے۔ دینِ موسوی دنیوی برکات کے لئے برسرِ پیکار ہوکر نمودار ہوا اور آخر کار اس کے مقلدین میں وہ ردِ عمل پیدا ہوا جو دنیا پرست لوگوں میں قدرتاً پیدا ہوجانا چاہیئے۔ اسلام "انتم الاعلون" کا آوازہ بلند کرتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے پاکیزگیٔ اخلاق کے ساتھ دنیاوی سربلندی کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ پھر چونکہ فطرتِ انسانی تعیش پسند و جاہ طلب واقع ہوئی ہے اس لئے عہدِ سعادت کے بعد ہی دونوں کا توازن مفقود ہونے لگا اور خلافتِ راشدہ ہی میں دو مخالف فریق پیدا ہوکر طلبِ جاہ و کشمکشِ باہمی کے مناظر سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک فریق کامیاب ہوگیا جسے آجکل کی اصطلاح میں سنی کہتے ہیں اور دوسرا ناکام رہا جسے شیعہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علوئین کی جماعت اوّل اوّل صرف جذبۂ محبت کے تحت وجود میں آئی کیونکہ وہ شخص جو رسول اللہ سے محبت کرے گا اس کا آلِ رسول و اہلبیت سے محبت کرنا ناگزیر ہے یہ فطرتِ انسانی ہے کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کو برسرِ عروج و اقتدار دیکھنے کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ رحلتِ نبوی کے بعد خلافت کا مسئلہ جن لوگوں نے جس طرح طے کیا اس میں محبت کی رعایت تو یقیناً نہیں تھی لیکن مصلحت و ضرورت کی رعایت ضرور تھی پھر اب یہ فیصلہ کرنا کہ خلافت کا مسئلہ بر بنائے اصولِ محبت طے ہونا چاہیئے تھا یا بر بنائے مصلحت ازبس دشوار ہے کیونکہ وہ لوگ جو رسول اللہ و آلِ رسول سے محبت کرنے والے تھے بعد کو ان کی اولاد کے سامنے بھی سوال محبت کا نہیں رہا بلکہ وہی جاہ و ثروت کا رہ گیا تھا اور جنھوں نے اوّل دن مصلحت و ضرورت کو سامنے رکھ کر خلافت کے مسئلہ کو طے کیا تھا ان کی نسل میں تو خیر کوئی رعایت محبت و الفت کی ہو ہی نہیں سکتی تھی، مگر بعد کو مصلحت و ضرورت کی اہمیت بھی اُن کے سامنے باقی نہ رہی۔ اختلافات بڑھتے گئے

مناقشات سنگین ہوتے گئے، دل کی کدورتیں زبانوں پر آنے لگیں، طبیعتوں کی برہمی نے تیغوں کو بے نیام کرنا شروع کیا۔ محبت و مصلحت کی نزاع آخر کار صرف دنیاوی، ملکی اور سیاسی نزاع ہو کر رہ گئی۔ نہ رسول و آل رسول سے محبت کرنے والے رہ گئے، نہ دیانت و امانت کے ساتھ مصلحت پر غور کرنے والے باقی رہے۔ اور کھلم کھلا سلطنت و دولت اور جاہ و ثروت کے لئے دونوں جماعتیں میدان میں اُتر آئیں۔ پھر دیکھو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ تاریخ کے صفحات ہر شخص کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور معمولی فہم کا انسان بھی آسانی سے اُن کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جو زمانہ امیر معاویہ کی حکومت سے شروع ہوتا ہے کیا اس کو رسول و آل رسول کی محبت سے متعلق کر سکتے ہیں اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس میں سوا کسب دولت و ثروت اور حصول جاہ و مرتبت کے کوئی اسلامی ضرورت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ اگر مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روح معہ اپنے احساسات کے قائم رہتی ہے اگر اہل اسلام کا یہ ایمان ہے کہ رسول اللہ عالم روحانی میں اب بھی رسول اللہ ہیں تو خدا کے لئے بتاؤ قاتل حسین سے اُنکی رضامندی کی صورت کیا ہو سکتی ہے اور وہ کیونکر امیر معاویہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ انھوں نے حسین کے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر اپنے فاسق و بادہ خوار بیٹے یزید کو خلیفہ مقرر کیا اور نہ صرف خلیفہ مقرر کیا بلکہ اس کی خلافت کی تکمیل میں ہر اس ترکیب و تدبیر سے کام لیا جو مادی سلطنت کے استحکام کے لئے سیاسیات کی دنیا میں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ آج سنیوں کو شکایت ہے کہ حضرات شیعہ صحابہ و خلفاء کو بُرا کہتے ہیں لیکن کیا کبھی ان خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کے کارناموں پر بھی غور کیا ہے جنھوں نے علی الاعلان مسجدوں کے محراب و منبر پر علی کو گالیاں دیں اور دلوائیں۔ یقیناً میں نہایت کراہت کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ حضرات شیعہ صحابہ میں سے کسی کو بُرا کہیں لیکن بالکل اسی طرح جس طرح میں سبّ علی کو بُرا سمجھتا ہوں۔ پھر اگر یہ نزاعات و اختلافات

محض تاریخی حیثیت رکھتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا کیونکہ اسلامی حکومت و خلافت کے ساتھ یہ قصہ بھی ختم ہو چکا ہے لیکن مصیبت یہ آپڑی ہے کہ بجائے تاریخی اختلاف کے یہ مذہبی اختلاف ہو گیا اور اگر ایک طرف حضرات شیعہ نے "سبِّ صحابہ" ایسے مکروہ و لایعنی فعل کو داخلِ مذہب کر لیا تو دوسری طرف سنیوں نے اس قدر عصبیت سے کام لیا کہ "لعنِ یزید" کو بھی ناجائز قرار دے کر فقہ و اصولِ فقہ میں شامل کرنے سے احتراز نہ کیا۔ حالانکہ کوئی اُن سے پوچھے کہ اس مسئلہ کا فقہ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر "لعنِ یزید" اس دلیل کی بناء پر ناجائز قرار دیا جاتا ہے کہ ممکن ہے خدا نے اسے بخش دیا ہو تو کیا کسی شخص کا یزید پر لعن کرنا، قتلِ حسین سے زیادہ شدید معصیت ہے جس کو خدا معاف نہیں کر سکتا۔

الغرض آپ سنی شیعہ کے تمام اُن اختلافات کو بغور دیکھیے جن کو داخلِ مذہب کر لیا گیا ہے اور پھر انصاف کیجئے کہ ان کا تعلق مذہبِ اسلام سے کیا ہے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایک اختلاف بھی ایسا نہیں نکلے گا جو اصول سے واسطہ رکھتا ہو بلکہ سب کے سب تاریخ سے متعلق ہوں گے جو سیاسی مصالح کی بناء پر کسی وقت قصداً پیدا کئے گئے تھے اور اب ہم لوگوں کی حماقت سے وہ داخلِ دین و مذہب سمجھے جانے لگے ہیں۔

یقیناً تعزیہ داری اور مجالسِ عزا میں ایسی روایات کا پڑھنا جو اہل بیت کی سیرت کو بجائے بلند دکھلانے کے پست ثابت کرنے والی ہیں، کسی کے نزدیک اچھا فعل قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اسی کے ساتھ سنی جماعت اپنی قبر پرستی اور اُن کتبِ مواعظ کی کیونکر پردہ پوشی کر سکتی ہے جن میں خود رسول کی ذاتِ گرامی کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے دونوں جماعتیں یکساں قابلِ ملامت ہیں لیکن سب سے زیادہ قابلِ ملامت ان جماعتوں کے وہ قائد و رہنما ہیں جو اُن کے جاہلانہ عقائد اور وحشیانہ

عقائد کو بجائے دل سے نکالنے کے اور زیادہ مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ کیا میں حضرات شیعہ کے علماء مجتہدین سے سوال کرسکتا ہوں کہ کبھی انھوں نے اپنی مجالس میں یہ تلقین بھی کی ہے کہ حسین کی محبت کا تقاضا ان کی سی صداقت پرستی اختیار کرنا ہے اور سوار دنے رلانے والی حکایات اور روایات کے جن میں بہت کم حصہ راستی و صداقت کا ہوتا ہے کبھی انھوں نے کسی ایسی تنظیم کی عملی کوشش کی ہے جو براہ راست لوگوں کے اخلاق کو متاثر کرنے والی ہو۔ اسی طرح کیا میں سنی علماء و واعظین سے یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ انھوں نے ایام محرم میں کبھی برادران شیعہ کے مذہبی جذبات کا احترام کرکے اُن کی سوگواریوں یا مجالس عزا میں شرکت گوارا کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے علماء ہی آپس میں نہیں ملنا چاہتے اور چاہ بھی کیونکر سکتے ہیں جب کہ دنیاوی جاہ و جلال اور عظمت و وقار کی بنیاد ہی تفرقہ پردازی اور جاہلوں کو جاہل و متعصب بنائے رکھنے کے اصول پر قائم ہوتی ہے اور معاشرت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب تک دو فریق باہم رواداری سے کام نہ لیں گے کبھی ان کے اختلافات نہیں مٹ سکتے یہی وہ چیز ہے جس سے ہمارے یہاں علماء کو بیر ہے۔ مگر وہ مناظرہ کے لئے ہر وقت تیار ہیں، مذہبی مجادلہ کے لئے اپنی جماعتوں کو مشتعل کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ ہیں۔ لیکن اگر ان سے کہیئے کہ قبلہ کوئی صورت باہم مل کر بیٹھ جانے کی بھی ہے یا نہیں تو وہ کہہ دیں گے کہ اس کا تو امکان نہیں کیونکہ ایک کے نزدیک صحابہ کو برا سمجھنا قرآن و خدا کو برا سمجھنا ہے اور دوسرے کے نزدیک صحابہ کو اچھا کہنا رسول و آل رسول کی توہین۔

سیّد سلیمان ندوی اور میں

آخر کار سید سلیمان صاحب ندوی سے ضبط نہ ہوا اور انہوں نے بھی ستمبر ۳۲ء کے معارف میں پانچ سطریں اڈیٹر نگار کے ملحدانہ مضامین پر سپردِ خامہ کر ہی دیں۔

بصورت سر زلفے کہ از کمر گزرد

کیا میں سید صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ وہ مجھے ملحد کیوں کہتے ہیں اور میرے کون سے مضامین ہیں جن کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

وہ شخص جو خدا کو ایک قوت "فعال لما یرید" مانتا ہو۔ جو رسول اللہ کو بڑا مقدس نبی تسلیم کرتا ہو۔ جو ہمیشہ اعلان کرتا رہتا ہو کہ اسلام ہی دنیا کا تنہا ذریعہ امن و نجات ہے کیا اسے صرف اس لئے ملحد قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ فروع میں سید سلیمان یا کسی اور مولوی کا پیرو نہیں؟ وہ شخص جو توحید ربانی کا وحدت وجودی کی حد تک قائل ہے جو رسول کی سیرت کو پاکیزہ ترین نمونہ اخلاق و انسانیت قرار دیتا ہے اور جو اسلام کو مذہبیات کی دنیا میں "آخری لفظ" کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کیا اسے صرف اس بنا پر کافر و بیدین بنایا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے سمجھنے کی خود کوشش کرتا ہے اور مفسرین کی کورانہ تقلید نہیں کرتا۔

وہ شخص جو تمام کائنات کو مظہر قوت ربانی قرار دیتا ہے جو اسوۂ محمدی کو بہترین اسوہ

انسانیت سمجھتا ہے اور جو قرآن مجید کو بے مثل صحیفۂ رشد و ہدایت باور کرتا ہے کیا اُسے صرف اس دلیل پر کافر و مرتد کہہ سکتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کا زاویۂ نگاہ خود اس کا ہے اور دوسرے سے استعارہ نہیں کیا گیا۔ حیران ہوں کہ ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے! یہ کیا سمجھ رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ سچ ہے ؎

پیمانہ براں رند حرام ست کہ غالب
در بے خودی اندازۂ گفتار نہ داند

آپ کی سمجھ میں تو کبھی نہ آئے گا لیکن آئیے میں بتا دوں کہ مجھ میں آپ میں کیا اختلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ چونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر زمانہ ہر ملک اور ہر قوم کے لئے موزوں ہو سکتا ہے، اس لئے اس میں ہر زمانہ کا ساتھ دینے کی لچک پائی جاتی ہے اور اس کی تعلیم ہر شخص کے لئے قابل قبول ہے۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ نہیں اسلام کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں یعنی اسلام صرف اہل عرب کے لئے تھا اور اسی زمانہ کے لئے موزوں تھا جب اس کا ظہور ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام فطری مذہب ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم بتایا جائے تو ہر شخص اس کی صحت پر ایمان لا سکتا ہے، اس لئے میں پہلے اصول صداقت قائم کرتا ہوں اور پھر قرآن مجید کی تعلیمات پر روشنی ڈالتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں نہیں، اسلام صرف مسلمانوں کا مذہب ہے اور مسلمانوں ہی کے سامنے پیش ہونا چاہیئے اس لئے آپ پہلے اپنے مفروضات و مزعومات کے لحاظ سے قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت کرتے ہیں اور پھر لوگوں سے اس کو تسلیم کراتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اصول انسانیت پر اپنی تعلیم کی بنیاد قائم کی اور تمام عالم کو ایک مرکز "اخوت" پر جمع ہونے کی دعوت دی اس لئے میں فروع کی پابندی کو

دائرہ مذہب میں داخل نہیں سمجھتا اور تمام مذاہب کو سچا سمجھتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نے عصبیت و افتراق کی تعلیم دی ہے اور "جامعۂ انسانیت" کا قیام اس کا مقصود نہیں۔ اس لئے آپ دوسروں کو بُرا کہتے ہیں اور کافر و ملحد وغیرہ کہہ کر بیزاری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام ہے صرف تکمیل اخلاق کا۔ آپ کہتے ہیں نہیں اخلاق ہوں یا نہ ہوں صرف ارکان مذہب کی پابندی کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا سے محبت کرنا سیکھو اور آپ فرماتے ہیں اس سے ڈرو۔ میں کہتا ہوں کہ اخلاق نبوی کو انسانیت کا بہترین نمونہ سمجھ کر اس کا اتباع کرو اور آپ فرماتے ہیں کہ نہیں پہلے اس کے معجزات و محیر العقول باتوں کو باور کرو۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام روزہ و نماز کا نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں اسلام صرف اسی کا نام ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نام نہ لمبی داڑھی کا ہے نہ عبا و عمامہ کا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہی اسلام کی نشانیاں ہیں ——— میں کہتا ہوں ملائکہ نام ہے اُن قوائے کا منہ کا جن کو خدا نے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ نہیں ملائکہ ایک مخلوق ہے "حیز مکان و زمان" سے متعلق جو ہاتھ پاؤں رکھتی ہے اور جس کے بال و پر ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جنّت و دوزخ نام ہے انفرادی قومی و روحانی احساس عروج و زوال کا آپ کہتے ہیں کہ نہیں ان کا تعلق مادی لذائذ سے ہے۔ میوہ دار درختوں سے ہے شہد و لبن سے ہے۔ خوبصورت عورتوں اور حسین لڑکوں سے ہے۔ میں کہتا ہوں اچھا کام خود آپ اپنی جزا اور بُرا کام آپ اپنی سزا ہے۔ آپ فرماتے ہیں نہیں۔ اچھے کام کا عوض حور و قصور ہونا چاہیئے اور بُرے کام کی پاداش "نارجہنم و ماءِ حمیم" میں کہتا ہوں کہ خدا کی عظمت و بزرگی اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ وہ ہمارے افعال سے متاثر ہو کر جذبۂ تحسین و انتقام اپنے اندر پیدا کرے۔ آپ فرماتے ہیں نہیں وہ دنیاوی بادشاہوں

کی طرح خفا بھی ہوتا ہے اور خوش بھی، میں کہتا ہوں کہ جو خدا روزانہ بے شمار کرّے زمین سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑے بناتا بگاڑتا رہتا ہے اور جس کا یہ مشغلہ ازل سے ابد تک جاری رہنے والا ہے۔ وہ زمین ایسی حقیر کرّہ کی ذلیل مخلوق کو تباہ کرنے کے بعد کیوں دوبارہ زندہ کرنے لگا۔ اس کو کیا غرض ہے اس کا اس میں کیا فائدہ ہے، کیا مصلحت ہے آپ کہتے ہیں کہ نہیں خدا کی عظمت صرف اسی کرہ سے متعلق ہے اور اس کی خدائی کا مفہوم اسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے قبل بھی لوگوں نے کہا ہے اور وہ اسلام سے خارج نہیں سمجھے گئے۔ لیکن آج میں باوجودیکہ وحدانیت کا قائل ہوں۔ رسالت رسول کا ماننے والا ہوں۔ قرآن پاک کی بلند تعلیمات پر ایمان رکھنے والا ہوں۔ کافر قرار دیا جاتا ہوں۔ ملحد بتایا جاتا ہوں اور بے دینی کا سب بڑا علمبردار ہوں۔ کیوں؟

آیئے آج کی صحبت میں مختصراً اس راز کو بھی ظاہر کردوں، جن حضرات نے شروع سے نگار کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ میرا موضوع سخن ہمیشہ علماء سوء کا گروہ رہا ہے، اور میں نے اُن کے حرکات ناشائستہ، ان کے اخلاق ذمیمہ، ان کے افعال رکیکہ اور ان کے مشاغل سخیفہ کو بے نقاب کرکے لوگوں کو بتایا ہے کہ ان کا وجود اللہ کا عذاب ہے۔ اُن کی ہستی خدائی لعنت ہے، جس نے مسلمانوں کو گھیر رکھا ہے۔ ان کا مقصود زندگی صرف ریا و مکر سے دولت کمانا ہے اور ان کو مطلق پروا نہیں۔ اگر ان کی تعلیمات سے اسلام و صاحب اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے۔ یہ مذہب اسلام کے بے عقلیوں کا مجموعہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ موضوع احادیث کو سامنے رکھ کر لغو و مہمل روایات کو اسلام سے منسوب کرکے مذہب کو ذلیل کر رہے ہیں، یہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے انسانوں کی

عقلوں پر مہر لگا کر قرآن مجید پر غور و خوض کرنے کو حرام بتا رہے ہیں، یہ ذہنی و عقلی آزادیاں سلب کر کے مسلمانوں کو درجۂ انسانیت سے گرا کر حیوان بناتے جا رہے ہیں، یہ اس دورِ علم و روشنی میں ہمیں پھر جہل و تاریکی کی طرف لئے جا رہے ہیں، اور وہ سب کچھ کر رہے ہیں ——— جو ایک خود غرض نفس پرست انسان کر سکتا ہے۔ میں نے قرونِ اولیٰ کی تاریخ سے، عہدِ عباسیہ و امویہ کے واقعات سے حکومت ترکی و ایران کے حالات سے اور افغانستان کے انقلابِ حالیہ کی روداد سے لوگوں پر ظاہر کیا کہ اس جماعت نے جو اپنے کو علمبردار مذہب بتاتی ہے انسانیت پر کیا کیا مظالم روا رکھے ہیں اخلاق کا خون کس بے دردی سے بہایا ہے اور عروج و ترقی کے پامال کرنے میں ان کی دراز دستیوں نے کیا کیا کام کئے ہیں۔

پھر ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ ان کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا اور اس کا انتقام لینے کے لئے وہ حسبِ معمول سوا مذہب کے اور کس چیز کی آڑ لے سکتے تھے، پھر اگر مذہب اسلام حقیقتاً نام ہے انھیں عقائد و تعلیمات کا جو ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں انھیں اخلاق کا جو اُن میں پائے جاتے ہیں، اسی محبت و رواداری کا، جو ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی ہے اور اسی وسعتِ نظر و پرمائگی کا، جو اُن کے اقوال و افعال کی سرمایۂ ہدایت ہے تو میں نہایت صفائی سے ایک بار اور ہمیشہ کے لئے یہ اعلان کئے دیتا ہوں کہ:

مَیں مُسلمان نہیں ہُوں

لیکن اگر اسلام ضمیر و خیال کی آزادی کو نہیں چھینتا، اگر وہ فکر و رائے کی حرّیت کا دشمن نہیں ہے اگر وہ بغیر اطمینانِ نفس پیدا کئے ہوئے بجبر اپنی حقیقت کسی

سے تسلیم نہیں کرتا۔ اگر وہ مجموعۂ مزخرفات و خرافیات نہیں ہے، اور اگر وہ ہر شخص کے لئے ہر زمانہ میں دستگیر و رہنما بن سکتا ہے تو اے مسلمانو! میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ان مولویوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مجھے اسلام سے خارج کریں ——— ایک توحید خداوندی کے اقرار کرنے والے کو کافر کے لقب سے یاد کریں، جس طرح وہ مجھے ملحد و بیدین کہتے ہیں۔ میں بھی انھیں کہہ سکتا ہوں اور ان کے نقطۂ نظر سے اگر میں غلطی پر ہوں تو میرے نقطۂ نظر سے وہ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں، مجھے بھی انھیں کی طرح اپنے آپ کو مسلمان کہنے اور سمجھنے کا حق حاصل ہے۔ میں بھی اسلام و تعلیمات اسلام پر غور کر سکتا ہوں، خدا نے مجھے بھی عقل عطا کی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ مجھے کافر و ملحد کہتے ہیں ———
وہ خود تعلیمات اسلامی سے منحرف ہیں، رسول کی توہین کرتے ہیں، مذہب کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں اور خدا اُن سے بیزار ہے،

میں سچ کہتا ہوں کہ مولویوں کی جنگ مجھ سے نہ مذہب سے کوئی تعلق رکھتی ہے نہ دین کی ہمدردی سے، بلکہ یہ حربہ اُن کا صرف اس لئے ہے کہ میں اُن کے خلاف کیوں لکھتا ہوں۔ ان کی حقیقتوں کو کیوں بے نقاب کرتا ہوں۔ سو انھیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اب اُن کے قصر عظمت و پندار کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ان کی مذہبیت و اخلاق کے چہرے سے پردہ اٹھ چکا ہے اور دنیا اُن سے متنفر ہو کر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ افسوس ہے کہ آج پاکستان میں حکومت اسلامی نہیں، ورنہ پاکستان اُن کے عذاب سے کب کا نجات پا چکا ہوتا۔ آج ترکی حکومت کی ترقی کی بنیاد صرف اسی جماعت کے انہدام پر قائم ہے اور ایران کی بیداری کا آغاز اسی گروہ کی بے دست و پا کر دینے سے ہوتا ہے، جب کوئی زبردست قوت ان کے مقابلہ میں آتی ہے تو یہ حکومت ———

کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ قانون کب تک اس قسم کے تحریروں کو موقع دیتا رہے گا۔ حالانکہ اس نوع کا احتجاج اُن کے ضعف کی دلیل ہے۔ ان کی عقلی بے مائگی کا ثبوت ہے اور ایک ایسا اظہارِ عجز ہے جس سے ہر خوددار انسان کو شرم آنی چاہیئے۔ اگر ان کے سامنے مفروضہ عقائد کے خلاف کوئی صدا اٹھتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ عقلی دلائل سے اس کا جواب دیں نہ یہ کہ حکومت کے سامنے دامن پھیلا کر کھڑے ہو جائیں، علاوہ اس کے مجھے حیرت ہے کہ اگر میں واقعی ملحد ہوں تو ان کو کیوں تکلیف پہونچ رہی ہے؟ کیا اس سے پہلے کوئی ملحد پیدا نہیں ہوا۔ کیا اس وقت دنیا میں میرے سوا کوئی کافر و ملحد نہیں پایا جاتا۔ پھر ایک میرے ہی خلاف یہ جہاد کیوں ہے۔ میرے ہی اوپر کیوں اس قدر عنایت صرف کی جاتی ہے۔ خدا کی خدائی میں لاکھوں غیر مسلم بے دین پائے جاتے ہیں آپ کہاں تک سر پیٹیں گے، کب تک غم کریں گے اور آپ کی اس واویلا کو سنتا کون ہے۔ میں اگر اکابر مذہب کو گالیاں دوں، کسی کی توہین کروں تو بے شک شکایت کا موقع ہے لیکن جب یہ کوئی بات نہیں ہے تو پھر برہمی کے کیا معنی آپ جب مجھے کافر بنا چکے، ملحد قرار دے چکے تو پھر کیوں میری پرواکرتے ہیں سمجھ لیجئے کہ جہاں اور بہت سے کافروں کو دوزخ کا ایندھن بننا ہے وہیں مجھے بھی بننا ہے لیکن اگر ان کا مقصود واقعی مجھے راہِ راست پر لانا اور اپنا تبلیغی فرض ادا کرنا ہے تو میں سید سلیمان ندوی اور ان تمام علماء کرام کو جو اُن کے ہم آہنگ ہیں چیلنج دیتا ہوں کہ وہ کسی مجمع میں جو بالکل غیر جانب دار لوگوں پر مشتمل ہو، اپنے اسلام کو پیش کریں، پھر مجھے موقع دیں کہ میں نے جو کچھ اسلام کو سمجھا ہے اُسے بیان کروں اور اس کے بعد اس مجمع سے فیصلہ چاہیں کہ وہ کس کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی جانے دیجئے خود مجھے موقع دیں

کہ میں اُن سے اسلام کی حقیقت کو سمجھوں اور اگر وہ مجھے سمجھا سکے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں بغیر ایک لمحہ کا پس و پیش کئے ہوئے سرِ عجز جھکا دوں گا اور انھیں جیسا مسلمان ہونے کا اقرار کروں گا ورنہ یوں تیغ و تفنگ، یا حکومت کی امداد سے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا یا کسی کی آزادیٔ خیال کو چھیننا، اسلام کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی، چنگیز و ہلاکو اس سے قبل ایسا کر چکے ہیں لیکن دنیا نے انھیں جیسا سمجھا وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی؛

◯

ایک تلخ حقیقت

اگر آج ہماری قوم سے جوتے سینے والے فنا ہو جائیں تو ہم کو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی طرح اگر پارچہ باف، رنگریز، سونار، لوہار، بڑھئی، معمار وغیرہ معدوم ہو جائیں تو ہماری ضروریاتِ زندگی کو کتنا صدمہ پہنچے اور ان کو جانے دیجئے صرف شاعروں کو لے لیجئے کہ ان سے زیادہ بیکار جماعت بظاہر کوئی نظر نہیں آتی لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوں تو ہماری بہت سی لطیف صحبتیں ختم ہو جائیں —— مگر ——

خدا کے لئے کوئی بتلائے کہ اگر آج روئے زمین سے اس جماعت کو فنا کر دیا جائے جو ہمارے مذہب و اخلاق کی ضامن بنی ہوئی ہے تو اس سے ملک و قوم کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ہر چیز کی اہمیت کا اندازہ اس خدمت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے جو اس سے دنیا میں متعلق ہوتی ہے، پھر اگر وہ خدمت زیادہ اہم ہے تو اس چیز کا وجود بھی اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ چنداں اہم نہیں ہے تو اس کے وجود کی بھی زیادہ پروا نہیں ہوتی یہاں تک کہ اگر کوئی چیز بالکل بے کار ہے تو اسے مٹ جانا چاہیئے۔

اچھا اب غور کیجئے کہ اس جماعت سے کیا خدمت متعلق ہے یا اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک وہ جس کا تعلق مادیات سے ہے اور دوسرا وہ جو اخلاقیات سے متعلق ہو۔ پھر یہ تو ظاہر ہے کہ مادی زندگی کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ نہایت فخر و ناز کے ساتھ دنیا و کاروبار دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا کرتے ہیں رہی اخلاقی زندگی سو آج تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں اور دنیا کا وہ کون سا اخلاق ہے جو انسان کو دنیا سے بیزاری کا درس دے سکتا ہے؟

اسلام کی گزشتہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء اور شاہان اسلام مادیت و روحانیت یعنی دنیا و دین دونوں کا مرکز سمجھے جاتے تھے اور اسی لئے اسلام میں قدرتاً وہ اصول زندگی پیدا ہو گئے جو مذہب کا کاروبار دنیا اور ہنگامۂ حیات کے دوش بدوش لے چلنے کے ضامن تھے، اور یہی سبب تھا کہ اسلام کے عہد وسطیٰ میں جو یقیناً اس کا زرّیں دور تھا ایک شخص کے لئے یہ متعین کرنا دشوار تھا کہ مسلمانوں کے اصول زندگی میں کس طرح خطِ فاصل کھینچ کر اُن کے دین کو دنیا سے ممیز کیا جا سکتا ہے کیونکہ اُن کا بیٹھنا اُٹھنا، کھانا پینا، جاگنا سونا۔ الغرض اُن کا ہر دنیاوی عمل مذہب ہی کے لئے تھا جس طرح اُن کے تمام مذہبی اعمال دنیاوی ترقی کے رُخ رواں تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے حکمراں جماعت اور علماء دین کے گروہ کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر رکھا تھا اور اگر اتفاق سے کوئی قاضی یا مفتی، مولوی یا عالم حکومت کے مصالح کے خلاف کوئی فتویٰ دینے کی جرأت کرتا تھا تو اُسے قید و بند میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص اسے حکومت کی زیادتی یا سلطنت کا ظلم قرار دے لیکن جہاں تک اصول سیاست کا تعلق ہے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی

بہر حال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کے عہد ترقی میں یہ جماعت کبھی آزاد و خود سر نہیں رکھی گئی اور ہمیشہ اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت کے مصالح، اور سیاست کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے احکام فقہی میں تبدیلی پیدا کرتے رہیں۔ پھر یہ تو یقیناً ہوا کہ جس چیز کو سلطنت کی مصلحت بتایا گیا وہ بارہا مستبدانہ خود غرضی ثابت ہوئی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی عالم دین نے اس خود غرضی کا احساس کر کے صدائے احتجاج بلند کی ہو اور اس کی زبان کو حرکت کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔

پھر غور کیجئے کہ اگر مسلمانوں کی حکومت بدستور قائم رہتی اور اگر بجائے عیسائی حکومتوں کے آج انھیں کی حکومت روئے زمین پر غالب ہوتی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت جو حالت ہمارے یہاں کے علماء دین کی نظر آتی ہے اس وقت بھی پائی جاسکتی تھی، قیامت تک ممکن نہ تھا کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے سے احتراز کرتے اور اُن کو زندہ و سلامت رہنے دیا جاتا کیونکہ ایک پاپائے روم کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی کلیسہ کی دنیا علیحدہ قائم کر کے کاروبار عالم سے کوئی واسطہ نہ رکھے لیکن ایک مسلمان کے دل و دماغ سے کبھی یہ بات نہیں نکل سکتی تھی کہ اُس کا مذہب اُس کی دنیا سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور نہ کبھی یہ بات اس کی عقل میں آسکتی ہے کہ مذہب اسلام کے علاوہ ایک چیز قومیت و وطنیت اور بھی ہے جو غیر مذہب والوں کو بھی اپنے میں شامل کر کے خالص دنیاوی تمدنی ترقی کے لئے زبردست مرکزیت پیدا کرسکتی ہے۔

الغرض حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ وہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اپنے احکام و قوانین میں بھی تبدیلی پیدا کرے ورنہ اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے چنانچہ آج ترکی و ایران کے حالات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ وہاں مذہب کی کیا حالت ہے اور علماء مذہب کس بے چارگی و بے بسی کے عالم میں

زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ھندوستان میں جہاں نہ مسلمانوں کی حکومت ہے نہ اکثریت نہ جہاں علم ہے نہ واقفیت، مولوی جو چاہے کہے جو بدعت جی میں آئے کرتا پھرے، لیکن ترکی و ایران میں تو جا کر کہہ دے کہ بنک میں روپیہ جمع کرنا حرام ہے۔

اب اتنا پڑھنے کے بعد آپ پھر ابتدائی سطور پر غور کیجئے اور ٹھنڈے دل سے فیصلہ فرمایئے کہ اس جماعت سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے یا اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے، حکومت تو ہماری ہے نہیں کہ یہ حضرات اس کا ساتھ دے کر عوام پر سلطنت کا اقتدار کر قوی بنائیں اور اس کے عوض میں گراں قدر معاوضے حاصل کرتے رہیں اور چونکہ یہ خون ان کے منہ لگ گیا ہے اس لئے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ خود اپنی ہی ذات کو دنیا و دین کا مرکز قرار دیکر عوام کو اپنی طرف بلائیں اور اس غرض کے لئے وہ سب کچھ جائز و ناجائز روا رکھیں جو ان کے اسلاف نے شاہان اسلام کے لئے روا رکھی تھیں، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک مولوی کے تمام تعلیمات و نصائح مذہبی کا موضوع صرف مابعد الطبیعاتی دنیا ہوتی ہے اور وہیں کے خوفناک تاریک مناظر سے ڈرا ڈرا کر وہ اپنی پرستش کرایا کرتا ہے۔ اس کو مطلق اس سے بحث نہیں کہ دنیا کہاں جا رہی ہے، زمانہ کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، جہل و تاریکی کس تیزی سے علم کی روشنی میں پیچھے ہٹ رہی ہے۔ وہ برابر یہی کہے جائے گا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسی کو برحق جانو، وہ اس سے بالکل نا آشنا ہے کہ اس وقت کے اقتصادی مسائل ہم سے کیا چاہتے ہیں، وہ غریب اس سے مطلق آگاہ نہیں کہ ھندوستان کی سیاسیات کا مستقبل کیا ہے مخلوط و غیر مخلوط انتخاب کیا بلا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اس جہل پر فخر بھی کرتا ہے اس نادانی پر نازاں بھی ہے اور کہتا ہے کہ اہل جنت تو ایسے ہی سیدھے سادے بھولے بھالے لوگ ہوتے ہیں ذرا آنکھ کھولئے کہ یہ جنت کی مخلوق جو ان معاملات میں اپنے آپ کو اس قدر نیک و بے خبر

ظاہر کرنے پر فخر کرتی ہے، کتنی ہوشیار و باخبر ہے غریبوں کا روپیہ چھیننے میں اور حبابیوں کا گھر اجاڑ اجاڑ کر اپنا گھر بسانے میں جس وقت یہ کسی مجمع میں وعظ فرماتے ہوتے ہیں تو انکی صورت و حالت یونان کے اس جیو پیٹر دیوتا کی سی ہوتی ہے جس کے ایک ہاتھ میں دوزخ کی انگارے ہیں اور دوسرے میں جنت کی گل فشانیاں اور وہ اپنے آپ کو بالکل مالک و مختار سمجھتے ہیں، خواہ چشم زدن میں جلا کر خاکستر کر دیں۔ خواہ بیک جنبش چشم و ابرو، ہر کشتہ کو گل و گلزار بنا دیں ان لوگوں کی اوّلین کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دنیا و کسب دنیا کے خیال سے منحرف کر دیں اور اس کے لئے وہ غلط توجیہ و تاویل کے ساتھ کلام مجید کی آیتیں بھی پڑھتے ہیں۔ احادیث نبوی سے بھی استناد کرتے ہیں۔ اقوال ائمہ کبار بھی سُناتے ہیں۔ اور مثنوی مولانا روم کے اشعار بھی خاص لحن کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس تعلیم کا مقصود حقیقی سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب لوگ دولت کو حقیر سمجھنے لگیں گے تو نہایت آسانی سے ان کے حوالے کر دیں گے اسی کے ساتھ وہ دوسری نفسیاتی فریب یہ کرتے ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور عہد سلف کے اولیاء کرام کے واقعات سنا کر ان کے خوارق عادات اور کرامات کی داستانیں سنانے لگتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح سیکڑوں سال کی غرق شدہ بارات کو دریا سے زندہ نکال لیا۔ ایک شخص پر نگاہ ڈالتے ہی کیونکر اس کے دل کا تمام حال بتا دیا۔ کسی کے بھاگے ہوئے غلام کو کس طرح ایک تعویذ لکھ کر واپس بلا دیا اور پھر آخر میں وہ سلسلۂ وعظ کی تان "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" پر توڑتا ہے اور احمق و جاہل مسلمانوں پر اپنی عظمت و بزرگی، اپنی غیر معمولی قوت روحانی اور اپنے محیر العقول کارناموں کا سکہ بٹھا کر آخر کار ان کی جیبیں خالی کرا لیتا ہے،

تمام دنیا کی قومیں اس اصول پر ترقی کر رہی ہیں کہ عقول انسانی کی تربیت کے لئے تمام موانع کو دور کر دینا چاہیئے لیکن یہ فرماتے ہیں کہ نہیں عقلی ترقی روحانی انحطاط ہے اور اب دنیا میں

کوئی شخص سوچنے سمجھنے کا مجاز نہیں، جو ہونا تھا ہو چکا، جو کچھ سمجھ میں آسکتا تھا آگیا اور وہ اسی علم و یقین یا ضلالت و گمراہی کو سامنے رکھ کر اپنا دائرۂ عمل قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تصنیف و تالیف، تبلیغ و اصلاح، پند و ہدایات سب اسی اصول کے تحت ہوتی ہے اور اس دائرہ سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنا گوارا نہیں کرتے۔

ایک قوم کے اندر انقلاب کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں، ایک یہ کہ اس قوم کے اندر حسنِ اتفاق سے بعض افرادِ صالح ایسے پیدا ہو جائیں جو قومی جمود کو دور کر دیں یا پھر افرادِ قوم کے اندر کسی خارجی اثر سے ذہنی اضطراب پیدا ہو جائے، امرِ اوّل کی تو بظاہر کوئی امید ہندوستان میں نظر نہیں آتی، لیکن دوسری صورت کے آثار ضرور رونما ہو چکے ہیں اور ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جو علماءِ دین کی تعلیمات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگی ہے لیکن چونکہ یہاں انسان کی ذہنی و عقلی آزادی کو گہوارہ ہی سے چھیننا شروع کر دیا جاتا ہے اور خدا جانے کتنے زمانہ سے نسلاً بعد نسلٍ اس پر عمل ہوتا چلا آ رہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ عادت چھٹتے ہی چھٹتے چھٹے گی، اور ہندوستان کا مسلمان مستقبل قریب میں کوئی امید اپنے لئے قائم نہیں کر سکتا علی الخصوص اس وقت جبکہ ملک کی ایک بڑی قوم ترقی اور ارتقاء کی منزل میں تیزی سے گامزن نظر آ رہی ہو اور وہ اس سے تقریباً بے نیاز ہو گئی ہو کہ کون ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور کون نہیں۔ الغرض ہندوستان کا مسلمان اس وقت جن راہوں سے گزر رہا ہے وہ اس قدر دشوار گزار ہیں کہ اگر کوئی فوری انقلاب نہایت ہی شدید قسم کا ان میں رونما نہ ہو تو ان کے نجات کی کوئی صورت نہیں اور ان کا بالکل وہی حشر ہوگا جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا ہوا کہ چند منہدم آثار تو ان کے باقی رہ جائیں گے لیکن وہ خود کہیں کچھ نہ ہوں گے۔ ہندوستان کا مولوی یا عالمِ دین جو بدقسمتی سے ہمارا قائد و رہنما اور ہمارا مصلح بنا ہوا ہے، دوزخ و جنت کی روایات بیان کرنے میں

رات دن لوگوں سے نمازیں پڑھوانے کی فکر میں تو بے شک منہمک نظر آتا ہے لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتا کہ جس قوم سے وہ اپنے لئے لذائذ دنیوی حاصل کر رہا ہے اس کی اقتصادی حالت کیا ہے اور اس کا افلاس کس حد تک پہنچ چکا ہے۔

میں کہتا ہوں، بہ آواز بلند کہتا ہوں اور بلا خوف تردید کہتا ہوں کہ یہ وقت اس بات کے دیکھنے کا نہیں ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہے یا نہیں، روزے رکھتا ہے یا نہیں، وہ ذبح جٹ کا قائل ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ سوچنے کا ہے کہ مسلمان کے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں اگر علماء دین ہمارے حقیقی بہی خواہ ہوتے اور اُن کے دلوں میں ہمارا سچا درد ہوتا تو اس وقت تمام مواعظ مذہبی کو چھوڑ کر صرف اس پر غور کرتے کہ مسلمان اپنا پیٹ کس طرح بھریں، ان کے بچے بھوک کی تکلیف سے کیونکر محفوظ رہیں اور ان کی عورتیں کس تدبیر سے اسباب ستر پوشی حاصل کر سکیں۔ آپ ایک مسلمان کو موٹر پر سوار، نفیس لباس پہنے ہوئے دیکھ کر اس کی خوشحالی و مسرت کا اندازہ نہ کیجئے بلکہ اس کے گھر میں جا کر دیکھئے کہ کیا حالت ہے اور اس کے دل میں سما کر معلوم کیجئے کہ وہ کس تکلیف و عذاب میں مبتلا ہے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہمارے اُن قائد و رہنما کو ہمارے اس دینی و دنیوی رہبر کو کبھی اس کا خیال ہوا ہے کہ جس وقت وہ اپنے وسیع دسترخوان پر نفیس نفیس غذائیں کھانے میں مصروف رہتا ہے ٹھیک اسی وقت اس کے پڑوس میں کتنے مسلمان ایسے ہیں جو بھوک کے بیمار پڑے ہوئے ہیں اور کتنے بچے ایسے ہیں جن کی مائیں اپنی خشک چھاتیوں سے ایک قطرہ دودھ کا اُن کے منہ میں نہیں ٹپکا سکتیں جس وقت وہ حریر و کمخواب، یا لکھنؤ کی باریک چکن اور ولایتی تنزیب کی اچکن پہن کر، ایک ادائے معشوقانہ کے ساتھ موٹر پر سوار ہونے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس قوم کے کتنے افراد اس وقت جھلسا دینے والی دھوپ میں

ننگے بدن، برہنہ پا پتھر توڑ رہے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ دنیا میں کوئی بے غیرتی بے حیائی اور بے شرمی ہو سکتی ہے کہ جو افراد فاقہ کر کر کے، اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے یہ نعائم و لذائذ فراہم کریں انھیں کے دُکھ درد کی طرف سے وہ یوں بے خبر و بے پروا ہے، ہر چند فرعون و نمرود کو گذرے ہوئے زمانہ گزر گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور اسی اخلاق سوز و انسانیت شکن خصوصیات کے ساتھ باقی ہے جو کسی وقت ان کے اسلاف میں پائی جاتی تھیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ اُن پر عذاب نازل ہو چکا اور ان کے لئے ہنوز دستِ خدا میں انتظار کر رہا ہے۔

لکھنوی علماء کے کسی مجمع میں ایک بار میں نے دریافت کیا کہ "فرمائیے اب کیا ارادہ ہے اور قومی فلاح و بہبود کے لئے کون سی مقامی تحریک آپ کے پیش نظر ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا "ہاں عرصے ہمارا خیال ہے کہ یہاں کے مسلم کلب کی حالت درست کی جائے اور انسائیکلو پیڈیا کے قسم کی ——— ایک کتاب اُردو میں لکھی جائے" یہ سنتے ہی میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا "قبلہ اپنے جھوپڑے کو محل بنانے سے پہلے کیوں آپ اس کی آرائش و زینت کی فکر میں مبتلا ہیں۔ تمدن کی ترقی، جاہ و ثروت کے تنعم کے ساتھ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہے گا۔ نہ جانے کتنے کلب قائم ہو جائیں گے، کتنی انسائیکلو پیڈیاں بن جائیں گی۔ اس وقت تو سوال ترجیحات کا ہے۔ بقاء زندگی کا ہے، تن پوشی اور دفع گرسنگی کا ہے۔ اس لئے طریقۂ زکوٰۃ کو منظم کیجئے۔ قومی بیت المال کی طرح ڈالئے۔ گھر گھر جا کر دیکھئے کہ کون کس حال میں مبتلا ہے اور سب سے پہلے اس زخم کا علاج کیجئے جس نے ساری قوم کو مفلوج بنا رکھا ہے۔" یہ سن کر فرمانے لگے کہ "ہاں یہ تحریک بھی ضروری ہے اور انشاء اللہ الرحمٰن اس پر غور کریں گے" لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ

جب مولوی کسی بات کو انشاء اللہ سے شروع کرتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوا کرتا ہے'

یہ ہے حال ان تمام اداروں کا جنہیں ہم مدرسہ خانقاہ کہتے ہیں اور جہاں سے یہ زہریلے افعی نکل نکل کر ہندوستان کی مسلمان آبادی کو ڈس رہے ہیں ان کے علاوہ بعض ادارے ایسے ہیں جو صرف تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہیں۔ اور جن کے مدیرون کو فخر ہے کہ وہ دنیا میں بڑا کام کر رہے ہیں مسلمانوں کی عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن چونکہ ان کی ذہنیتیں بھی اسی مسموم ماحول کی پیداوار ہیں اس لئے ان کی جملہ تصانیف غیر ضروری اور غیر اہم بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں یہ بڑی بڑی کتابیں تاریخ و جغرافیہ کی لکھ رہے ہیں لیکن ان کی حقیقت داستان پارینہ دہرا لینے سے زیادہ کچھ نہیں، یہ فلسفہ و مذہب پر موٹی موٹی تالیفات پیش کر رہے ہیں لیکن بالکل اسی اندھے کی طرح جس کا سہارا ایک لکڑی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اوّل تو ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ وقت اس قسم کی تصنیف و تالیف میں ضائع کرنے کا نہیں بلکہ دوڑ کر اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے اور ڈوبتے ہوؤں کو باہر نکالنے کا ہے، اور اگر یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے تو پھر کم از کم ایسے لٹریچر پیش کرنے کا ہے جو دوسروں میں یہ ولولہ پیدا کرے، جس وقت کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو علوم و فنون کا ذخیرہ وہ خود اپنے ساتھ لے آتی ہے اور ہر جگہ علمی ادارے قائم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جب انحطاط ہوتا ہے تو یہ ادارے خود بخود ضعیف ہونے لگتے ہیں اور ان کو کوئی قوت سنبھال نہیں سکتی۔ اس لئے جس رنگ کی تصانیف ہمارے یہاں کے بڑے مصنفین پیش کر رہے ہیں وہ قیمت کے لحاظ سے بالکل لغو و بے کار ہیں اور ان سے ملک و قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے کیونکہ ان کا موضوع اور ان کے اصول ترتیب وہی آزادی عقل و

ضمیر کے چھیننے والے اور اندھی تقلید کو مضبوط کرنے والے ہیں جس نے مسلمانوں کو نکبت و ذلت کی اس منزل تک پہونچا دیا ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اپنی بقا و تحفظ کے لئے کیا تدابیر عمل میں لانا چاہیئے،

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت کرۂ زمین پر مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۴۰ کروڑ ہے اور اسی کے ساتھ غالباً یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ یہ آبادی کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ آپ نقشہ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف یہ سلسلہ مغربی افریقہ کے ساحل اٹلانٹک سے شروع ہو کر بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا مصر اور مغربی ایشیا تک پہونچتا ہے اور پھر ساحل بحر قلزم اور بحر اسود سے ہوتا ہوا سائبریا اور منگولیا تک پہونچ جاتا ہے، دوسری طرف مشرقی ساحل افریقہ سے شروع ہو کر مڈاسکر کے عرض البلد پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک سلسلہ وہ ہے جو افغانستان کے کوہستان کو عبور کر کے ہندوستان تک پہونچتا ہے اور یہاں سے جزیرہ نمائے ملایا ہوتا ہوا مشرقی مجمع الجزائر تک پہونچ جاتا ہے۔

اچھا اب اسی کے ساتھ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی یہ تدریجی ترقی نہ تھی بلکہ ایک سیلاب کی سی ترقی تھی جو وقتاً فوقتاً ابھرتا رہا اور چند صدیوں میں کرۂ ارض کے اتنے وسیع حصہ پر محیط ہو گیا سنہ ۶۳۰ء اور سنہ ۷۵۰ء کے درمیان ہسپانیہ و مراکش سے لے کر وسط ایشیا تک پھیل گیا اور تقریباً ڈھائی صدی تک اسی جگہ محدود رہا۔ اس کے تقریباً ڈھائی صدی بعد سنہ ۱۰۰۰ء اور سنہ ۱۱۰۰ء کے درمیان اس کی وسعت مغربی افریقہ سے لیکر ایشیا کوچک، وسط ایشیا اور شمالی ہند تک پہونچ گئی۔ پھر دو صدی گزرنے کے بعد ایک اور لہر

اٹھی جس نے ۱۳۰۰ء اور ۱۷۰۰ء کے درمیان جزیرہ نمائے بلقان سے لے کر سائبیریا، ہندوستان اور مجمع الجزائر تک تمام حصہ کو اپنے اثر میں لے لیا اور اس طرح جو نقشہ مسلم آبادی کا ۱۷۰۰ء میں قائم ہو گیا تھا تقریباً وہی اب بھی نظر آتا ہے۔

اس وقت میں اس امر سے بحث نہیں کروں گا کہ اس کی ترقی کے کیا اسباب تھے، یعنی کوئی خاص اخلاقی خوبی اسلام میں ایسی تھی جس کا اثر دنیا پر پڑا یا یہ کہ صرف اس کی عسکریت کو اس کا امتیاز دینا چاہیئے بہرحال حقیقت یہ ہو یا وہ ہمیں اس سے بحث نہیں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام جہاں جہاں گیا کن خصوصیات کے ساتھ گیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا لیکن اس پر غور کرنے سے قبل بطور اصول موضوعہ ہم کو یہ متعین کر لینا چاہیئے کہ اسلام سے ہماری مراد اس مضمون میں کیا ہے۔

میں اس سے قبل بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ دین و مذہب بالکل علیحدہ چیزیں ہیں۔ یعنی دین نام ہے اس اعتقاد کا جو متعلق ہے ہماری عبادات سے، ہماری مابعد الطبیعات اور اس سکون نفس سے جو کسی مخصوص عقیدہ کی بنا پر انفرادی طور پر ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ سوسائٹی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن مذہب نام ہے اس تہذیب و تمدن کا جو کسی دین کے تحت دنیا میں قائم ہو جاتا ہے۔ اور جس کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعی سے ہوتا ہے اس کا میں وہی مفہوم قرار دیتا ہوں جو انگریزی لفظ (CULTURE) کا ہے پس میری مراد بھی مضمون زیر بحث میں مذہب سے ہے نہ کہ دین سے یعنی میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اسلام بہ لحاظ اعتقاد مذہبی نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک خاص مذہب (CULTURE) ہونے کے کیا خصوصیات اپنے ساتھ ہر جگہ لے گیا۔

اب اس سلسلے میں آپ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا اس وقت اس کا ماحول کیا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ اسلام پیدا ہوا ایشیا ہی کے ایک گوشہ سے

لیکن اثر اس نے قبول کیا یورپ کی اس تہذیب کا جس کے لئے صحیح لفظ میرے خیال میں صرف یونانیات نہ ہے مگر اس سے مراد ملک یونان کی تہذیب نہیں بلکہ وہ تمام مغربی تہذیب مقصود ہے جو حقیقتاً مجموعہ تھی، روما و یونان دونوں کی تہذیب کا، اور جس سے نہ صرف سارا یورپ بلکہ جزیرہ نمائے عرب بھی عرصہ تک متاثر رہنے کے بعد اپنے دورِ انحطاط میں اسی کے زیر اثر نظر آتا تھا، چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ولادت نبوی و بعثت کے وقت سرزمین حجاز میں بھی یہود و نصاریٰ ہی کا اثر قائم تھا۔ اہل عرب باوجود اس کے کہ ان کی بُت پرستی شدید قسم کی بُت پرستی تھی، نصاریٰ و یہود کے علماء کا خاص احترام کرتے تھے۔ اور ان کے علم و فضل اور روحانیت کے قائل تھے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ اہل عرب میں بُت پرستی کا خیال خود یونان و روما سے آیا تھا۔ لیکن اس کی بڑی وجہ سلطنت روما کے اقتدار و وسعت، ہیئت و جبروت کی وہ روایات قدیمہ تھیں جو عرب میں ایک ایک بچہ کے ذہن نشین ہو چکی تھیں اور قدرتاً ہونا چاہئے تھیں جبکہ اس وقت بھی قسطنطنین اعظم کا مسیحی جھنڈا آبنائے باسفورس پر لہراتا ہوا ہر شخص کو نظر آتا تھا۔

ہر چند اسلام نے اپنی فتوحات کا اولین ہدف یونان و روما ہی کی حکومت کو قرار دیا لیکن بجائے اس کے کہ یونانیات کا اثر زائل ہوتا مسلمانوں پر اور زیادہ رنگ اس کا چڑھ گیا یعنی گو ظاہری حکومت تو اہل یورپ سے فرور چھن گئی لیکن اس کی تمدنی حکومت عربوں پر اور زیادہ قائم ہو گئی چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں نے نہ صرف علوم و فنون میں یونانی لٹریچر کا اثر قبول کیا بلکہ تدوین شرع و فقہ میں بھی ارسطو کی تصانیف سے مدد لی گئی حتیٰ کہ بعض مفسرین نے تو اسکندر اعظم کو پیغمبر تک قرار دے دیا۔ ایک ہی تہذیب کی مختلف قوموں کا ایک دوسرے سے برسر پیکار ہونا کوئی نئی بات نہیں ہو

ہمیشہ ہوا ہے اور ہوگا خود مسلمانوں میں باہم جس قدر جنگ خوں ریزی ہوئی ہے کسی سے مخفی نہیں، الغرض مسلمانوں کا روم و یونان کے مقبوضات کو تصرف میں لے آنا اگر ایک طرف اسلام کی فتح تھی تو دوسری طرف یونانیات کی بھی کامیابی تھی جس سے اسلام برابر متاثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اگر ایرانی تہذیب جو جزیرہ نمائے عرب میں کہیں کہیں اکاسرۂ عجم کے سطوت و اقتدار کو قائم کئے ہوئے تھی اس وقت نہ پائی جاتی جس سے اہل عرب ایک حد تک متاثر ہو چکے تھے، تو آج مسلمانوں کی تہذیب یکسر مغربی تہذیب ہوتی اور اس میں ادنیٰ شائبہ بھی مشرقیت کا نہ پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ ترقی میں علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی لیکن اس کی بنیاد بھی وہی یونانیات تھی جس نے کسی وقت اسلام کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور آخرکار ان کے تمام شعبہ ہائے حیات کو اس قدر سختی کے ساتھ جکڑ لیا کہ آج ہندوستان میں بھی جہاں مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں، وہی مغربی خصوصیت ان کی قائم ہے اور جس نے ان کے مستقبل کو مشرق میں صد درجہ تاریک بنا رکھا ہے۔

آپ اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان جہاں گئے اپنی تہذیب اپنے ساتھ لے گئے اور کسی مفتوحہ ملک کے تمدن سے متاثر نہیں ہوئے جو بالکل مغربی ذہنیت ہے۔ ہندوستان میں ایک غضب اور یہ ہوا کہ دورِ مغلیہ ختم ہونے کے بعد انگریزوں کی حکومت شروع ہوگئی جو ایک مغربی قوم تھی اور اپنی تمام مغربی خصوصیات اپنے ساتھ لائی تھی، اس لئے جس وقت جذبات عناد و انتقام مسلمانوں کے سرد پڑ گئے تو پھر وہی ان کی تقلید میں پیش پیش نظر آنے لگے اور اپنے اوپر افرنجیت طاری کرنے میں نمایاں سبقت کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس وقت بھی جبکہ ہندوستان میں ایک سخت سیاسی انقلاب کے آثار پیدا

ہو گئے ہیں۔ بہت کم مسلمان ایسے ہیں جو ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہو کر حقیقی معنی میں خدمت وطن پر آمادہ نظر آتے ہوں۔ ورنہ اکثر حقیقتاً انہیں افراد کا ہے جو انگریزوں کی طرف مائل ہیں اور ان کو ہندوؤں پر ترجیح دیتے ہیں۔

آپ کسی مسلمان سے جس نے کچھ بھی مذہبی تعلیم حاصل کی ہے دریافت کیجئے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں میں کس کو بہتر سمجھتا ہے تو وہ فوراً انگریزوں کا نام لے دے گا اور یہ دلیل بیان کرے گا کہ وہ صاحب کتاب ہیں اور یہ کافر ان کی لڑکیوں سے ہم شادی کر سکتے ہیں اور ——— کلام پاک ان کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کی ہدایت کرتا ہے اور مشرکین و کفار سے نہیں۔ الغرض وہ بہت سے اسباب و دلائل نصاریٰ کی ترجیح میں پیش کرے گا پھر چونکہ مسلمانوں کی یہ ذہنیت بہت قدیم ہے اور صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کا ترک ہونا تقریباً محال ہے اس لئے اگر اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی قومی و ملکی تحریکوں میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا تو یہ ان کی فطرت تھی۔ ان کی مذہبی ذہنیت کا تقاضا تھا جس میں وہ بڑی حد تک مجبور تھے اور ہیں۔

میں نے جہاں تک مسلمانوں سے اس باب میں تبادلۂ خیال کیا ہے اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنی تہذیب یا اپنے (CULTURE) کو بدلنے کے لئے تیار نہیں اور ان کو یقین ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کی سطح پر نہ آیا جائے اور ان کی سطح پر آنا اپنی قدیم تہذیب کی روایات کو صدمہ پہونچانا ہے۔

اس لئے اب سب سے پہلا اصولی سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان کے مسلمان اپنی قدیم روایات تہذیب کو صدمہ پہونچائے بغیر کوئی ملکی یا وطنی جذبہ ہندوستان کے متعلق قائم کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر نہیں تو پھر نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

سوا ہندوستان کے اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں ان کے حالات پر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کو منطبق نہیں کر سکتے کیونکہ ترکی۔ ایران۔ افغانستان، عرب، مصر میں نہ وہ محکوم کی حیثیت سے ہیں نہ اجنبی اقوام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کا ملک ہے ان کی آبادی ہے اُن کی حکومت ہے اور اس لئے اگر وہاں کے مسلمانوں کو اُن کی مغربی ذہنیت یورپ کی طرف کھینچ رہی ہے تو درست ہے اور وہ انھیں اصول کو سامنے رکھ کر ترقی کر سکتے ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمان اگر ان کی پیروی کرنا چاہیں تو یہ کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ ہندوؤں کی بیداری نے مغربی حکومت کا جُوا اپنی گردن سے علیحدہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

ہماری قدامت پرستیاں!

"کسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جو دریا کی سطح پر مصلا بچھا لیتے تھے اور اس پر نماز پڑھتے ہوئے اس کو عبور کر جاتے تھے۔"

"کوئی ولی اللہ کسی طرف سے گزر رہے تھے کہ ایک کنوئیں پر انھوں نے آدمیوں کا ہجوم دیکھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ایک بھینس اندر گر گئی ہے اور لوگ اس کے نکالنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے کنوئیں میں ہاتھ لٹکا کر جو باہر نکالا تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ بھینس باہر کھڑی ہوئی ہے۔"

"کسی زمانہ میں ایک صاحب کرامت درویش کثرت ریاضت سے اس قدر لطیف ہو گئے تھے کہ پٹکا اُن کے جسم سے آر پار ہو جاتا تھا اور ان کا بدن حائل نہ ہوتا تھا۔"

"تذکرۃ الاولیاء" قسم کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے تو ہزاروں واقعات آپ کو اس سے زیادہ حیرت انگیز نظر آئیں گے لیکن آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کیا واقعی کسی وقت ہمارے یہاں کے اکابر مذہب و تصوف سے اس قسم کی محیر العقول باتیں ظاہر ہوئی تھیں اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا سبب تھا اور کس فائدہ و نتیجہ کے لئے تھا اور اب اس "کشف و کرامات" کے لوگ کیوں نظر نہیں آتے؟

آپ کسی شخص سے جو ان باتوں کی صحت کا قائل ہے یہ سوال کریں گے تو وہ نہایت ہی غم آلود حسرتناک چہرہ بنا کر کہے گا کہ "یہ اگلے لوگوں کی باتیں ہیں جو انھیں کے ساتھ گئیں نہ اب وہ ریاضتیں ہیں، نہ عبادتیں، نہ وہ روحانیت ہے نہ صداقت، نہ وہ ایمان ہے نہ وہ یقین، پھر آپ اس سے پوچھئے کہ اب ایسا کیوں نہیں ہے کیا مسلمان دنیا میں نہیں رہے، کیا عبادت کا اصول بدل گیا، کیا اصول اخلاق و روحانیت میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا، تو وہ اس کے جواب میں سوا اس کے کہ اپنی کمبختی کا رونا روئے، خدا کی مرضی پر محمول کرے یا کلجگ کی خرابی بتا کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ کہے گا۔ ——

—— اکثر و بیشتر میرے پاس ایسے حضرات کرم فرماتے رہتے ہیں جو میرے کفر و الحاد میں میرے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ مجھے راہ راست پر لانے کی سعی فرماتے ہیں چنانچہ چند دن ہوئے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور اس عزم کے ساتھ کہ وہ مجھ بے دین کو بغیر مسلمان بنائے ہوئے نہ اٹھیں گے۔ میں ان کی مقطع صورت، ان کی شرعی وضع اور ان کے ہنگامہ خیز "السلام علیکم" سے چونک کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آج پھر کوئی "خدا لوندا اپنے "ناچیز بندہ" کو سعادت جلوہ بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے تعظیماً و احتراماً اٹھ بیٹھا، صدر میں جگہ دی اور مؤدب ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک نہایت غور سے میری صورت و وضع کو دیکھتے رہے اور پھر ایک نہ چھپ سکنے والی خشونت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ "میں نے سنا ہے کہ تم معجزہ و کرامت کے قائل نہیں" میں نے عرض کیا کہ "یہ تو آپ نے غلط سنا ہے" کیونکہ کل ہی میں کارنوال میں ایک ندمن کا کارنامہ دیکھ چکا ہوں جو ۱۰۰ فٹ کی بلندی سے ۳ فٹ کی جست لگاتا ہوا آگ کے شعلوں کے اندر غائب ہو جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کے پروفیسر معشوق علی کی کرامتیں بارہا دیکھ چکا ہوں جو ایک رومال سے درجنوں رومال اور ایک روپیہ سے سیکڑوں روپے آن کی آن میں بنا دیتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور برہم ہو کر بولے۔ "تو کیا رسولوں کے معجزے اور اولیاء کی کرامات بھی کوئی شعبدہ بازی تھی"

میں نے کہا "مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے لئے تو ان لوگوں کے یہ تماشے بھی معجزے ہی کا حکم رکھتے ہیں، کیونکہ میں ویسا کرنے سے عاجز ہوں" ——— فرمایا ——— "مشق سے ہر شخص ایسا کر سکتا ہے" ——— میں نے کہا کہ ——— "ایک منکر مذہب معجزوں کے متعلق بھی یہی کہہ سکتا ہے" بولے ——— "مگر اس کا یہ کہنا تو غلط ہوگا کیونکہ وہاں مشق و اکتساب کا کوئی سوال نہ تھا، معجزہ اصطلاح میں کہتے ہی اس کو ہیں جو ایک نبی سے بغیر کسی مشق و اکتساب کے سرزد ہو" میں نے کہا "بجا ارشاد ہوا، لیکن اگر آجکل کے شعبدے دکھانے والے بھی یہی دعویٰ کر بیٹھیں کہ جو کچھ وہ دکھلاتے ہیں اس کا تعلق مشق و اکتساب سے نہیں ہے تو آپ کیا فرمائیں گے" ——— کہنے لگے ——— "ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور سیکڑوں مثالیں ایسی بتاویں گے کہ مشق سے لوگ ویسا کرنے میں کامیاب ہو گئے"۔

میں نے کہا "یہ درست ہے، لیکن نتیجے کے لحاظ سے شعبدہ و معجزے میں کوئی فرق مجھے نظر نہیں آتا۔ سوا اس کے کہ ایک شخص کسی وہبی قوت کی وجہ سے اس کے ظہور کا مدعی ہے اور دوسرا مشق و اکتساب سے ——— اس سے اخلاق انسانی کو کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ بولے "معجزہ تو صرف اس لئے ہے کہ نبی کو نبی مانیں اور اس کے کہنے پر عمل کریں" ——— میں نے کہا ——— "تو خلاصہ یہ ہوا کہ نبی وہ ہے جس سے معجزہ سرزد ہو اور معجزہ وہ ہے جو نبی سے ظاہر ہو۔ کہنے لگے "بے شک"۔

ظاہر ہے کہ جس جماعت کے رہنما و قائد اس عقیدہ و خیال کے ہوں گے وہ کیوں نہ عجوبہ

پرست ہو گی اور اس کا یہ عقیدہ کہ اسلاف تک کے صاحبان علم و عزیمت، حاملان فضل و کرامت اب نہیں پیدا ہو سکتے، اس کو کس درجہ مایوس اور ناکارہ بنا دے گا۔ اس میں شک نہیں کہ عہد ماضی میں انسان کے لئے بہت کچھ دلچسپیاں ہوا کرتی ہیں اور گذرے ہوئے واقعات بعض دماغوں کے لئے ایک "طلسم زار" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں لیکن اس کا تعلق صرف ہمارے جذبات محبت عقیدت سے ہے جو انسان کے عہد وحشت سے وراثتاً منتقل ہوتے چلے آئے ہیں اور ابہام انکا ایک حقیقت واقعیہ سمجھ لی گئی اور ہر مذہب کے قیام کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی ایک مخصوص ہستی کے ساتھ جذبۂ خوف و احترام یا محبت و عقیدت پر قائم ہوئی اور اس ہستی کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے اپنی عقیدت و ارادت کو وسیع و مستحکم بنانے کے لئے بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے بیان کرنا شروع کیں جو لوگوں کو مرعوب یا راغب کرنیوالی تھیں چنانچہ انبیاء کے معجزے، اولیاء کی کرامات، درویشوں کی خوارق عادات سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ صرف ہمارے ہی ارادتمندانہ جذبات یا مصالح تبلیغ کی پیداوار ہیں۔ پھر جس طرح سو سال پیشتر کے کسی بزرگ کے حالات میں اس وقت ایک معتدبہ اضافہ اس کی کرامات کا نظر آتا ہے، اسی طرح آج کسی بزرگ کے متعلق بھی سو سال بعد ایسی ہی روایتیں منسوب کر دی جائیں گی اور جس طرح چار قرن پہلے کی پختہ قبر آج کسی نہ کسی بزرگ کا مزار بن گئی ہے اسی طرح نصف صدی بعد آج کی بنی ہوئی قبر پر بھی پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا مستبعد نہیں، اگر جہل و وہم پرستی کا یہی عالم رہا۔

ہمارے اسلاف نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ اس میں شک نہیں کہ لائق صد ہزار آفرین و ستائش ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ وہ کر گئے ہیں اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں اور جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں اس کو بلا چون و چرا آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا چاہئے حد درجہ مضر تعلیم ہے اور ایک

قوم کی دماغی و ذہنی ترقی کو خاک میں ملا دینے والی ہے۔

آئیے اپنے بعض اسلاف کی علمی تحقیق اور ذہنی ترقی کا ایک لطیفہ سُن لیجئے۔

علامہ قزوینی اور علامہ دمیری سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے۔

علامہ قزوینی وہی ہیں جنھوں نے "تاریخ گزیدہ" مرتب کی۔ ظفر نامہ لکھا اور نزہتہ القلوب تصنیف فرمائی۔ یہ حُر بن یزید کی اولاد میں سے تھے جن کو میدان کربلا میں سید الشہداء کے ہمرکاب جہاد کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور مذہباً شیعہ تھے۔ علامہ دمیری آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ، محدث و مفسر تھے۔ جامع ازہر قاہرہ میں فلسفہ وادب کے لکچرار تھے، خاص سرزمین مکہ میں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھتے تھے۔ صاحب کرامات بھی مانے جاتے تھے اور منجملہ خطبات و دیگر کتب کے ایک مشہور کتاب حیات الحیوان کے بھی مصنف تھے،

الغرض یہ دونوں ایسے صاحب فضل وکمال تھے کہ آج کوئی مولوی و عالم ان کے مرتبہ تک پہونچنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن ان کی تحقیق انیق اور ان کی پختگی ذہن کا کیا عالم تھا حیات الحیوان لے کر اسکول کے کسی طالب العلم کو دے دیجئے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیجئے ——— مثلاً ان حضرات کی کاوش علمی کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ عقاب کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

جب عقاب (چیل) سال خوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں بلند ہوتی ہے اور اس حد تک اوپر اڑ کر چلی جاتی ہے کہ اس کے پر حرارت آفتاب سے جل جاتے ہیں اس کے بعد وہ نیچے گرتی ہے اور ایک خورد تلخ

پانی کے کنوئیں میں غوطہ لگا کر از سر نو جوان ہو جاتی ہے" (قزوینی)

"جب چیل ضعیف و کہنہ ہو کر اندھی ہو جاتی ہے تو اس کے بچے اس کو چاروں طرف لادے پھرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک چشمہ تک پہونچتے ہیں اور اس میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اس کے اثر سے چیل کی بینائی عود کر آتی ہے اور وہ از سر نو جوان ہو کر اپنی شکاری زندگی شروع کر دیتی ہے۔"

"کرگس چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل کرگس کے انڈے سے۔ تمام چیلیں مادہ ہیں اور دوسری چڑیوں سے جفتی کھاتی ہیں، یہ صرف تین انڈے دیتی ہیں، لیکن تیسرے انڈے کو پھینک دیتی ہیں اور صرف دو سیتی ہیں، تیسرے انڈے کو ایک اور طائر جس کا نام کاسر العظام (ہڈی توڑ) ہے اٹھا لاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے۔

چیل، ہندوستان سے ایک پتھر لے آتی ہے اور گھونسلے میں رکھ دیتی ہے تاکہ انڈے دینے میں آسانی ہو، یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے جس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے یہ پتھر عورتوں کے وضع حمل میں بھی آسانی پیدا کرتا ہے۔"

(دمیری)

○

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عقاب کے متعلق جو کچھ ان محققین نے لکھا ہے وہ صرف نقل ہے قدیم یونانی روایات کی جو عہد قدیم سے اُن کے یہاں رائج چلی آ رہی تھیں پھر جب آٹھویں صدی ہجری تک ہمارے یہاں کے مورخین و مصنفین کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ روایات قدیمہ سے ایک انچ ہٹ کر خود اپنے ذہن و عقل سے کام لینا گناہ سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ اس کو

قبل ازیں کیا عالم رہا ہوگا اور اُن کے علمی کارناموں کی زمانۂ موجودہ میں کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

یقیناً ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں کیونکہ جو کچھ انھوں نے کہا وہ ان کی بساط عقل کے لحاظ سے بالکل درست تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تفتیش و تحقیق نے غیر معمولی وسعت اختیار کر لی ہے کیوں کسی کو اس امر کے ماننے پر مجبور کیا جائے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہم انھیں کا اتباع کر کے ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی وہ قدامت پرستی ہے جو اس سے قبل خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ و برباد کر چکی اور اب مسلمانوں کی جماعت اس کا شکار بنی ہوئی ہے۔

اعجوبہ پرستی کا دور گزر گیا۔ یہ دور ہے صرف تجربہ و مشاہدہ کا اس لئے اب نہ معجزہ و کرامات پر محض اس لئے یقین کیا جا سکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہے اور نہ صرف خوارق عادات کی بنا پر کسی کی عظمت و بزرگی ثابت کی جا سکتی ہے کیونکہ جب تک "طبیعیات" کی دنیا تک انسان کا دسترس نہ تھا کسی کا دس فٹ بلند جست کر لینا بھی معجزہ کہلایا جا سکتا تھا لیکن اب کہ طیاروں اور ہوائیوں کے ذریعے بشر کا ثریا ہو جانا بھی مستبعد نہیں اولیائے کرام کی خوارق عادات کو اُن کی بزرگی کے ثبوت میں پیش کرنا صرف یہی معنی رکھتا ہے کہ آج ہم یورپ کے ایک ایک موجد و مخترع کو صاحبِ کرامات یقین کرنے پر مجبور ہیں۔

کس قدر افسوسناک امر ہے کہ اس وقت بھی جب تمام دنیا میں علم کا اُجالا پھیل گیا ہے اور انسان حقیقی معنی میں "خلافت الٰہی" کے دور سے قریب تر ہوا جا رہا ہے ہم بدستور اسی زمانہ میں ہیں جب بقول اقبال قزوینی دو میری چیل کے گھونسلے میں پارس پتھر پایا جاتا تھا اور مستقبل کی امیدیں صرف نزول مسیح اور ظہور مہدی سے وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

کاش ہم سمجھ سکتے کہ اس وقت دنیا کو حاجت نہ مہدی کی ہے نہ مسیح کی بلکہ ضرورت ہے

اڈیسن و مارکونی کی، رآمان اور بوس کی کیونکہ انسان اب معجزہ و کرامات کی حدود سے گذر کر عالم جد و جہد کی اس منزل تک پہونچ گیا ہے جہاں خود اس میں "جذبۂ الوہیت" پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے اور انسانیت کبریٰ" کا مشاہدہ ایک ایسی حقیقت ذاتی" کا احساس اس کے اندر پیدا کر رہا ہے جس کو اگر ہم چاہیں تو معرفت ربانی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور قرب الٰہی سے بھی۔

اس لئے اگر تم قدامت پرستی کی لعنت سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو احمق و جاہل نہ سمجھو بلکہ ہوش گوش والا انسان باور کر کے ہر بات کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اپنے ذہن و دماغ کو نوامیس قدرت کی گتھیاں سلجھانے کا اہل بناؤ اور پرستش اسلاف ترک کر دو کہ اس سے زیادہ سنگ گراں ترقی کی راہ میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں بھی اسی کا لحاظ رکھو کہ اُن کی عقلی آزادی مجروح ہونے پائے اور دوسروں کی پیروی میں مطالعۂ اشیا کی عادت اُن کی "حریت فکر" کو تباہ نہ کر دے۔ پھر اگر تمہاری ایک نسل بھی اسی اصول کے تحت تربیت پا گئی تو سمجھ لو کہ تمہاری تمام مصیبتیں دُور ہو گئیں ورنہ کل جو تم کو اور تمہاری اولاد کو دیکھنا ہے اسے آج میری زبان سے سن لو اور یاد رکھو کہ جس طرح اور ہزاروں اندھی قومیں اس سے قبل تباہ ہو چکی ہیں اسی طرح تم کو بھی تباہ و برباد ہو جانا ہے اور خدا اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ مسلمان کا وجود دنیا میں باقی رہے یا نہ رہے۔

مذہب و الحاد

کبھی آپ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ کیا وہ کوئی معمہ ہے جسے عقلِ انسانی اس وقت تک حل نہیں کر سکی، کیا وہ کوئی دقیق علمی مسئلہ ہے جس کی حقیقت کا علم ابھی تک نوعِ انسانی کو نہیں ہو سکا کیا وہ کوئی خیالی تار و پود ہے جس کی گتھیاں کبھی سلجھائی نہیں جا سکتیں۔ کیا وہ فطرت کا کوئی ایسا راز ہے جو کبھی بے نقاب نہیں ہو سکتا اور کیا وہ کوئی شاعرانہ ادعا ہے جو کبھی "شرمندۂ معنی" نہیں ہوا؟

یقیناً مذہب ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی معمہ ہے نہ دقیق علمی مسئلہ۔ نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے نہ فطرت کا عمیق راز۔ نہ وہ شاعری ہے نہ محض لفاظی، پھر کیا ہے؟

اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے صرف خدا کی پرستش و نیایش کا تو آپ کو اسکے تسلیم کرنے میں تامل ہوگا کیونکہ اس سے نہ خدا کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ انسان کو اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے بے چون وچرا ان صحائف پر ایمان لے آنے کا جنھیں الہامات ربانی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو آپ کو اس کے ماننے میں پس و پیش ہوگا، کیونکہ بغیر سمجھے ہوئے کسی بات کی تصدیق کرنا عقل انسانی کے منافی ہے۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ مذہب نام ہے چند معین حرکات و مراسم کا،

بعض مخصوص الفاظ کے زبان سے ادا کر دینے کا تو آپ کو اس کی صحت سے تو یقیناً انکار ہوگا کیونکہ ان باتوں سے تاثرات دماغی کو کیا واسطہ ——— لیکن اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے ——— احساس انسانیت کا تو غالباً اصولی نقطۂ نظر سے زاہد متقشف کو انکار ہوگا ورنہ عقلیت پرست انسان کو ——— پھر آپ کا وقت تو ضائع ہوگا لیکن آیئے چند لمحات اس کے سمجھنے میں بھی صرف کر دیں کہ "احساس انسانیت" کیا چیز ہے۔

میں انسان پیدا ہوا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ واقعی انسان ہوں لیکن اگر میں چھری لے کر اپنے کسی عضو کو مجروح کر ڈالوں یا کسی بلند دیوار پر چڑھ کر نیچے کود پڑوں تو کیا آپ اس وقت بھی مجھے انسان کہیں گے؟ غالباً نہیں۔

زید نہایت زیرک انسان ہے۔ لیکن دو اور دو کے مجموعہ کو وہ ہمیشہ تین سمجھتا ہے تو کیا آپ اس کی صحت عقل و دماغ کا یقین کریں گے؟ غالباً نہیں۔

حامد بڑا صاحب عقل و فراست انسان ہے لیکن کسی دوسرے شخص کو ذبح کر ڈالنے یا لوٹ لینے میں مطلق تامل نہیں کرتا تو کیا آپ اس کی فراست و دانائی کو تسلیم کریں گے؟ غالباً نہیں۔

اس لئے معلوم ہوا کہ انسان اس مخصوص ہیئت والی مخلوق کو نہیں کہتے جو خاص قسم کے جوارح و اعضاء رکھتی ہے بلکہ انسان نام ہے اس خاص کیفیت عقل و شعور کا۔

(۱) جو خود اس کی ذاتی اہمیت کو متعین کرتی ہے۔

(۲) جو عقل کا صحیح استعمال سکھاتی ہے۔

(۳) جو افراد انسانی کا احترام کرنا بتاتی ہے۔

اور اس لئے اگر ان میں سے کسی ایک حس کا فقدان کسی شخص میں پایا جائے گا تو ہم کہیں گے کہ وہ دائرۂ انسانیت سے خارج ہے۔

پھر آیئے غور کریں کہ مذہب و الحاد کے موجودہ درکش مکش میں انسان کہاں پایا جاتا ہے اور کس کا ساتھ دینے میں انسانی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ مذہب کا تعلق جس حد تک بانیان مذہب سے ہے ہمیں اس میں حرف گیری کا کوئی موقع نہیں ملتا اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں یہ احساس سگانہ پوری قوت کے ساتھ پایا جاتا تھا کیونکہ جس حد تک ذاتی اہمیت کا تعلق ہے وہ اپنے آپ کو فرستادۂ خدا اور مامور من اللہ کہہ کر انتہائی نقطہ تک پہنچ لائے اور جس حد تک استعمال عقل و فراست کا واسطہ ہے اس کا بیّن ثبوت وہ اُن جماعتوں کی صورت میں چھوڑ گئے جنھوں نے ان کو رسول و نبی مان کر اُن کے کہنے پر عمل کیا اور جن کی عقلوں کو اپنے زمانہ کے مقتضا کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ رہ گیا نوع انسانی کا احترام، سو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مقالاً نہیں بلکہ عملاً ہمیشہ اسی کا درس دیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بانیٔ مذہب کے اٹھ جانے کے بعد اس کی تعلیم کا اثر ضعیف ہونے لگا اور یہ ضعف رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ گیا کہ مذہب کا صحیح مفہوم ہی لوگوں کے دلوں سے محو ہو گیا اور وہ چیز جس کا تعلق صرف فعل و عمل سے تھا، محض لفظی و مقامی ادعا ہو کر رہ گئی۔

مثلاً عہد سعادت کو لیجئے جب رسول اللہ زندہ تھے اور ان کی تعلیم زندہ تھی کہ اس وقت اپنے آپ کو "نحن مسلمون" کہنے والے کس نوع کے انسان تھے اور آج کس

انداز کے ہیں ———— اس وقت مسلم نام تھا ایک ایسے انسان کا جس کی ذاتی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ جب مستعد ہو کر اس نے اپنی آستین اُلٹ دی تو یہ سمجھئے گویا زمانہ کا ورق اُلٹ دیا اور جب وہ دوسروں کی ہمدردی پر آمادہ ہوا تو اپنی جان قربان کرنے میں اس نے پس و پیش نہ کیا۔ رہ گئی عقلی آزادی سو اس کا ثبوت "لا اکراہ فی الدین" سے زیادہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔

برخلاف اس کے آجکل اُن اکابر اسلام کو دیکھئے جو اپنے بڑے بڑے عماموں اور لانبی لانبی عباؤں کے ساتھ تقدس اسلامی کا قد آدم اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ ان علمائے کرام اور صوفیائے عظام کو دیکھئے جو اپنی طویل الذیل داڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے غرقوں کے ساتھ ہیئت اسلامی کا دیو پیکر مجسمہ نظر آتے ہیں کہ اگر کسی ایسی بستی میں جو انسانی عصیاں کاری سے تباہ و برباد ہو چکی ہے عدوان و معصیت کا کوئی صحیح مجسمہ نصب کیا جانا مقصود ہو تو اُن سے بہتر "ماڈل" مل ہی نہیں سکتا ———— ان کے جسم کے ایک ایک ریشہ کی پرورش، ان کے خون کے ہر ہر قطرہ کی روانی ایک مستقل یادگار ہے، اس بد باطنی و کور نفسی کی ایک طویل داستان ہے اس مکر و فریب اور زور و ریا کی جس کو اسلام نے بدترین لعنت قرار دے کر دنیا سے مٹانا چاہا اور اس جماعت نے بہترین ذریعۂ فلاح و کامیابی سمجھ کر اختیار کیا۔

اس کے سر نمازوں میں اس لئے نہیں جھکتے کہ مقصود خدا کی پرستش ہو بلکہ صرف اس لئے کہ دوسروں کے سر اُن کے سامنے جھکیں۔ وہ روزے اس لئے نہیں رکھتے کہ ابنائے جنس کی عسرت و تنگدستی کا اندازہ کر کے ان کے ساتھ ہمدردی کریں بلکہ صرف اس لئے کہ بہتر سے بہتر غذائیں ان کے سامنے پیش کی جائیں وہ اپنے مواعظ میں بخشش و عطا کی فضیلت اس لئے بیان نہیں کرتے کہ اسکی

اہمیت کا خود انھیں بھی عملی اعتراف ہے بلکہ محض اس لئے کہ دوسرے اپنی دولت اُن قدموں پر ڈالدیں۔

ان خدا سے ڈرنے والوں کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو کہ وہ اپنی شبستانِ عیش میں کیسی شادکام اور عذاب الٰہی کی طرف سے کیسی مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دُنیا کی کوئی معصیت ایسی نہیں جو دوسروں کے لئے حرام اور ان کے لئے حلال نہ ہو اور زائض اخلاق میں سے کوئی امر ایسا نہیں جو دوسروں کے لئے واجب اور ان کے لئے غیر ضروری نہ ہو، ان کا خدا قہار وجبّار ہے لیکن دوسروں کے لئے اُن کے لئے نہیں۔ اُن کا خدا رحیم وکریم ہے مگر صرف ان کے لئے دوسروں کے لئے نہیں، اُن کی فردوس بھی علیحدہ ہے اور ان کا حوض وکوثر بھی دوسرا، اُن کی حوریں بھی مخصوص ہیں اور اُن کے غلمان بھی منتخب۔ الغرض یہ جماعت جو جسم کے لحاظ سے "گاؤ پروری" —— اور نفس کے لحاظ سے "فرعون ونمرود" ہے ایک مستقل عذاب ہے جو انسانیت واخلاق پر نازل ہوا ہے، اور جو اصل سبب ہے موجودہ ارتداد والحاد کا کیونکہ اُن کی زندگی، اُن کی تعلیم، اُن کا عجب وغرور نسلِ حاضر کے لئے جو یقیناً زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ اہل تنقید کی ہے ایک ایسا حجاب ہے قبول مذہب کے لئے جس کا دُور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اُن بتوں کو مسمار نہ کر دیا جائے —— پھر یہ خصوصیت صرف علمبردارانِ مذہب اسلام ہی میں نہیں پائی جاتی اور نہ میرا مخاطبہ صرف انھیں سے مخصوص ہے بلکہ اس وقت تمام مذاہب عالم کے عالموں، پجاریوں، راہبوں اور موبدوں کا یہی حال ہے اور اس لئے اگر ہم اِن کی تعلیمات اور ان کے حالاتِ زندگی کو سامنے رکھ کر مذہب کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو ہم اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ "نجات انسانی" کبھی مذہب سے متعلق نہیں ہو سکتی —— کیونکہ جس حد تک اعتماد نفس واحترام انسانیت کا تعلق ہے وہ یکسر نفس پرست خود غرض واقع ہوئے ہیں اور اُن کی ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ مذہب کے

باب میں عقل سے کام لینا وہ کسی طرح گوارا کر ہی نہیں سکتے ـــــ یہاں تک کہ اب مذہب نام صرف اس چیز کا رہ گیا ہے جسے عقل انسانی قبول نہ کرسکے۔

اب مذہب کے مقابلہ میں الحاد و ارتداد کو دیکھئے جو اس وقت نہایت قوت کے ساتھ دُنیا میں پھیل رہا ہے سو اس میں کلام نہیں کہ انسان کی ذاتی اہمیت اب اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے، اور اس کی تمام کارگاہ یکسر عقل و علم پر قائم ہے، لیکن مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہ اجتماعی طور پر نوع انسانی کو کوئی فائدہ پہونچا سکتا ہے اور جب تک کوئی ادارہ حقیقتاً "احساس انسانیت" کو بیدار نہ کرسکے، ہم اسے امن و سکون کا ضامن نہیں کہہ سکتے،

ہو سکتا ہے کہ ایک ملحد و منکر دُنیا میں غیر معمولی دولت کا مالک ہو جائے، ممکن ہے کہ مذہب سے آزاد ہونے کے بعد انسان کی عقلی و ذہنی آزادیاں علوم و فنون میں بیش بہا ایجاد و اختراع کا سبب بن سکیں، لیکن کفر و الحاد میں کوئی ادنیٰ سی علامت بھی اس امر کی نہیں پائی جاتی کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنا سکھا سکے، اور ساری دنیا کے افراد کو کسی وقت ایک رشتہ سے وابستہ کر دینا اس کے امکان میں ہو، یورپ کی موجودہ علمی ترقیاں اور اسی کے ساتھ اس کا استعماری جذبہ اُس کی تجارتی حرص اور انسانیت سوز جنگی تیاریاں کافی ثبوت اِس امر کا ہیں کہ دُنیا کو جس چیز کی ضرورت ہے اور عالم انسانی جس مقصود کے لئے تڑپ رہا ہے وہ نہ اس وقت کے بتائے ہوئے مذہب سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ الحاد و لا مذہبیت سے بلکہ۔

"مرد ایں رہ را نشانے دیگر ست"

پھر وہ نشان کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کون سا راستہ ہے جو منزل مقصود تک پہونچا سکتا ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب دُنیا کی اس قوم کے لئے بہت مشکل ہے جو محکومانہ و غلامانہ زندگی بسر کر رہی ہے کیونکہ عقل و روح کی آزادی حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے خیال کی آزادی ضروری ہے اور جب تک ہم اس منزل سے نہ گزر جائیں آیندہ منزل کی جستجو بیکار ہے۔

اکابر اسلام کے بعض خرافیات

جب کوئی مذہب اپنے ابتدائی دَور سے گزر جاتا ہے اور قوّتِ عمل ضعیف ہو کر صرف قوّتِ خیال پر معتقدات کی بنیاد قائم ہوتی ہے تو بعض نہایت عجیب و غریب صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ایک محقق کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اصل سنت کسی مذہب کی کیا تھی اور بعد کو اس میں کیا کیا اضافے کئے گئے اور کس طرح اس کو مسخ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیاسات و توہمات اصل مذہب قرار دے دیئے جاتے ہیں اور صرف اعجوبہ پرستی ہی سے اس کا وقار قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے —— چنانچہ مذہب اسلام پر بھی ایک ایسا ہی زمانہ گزر چکا ہے، جب چاروں طرف کا خار و خس لا لا کر اس چشمہ میں ڈالا گیا، یہاں تک کہ شفاف پانی کی سطح نظروں سے چھپ گئی اور لوگوں نے اس کی گندگی کو اصل مذہب قرار دے لیا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

قاف —— ایک پہاڑ ہے جو تمام روئے زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ میں نے احاطہ کا لفظ صحیح استعمال نہیں کیا کیونکہ قدیم عبرانیوں اور یونانیوں کی طرح

اہل عرب بھی زمین کو چپٹا باور کرتے تھے۔ مدعا یہ کہ کوہ قاف زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک چاروں طرف چلا گیا ہے لیکن اُس کے اور زمین کے درمیان ایک ایسا زبردست حلقہ تاریکی کا ہے۔ جس کو انسان عبور نہیں کر سکتا اور اگر عبور کرے بھی تو کم از کم چار مہینے درکار ہوں[۱] ــــــ بعض روایات کی رو سے یہ حلقہ تاریکی محض کا نہیں ہے بلکہ نہایت ہی متعفن و تاریک پانی کا ہے جسکے ساحل ناپید ہیں ــــــ اس کا نام بحر المحیط یا اوقیانوس[۲] ہے۔

کوہ قاف تمام زمین کو مع اس کے سمندروں کے اس طرح احاطہ کئے ہوئے ہے جیسے انگوٹھی اُنگلی کا احاطہ کر لیتی ہے ــــــ قزوینی اور ابن الوردی کا بیان ہے کہ کوہ قاف زمرد سبز کا ہے اور آسمان کا نیلگوں نظر آنا اسی کے عکس کی وجہ سے ہے۔

بعض کی تحقیق یہ ہے کہ وہ چٹان جس پر یہ پہاڑ قائم ہے۔ زمرد کی ہے۔ اس چٹان کو وتد[۳] کہتے ہیں کیونکہ خدا نے اسی کے ذریعہ سے زمین کو تھام رکھا ہے۔

طبری کا بیان ہے کہ اگر کوہ قاف زمین کو تھامے نہ ہو تو زمین ہر وقت لرزش میں رہتی اور کوئی شخص اس پر سکونت نہ کر سکتا۔ قزوینی کا بیان ہے کہ زمین ہر وقت ہلتی ڈلتی رہتی تھی اس لئے خدا نے ایک فرشتہ[۴] پیدا کیا جس نے اُسے اپنے شانہ پر رکھ کر مضبوطی سے پکڑ لیا ــــــ یہ فرشتہ ایک مربع قطعۂ یاقوت زعفرانی پر کھڑا ہے جسے ایک بڑا بیل سینگوں پر سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بیل ایک مچھلی کی پشت پر قایم ہے جو پانی پر تیرتی رہتی ہے۔

۱؎ ملاحظہ ہو طبری جس نے اس کے ثبوت میں رسول اللہ کی حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔

۲؎ ملاحظہ ہو ابو الفدا ــــــ القزوینی ــــــ ابن الوردی۔

۳؎ سورۂ نبا آیت ۶، ۷ الم نجعل الارض مهٰدًا والجبال اوتادًا ''کیا ہم نے زمین کو برابر سطح اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا۔''

۴؎ قدیم یونانیوں کے یہاں بھی اس قسم کی روایت پائی جاتی ہے کہ اٹلس دیوتا زمین اپنے شانہ پر لئے ہوئے ہے۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قاف دنیا کے تمام پہاڑوں کی بیخ و بن ہے اور سب پہاڑ اندر ہی اندر جا کر اس سے مل گئے ہیں اور جب خدا کسی قطعۂ زمین کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اندرونی سلسلہ کو جنبش میں لے آتا ہے جس سے زلزلہ پیدا ہو کر لوگ مر جاتے ہیں۔ بعض نے زلزلہ کی حقیقت بیان کی ہے کہ بیل جو زمین کو سنبھالے ہوئے ہے کبھی کبھی کانپ اٹھتا ہے اور اس کی کپکپی سے زمین بھی تھرا اٹھتی ہے۔

کوہ قاف زمین کی انتہائی حد ہے اور کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے بعد کیا ہے۔ لیکن ابن الوردی کا بیان ہے کہ ماوراء قاف دوسرا عالم یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی زمین چاندی کی ہے۔ اور فرشتے یہاں قیام رکھتے ہیں، ایک حدیث نبوی کی بنا پر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ماوراء قاف اور بہت سی زمینیں ہیں۔ ایک زمین سونے کی ستر زمینیں چاندی کی ہیں، سات مشک کی ہیں اور ہر زمین دس ہزار دن کی مسافت کی ہے جہاں فرشتے ہی فرشتے رہتے ہیں۔

آپ نے کرۂ ارض کی حقیقت، کوہ قاف کی اصلیت اور زلزلہ کی ماہیت سن لی جسے ہمارے یہاں کے مورخین و محققین بیان کرتے ہیں اور جس کے ثبوت میں قرآن کی آیات و احادیث نبوی پیش کی جاتی ہیں، اچھا اب غور کیجئے کہ اس کا کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

ہر وہ شخص جو مسلمان ہو یا مسلمان رہنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ان باتوں پر ایمان لائے کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اکابر اسلام کی تحقیق ہے اور تحقیق بھی وہ جس کی بنیاد قرآن و احادیث پر قائم ہے۔

ان باتوں سے انکار کرنا گویا قرآن و حدیث سے انکار کرنا ہے اور قرآن و حدیث کا منکر کافر ہے۔

۲۔ اگر آج کوئی شخص کہے کہ یہ تمام روایتیں بالکل لغو و مہمل ہیں، نہ قرآن سے اُن کا ثبوت مل سکتا ہے نہ احادیث سے تو فوراً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا ہمارے یہاں کے اکابر جو سب سے بہتر نقادِ قرآن و حدیث کے تھے، تمہارے برابر بھی عقل نہ رکھتے تھے اور کیا انھوں نے بغیر غور و تحقیق کے یوں ہی اس قسم کی احادیث کو صحیح باور کر لیا تھا؟"

۳۔ ایک شخص کے سامنے جب اسلام پیش کیا جاتا ہے تو معہ اُن تمام روایات کے پیش کیا جاتا ہے جو اس میں پائی جاتی ہیں اور یہ کہہ کر کہ اب مزید تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام اور اسلامی لٹریچر کے سمجھنے والے اب موجود نہیں ہیں اور ہم کو آنکھ بند کر کے ان کی تحقیق پر عمل کرنا چاہیے۔

۴۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی مذہبی روایات میں دیگر مذاہب کے خرافیات (میتھالوجی) نہیں پائے جاتے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا علم الاصنام کسی اور چیز کا نام ہے، کیا خرافیات اِن روایتوں سے علیحدہ کوئی اور چیز ہو سکتی ہے؟ اور کیا مسلمانوں میں جو اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں وہ واقعی دوسرے مذاہب کی خرافیات سے استفادہ نہیں کی گئی ہیں۔

آئیے ایک اسی کوہ قاف کی روایات پر غور کیجئے ان کا اصل ماخذ کیا ہے۔

قدیم ایران کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ "البرز" جسے قدیم پہلوی زبان میں "ہرابرزاتی" (یعنی اونچا پہاڑ) کہتے تھے، بالکل اسی قسم کی روایات اس سے متعلق تھیں، اور قدیم یونانیوں کے کوہِ اولمپس کی طرح آتش، جن، خداؤں یا دیوتاؤں کا مسکن بتایا جاتا تھا۔

اس پہاڑ کے متعلق اوستا لٹریچر میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زمین کے تمام پہاڑوں کی بنیاد ہے جو زمین کے اندر ہی اس سے نکل کر پھیل گئے ہیں۔ اسی پہاڑ میں ایک جھیل وروکشا بھی پائی جاتی ہے اس پہاڑ کا دوسرا نام

قاف بھی ہے۔ صاحب معجم البلدان نے بھی لکھا ہے کہ قاف کو پہلے البرز کہتے تھے۔ ہندوؤں کے پران میں بھی ایک ایسے ہی پہاڑ کا ذکر موجود ہے جس کا نام لوکا لوک ہے ان کا خیال تھا کہ یہ پہاڑ اس دنیا کو اُس دُنیا سے علیحدہ کرتا ہے اور اس کے دوسری طرف سوا تاریکی کے کچھ نہیں ہے ـــــــ چینی مذہب والوں کی روایات میں بھی ایک پہاڑ والوسوز ایسا پایا جاتا ہے جو انسانی آبادی کی آخری حد سمجھا جاتا ہے۔

منڈاپنی قوم میں بھی ایک روایت پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا سمجھتے تھے اور تین طرف پانی سے گھرا ہوا باور کرتے تھے۔ شمال کی طرف وہ ایک ایسے پہاڑ کا وجود مانتے تھے جو زمرد کا بنا ہوا تھا اور جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا تھا۔

الغرض تمام مشرقی قوموں میں شمال کی طرف ایک پہاڑ کا پایا جانا باور کیا جاتا تھا اور غالباً یہ خیال اہل بابل سے لیا گیا تھا۔ قدیم عبرانیوں میں بھی قریب قریب اسی قسم کی روایتیں رائج تھیں جیسا کہ توریت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے:۔

متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ کوہ قاف وہی ہے جسے ایرانی البرز کہتے تھے اور جو روایات اس کے متعلق اُن کے یہاں پائی جاتی تھیں وہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیں اور متعدد حدیثیں رسول اللہ سے ایسی منسوب کر دیں جن سے ان روایتوں کی تصدیق ہوتی ہے لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اور مذاہب کی تو تمام روایات خرافات میں شامل کی جائیں گی لیکن اپنی روایات کو بالکل صحیح بتایا جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ نے ایسا بیان کیا ہے پھر اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے کوہ قاف کو انھیں خصوصیات کے ساتھ تسلیم کیا جائے جو احادیث میں پائی جاتی ہیں یا ان سے انکار کر کے کافر و مرتد بننا گوارا کیا جائے۔

اب رہا یہ امر کہ لفظ قٓ جو قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کو سمجھانے کے لئے یہ تمام

روایتیں گھڑی گئیں ہیں کیا مفہوم رکھتا ہے غالباً ہمارے موضوع سے علیحدہ ہے اور اس کے سمجھنے کے لئے یہ لازم نہیں کہ ایک شخص ان تمام روایتوں پر ایمان لائے۔

عزرائیل

اب ہم عزرائیل یا ملک الموت کی حقیقت پر اکابر اسلام کی تحقیق پیش کرتے ہیں جو کوہ قاف کی تحقیق سے کم حیرت انگیز نہیں۔

۱۔ عزرائیل اتنا چوڑا چکلا اور اتنا زبردست فرشتہ ہے اگر دنیا کے تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی اس کے سر پر ڈالا جائے تو ایک قطرہ بھی زمین تک نہ پہونچے اس کا نورانی تخت چوتھے یا ساتویں آسمان پر ہے جہاں اس کا ایک پاؤں ٹکا ہوا ہے اور دوسرا پاؤں اس پل پر ہے جو دوزخ اور بہشت کے درمیان بنایا گیا ہے۔ اس کے ستر ہزار پاؤں ہیں۔

۲۔ اول اول عزرائیل بھی دوسرے فرشتوں کی طرح تھا لیکن جب اللہ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو اس نے جبرئیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور زمین سے ایک مٹی عناصر یا ان اجزا کی لے آؤ جن سے انسانوں کی تعمیر ہو سکے لیکن جب جبرئیل زمین پر پہونچے تو ابلیس مانع آیا اور جبرئیل ناکام واپس آئے اس کے بعد میکائیل اور اسرافیل بھیجے گئے لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ آخر میں عزرائیل کو بھیجا گیا اور یہ کامیاب واپس آیا اور اللہ نے اس کو فرشتۂ موت بنا دیا کیونکہ اس نے رحم کی کمی تھی۔

۳۔ جب اللہ نے موت کو پیدا کیا تو تمام فرشتوں کو طلب کیا اور کہا کہ اس کی طرف دیکھو لیکن جب انھوں نے اس کی غیر معمولی قوت کو دیکھا تو حیران رہ گئے اور بیہوش ہو کر زمین پر ہزار دس سال تک گرے ہوئے پڑے رہے اس کے بعد جیسا انہیں

ہوش آیا تو یک زبان ہو کر بولے کہ "بے شک موت بڑی زبردست تخلیق ہے" خدا نے یہ سن کر فرمایا کہ "میں نے عزرائیل کو اس پر قابو دے دیا ہے"

۴۔ عزرائیل کے پاس تمام انسانوں کی فہرست موجود رہتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں رہتا کہ کب کس کی موت آئے گی۔ وہ لوگ جو نجات پانے والے ہیں اُن کے نام کے گرد ایک نورانی حلقہ ہوتا ہے اور جو دوزخی ہیں اُن کے نام کے گرد سیاہ حلقہ ہوتا ہے۔

۵۔ جب موت کا دن آتا ہے تو اللہ اُس درخت سے جو عرش کے نیچے ہے ایک پتہ توڑ کر گرا دیتا ہے جس پر مرنے والے کا نام منقوش ہوتا ہے اور یہ پتہ عزرائیل کی آغوش میں آ کر گرتا ہے، یہ نام پڑھ لیتا ہے اور ۴۰ دن کے بعد روح نکال لیتا ہے۔

۶۔ مرنے والوں میں بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو عزرائیل کا مقابلہ کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ عزرائیل نہایت سختی سے جان نکالتا ہے۔ عزرائیل اس مقابلہ کو دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور سارا حال بیان کرتا ہے خدا یہ سن کر فردوس کا ایک سیب اس کو دیتا ہے، جس پر بسم اللہ لکھی ہوتی ہے۔ عزرائیل یہ سیب لیجا کر اس جھگڑالو مرنے والے کو سنگھا دیتا ہے اور وہ فوراً جان دینے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ عمل صرف نیک بندوں کے لئے جائز رکھا جاتا ہے۔ کافروں کی جان چاہے کیسی ہی سختی سے نکلے پروا نہیں ہوتی۔

۷۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب عزرائیل روح نکالنے کے لئے حلق کے اندر جانا چاہتا ہے تو بندہ کسی "ذکر" کے ذریعہ سے حلق کے اندر جانے کا راستہ بند کر دیتا ہے، فرشتہ یہ دیکھ کر خدا کے پاس جاتا ہے اور تمام حال عرض کرتا ہے وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اس کے ہاتھ دیکھو اگر اس نے اپنی عمر میں صدقہ دیا ہو تو بھی جان نکالنا دشوار ہوتا ہے اور پھر عزرائیل اس کے ہاتھ پر اللہ کا نام

لگ جاتا ہے اور وہ لقاء ربانی کے شوق میں حلق کا راستہ کھول دیتا ہے
اور فرشتہ اندر گھس کر روح نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

۸۔ جب کسی مسلمان یا مومن کی روح نکالی جاتی ہے تو ملک الموت نہایت نرمی و آہستگی سے کام لیتا ہے اور روح نکال کر اپنے نائب فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے جو اسے حریر بہشتی میں لپیٹ کر آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے جب عرش خداوندی تک پہنچتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ اس روح کو اس قبر میں لے جاؤ جہاں وہ مومن دفن کیا گیا ہے لیکن اگر کوئی غیر مسلم کافر مرنے والا ہوتا ہے تو اس کی روح نہایت سختی و بے رحمی سے نکالی جاتی ہے اور جب آسمانوں کے دروازے اس کے لئے نہیں کھلتے تو فرشتہ اسے وہیں زمین کی طرف پھینک دیتا ہے۔

۹۔ ادریس، الیاس، عیسٰی اور خضر موت سے آشنا نہیں ہوئے اور اب تک زندہ ہیں۔ موسیٰ کے پاس جب ملک الموت آیا تو انھوں نے ایک تھپڑ مارا، جس سے اس کی ایک آنکھ مجروح ہو گئی۔ جب فرشتہ یہ شکایت لے کر خدا کے پاس آیا تو خدا نے بہشت کا سیب اس کو دیا اور سونگھ کر وہ جان دینے پر راضی ہو گئے۔

۱۰۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی جان نکالنے والا فرشتہ اور ہوتا ہے اور دوسرے آدمیوں کی روح نکالنے والا کوئی اور۔ اسی طرح مومن و کافر کی جان نکالنے کے لئے علیحدہ علیحدہ فرشتے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے اکابر اسلام کی تحقیق فرشتۂ موت کے متعلق جو حسب ذیل کتابوں میں پائی جاتی ہے۔

مشکوٰۃ شریف (حدیث) بخاری شریف (حدیث) مروج الذہب (المسعودی)

درۃ الفاخرہ (الغزالی) عجائب الملکوت (الکسائی) تاریخ طبری، تاریخ ابن اثیر، تاریخ الخمیس دیاربکری، قصص الانبیا (ثعلبی) کتاب الانس الجلیل (مجیر الدین حنبلی) کتاب البدء و تاریخ (طاہر مقدسی)۔

تماشہ یہ ہے کہ یہ تمام بیانات رسول اللہ سے منسوب کئے جاتے ہیں اور کسی کا خیال اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ سب باتیں بعد کی گھڑی ہوئی ہیں اور رسول سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔

ملک الموت کے متعلق اس طرح کی حیرت انگیز روایات یہود میں رائج چلی آ رہی تھیں، کہ اس کے چار ہزار بازو ہیں، اس کے جسم میں زبان اور آنکھ کے سوا کچھ نہیں ہے، یعنی جتنے آدمی ہیں اتنی ہی آنکھیں اور زبانیں اس کے جسم میں بھی ہیں، اس کے چار چہرے ہیں وغیرہ وغیرہ اور بعد کو مسلمانوں نے انھیں روایات پر اعتماد کرکے اپنے یہاں لے لیا اور لوگوں کو یقین دلانے کے لیے رسول سے منسوب کر دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس زمانہ میں بھی ان روایات پر یقین کیا جا سکتا ہے اور کیا ادنیٰ فہم و عقل کا انسان بھی کبھی باور کر سکتا ہے کہ روح نکالنے کے لئے یہ تمام لایعنی حرکتیں کی جاتی ہیں۔

پھر افسوس ہے ہمارے علمائے کرام پر جو اب بھی مواعظ میں اس طرح کی روائتیں بیان کرتے ہیں اور صد ہزار افسوس ہے ان کی جسارت پر کہ ایسی باتوں کو رسول اللہ سے منسوب کرکے ان کی عظمت و عزت کو بھی خاک میں ملانا چاہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے جتنی تحقیقات علمی و تاریخی کی ہے اس کی نظیر اب مل نہیں سکتی۔ پھر اگر ان کی تحقیقات کا یہی عالم ہے اور ان کی علمی تفتیش وہی ہے جو کوہ قاف اور عزرائیل کے حالات بیان کرنے میں ان کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے تو خوشی کی بات ہے کہ اب دنیا میں ایسے احمق پیدا ہونا بند ہو گئے جو ایسی باتوں پر ایمان لائیں اور ایسے مذہب کا خدا حافظ ہے جو اس قسم کی روایات ماننے پر کسی انسان کو مجبور کرے۔

ہمارا مستقبل

پیشین گوئیاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ ایک وہ جو انبیاء و اولیاء کی زبان پر جاری ہوتی ہیں اور دوسری وہ جو علم و تجربہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں قسم اول کی پیش گوئی وحی و الہام ہو یا دور بینی (TELEPATHY) ہمیں اس سے بحث نہیں کیونکہ اول تو ایسی پیشین گوئیاں کرنے والے اب موجود نہیں اور اگر ہوں بھی تو اس دور تعقل میں کون ان کی سنتا ہے لیکن قسم دوم کی پیشینگوئی ہر صاحب عقل آسانی سے کر سکتا ہے اور اکثر و بیشتر وہ صحیح بھی نکلتی ہے کیونکہ کاروبار عالم مقررہ اصول پر چل رہا ہے اور اسباب و واقعات کو دیکھ کر نتائج پر حکم لگانا زیادہ دشوار نہیں۔

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان نے کہاں کہاں اور کس کس طرح زندگی بسر کی، حیات اجتماعی کے لئے اس نے کیا کیا اصول مقرر کئے ارتقاء کی کیا کیا صورتیں اس نے اختیار کیں اور اقوام عالم عروج و زوال کی منزلوں سے کیونکر گذرتی رہیں یہ اور اسی طرح کے بہت سے موضوع ہیں جن سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس وقت کوئی قوم عروج و ترقی سے گذر رہی تھی اس کو کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ اسے انحطاط و زوال کی منزل سے گزرنا پڑیگا اور آخر کار ایک دن فنا ہو جائے گی؟ کبھی نہیں ——

دنیا میں سب سے بڑی حکومت جس کی سطوت و جبروت نے تقریباً تمام کرۂ ارض

کا احاطہ کرلیا تھا سلطنت روما تھی لیکن آج وہ کہاں ہے؟ چنگیز و ہلاکو جنھوں نے سارے عالم کو لرزہ براندام کر رکھا تھا آج اُن کی اولاد کہاں اور کس عالم میں ہے؟ ——— بابل و سیریا کے محیر العقول تمدن کی بنیاد ڈالنے والے فرمانرواؤں کے نشانات کیا اُن کھنڈروں کے علاوہ کچھ اور ہیں جو اب صرف درندوں کو پناہ دے سکتے ہیں اسی طرح تم فراعنۂ مصر اکاسرۂ عجم اور دیگر جابرۂ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جب وہ دَور ترقی سے گذر رہے تھے تو اپنے کو غیر فانی سمجھتے تھے لیکن جبکہ وہ فنا ہو چکے ہیں ہمیں یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تھے بھی یا نہیں۔

زیادہ نہیں صرف چودہ سو سال قبل کی بات ہے کہ ایک صحرا نشین اُمّی ریگ زار عرب سے پیدا ہوتا ہے اور اپنے بعد ایک ایسے تمدّن کی بنیاد چھوڑ جاتا ہے کہ اُس کے جانشین مغرب و مشرق پر چھا جاتے ہیں، لیکن آج اس قوم کا کیا حال اُس کے تمدّن و تہذیب کا کیا رنگ ہے اور وہ انحطاط کے کس دَور سے گزر رہی ہے؟

ایں سخن را چہ جواب است تو ہم می دانی

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کا یہ دَور ختم ہو گیا ہے اور کیا اس کے انجام کے متعلق حکم لگانا کوئی ایسی پیشین گوئی کرنا ہے جو صرف انبیاء کے لئے مخصوص تھی؟ اگر اقوامِ عالم کی ترقی اسباب کی محتاج ہے تو اُن کے تنزل کو بھی اصولاً اسباب کا پابند ہونا چاہیئے اور اس لئے تاریخ عالم کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ ایک قوم کا مستقبل ہمیشہ اس کے حال میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے اور مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

اسلامی تہذیب دنیا کی تمام گزشتہ تہذیبوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی اور وہ حیثیت صرف یہ تھی کہ اُس نے انسانی زندگی کے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی کا بھی ضامن تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کی تمام مادی ترقیاں منحصر تھیں صرف اخلاق کی بلندی پر۔

موجودہ تہذیب میں مادی ترقی کی جو صورتیں نظر آ رہی ہیں وہ یقیناً تمام ازمنۂ گزشتہ

سے زیادہ وسیع ہیں لیکن چونکہ اخلاق کا پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے اسی لئے وہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اور زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ مادی ترقی جو خود ہی نوعِ انسان کی تباہی کی طرف منجر ہو کبھی صحیح معنی میں ترقی نہیں کہلائی جا سکتی۔

اسلام نے اس توازن کے قیام کے لئے سب سے پہلے جس تعلیم کو پیش کیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان برابر ہیں اور دولت کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے جذبۂ مساوات و اخوت کو متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ پھر یہ تعلیم صرف زبانی نہ تھی یا کسی علمی نظریہ کے طور پر پیش نہیں کی گئی تھی، بلکہ عملاً روز پانچ وقت شاہ و گدا کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اس کا درس دیا جاتا تھا۔

جب یہ تعلیم رائج ہو گئی تو ان کو بتایا گیا انسان دنیا میں صرف کام کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کو بے کار کبھی نہ بیٹھنا چاہیئے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ دنیا میں ترقی کی جتنی راہیں ہو سکتی ہیں ان سب کو اختیار کرنا چاہیئے۔

پھر یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو قوم اس اصول پر کاربند ہو وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتی، اور اگر آج مسلمان پستی کے عالم میں ہیں تو اس کا سبب سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس نے اس تعلیم کی روح کو پس پشت ڈال دیا اور اگر یہی حالت رہی تو اس کا فنا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔

تعلیمِ مساوات سے بے خبری و بے تعلقی کا یہ عالم ہے کہ نوعِ انسانی تو خیر بڑی چیز ہے وہ خود اپنی ہی قوم کا شیرازہ پراگندہ کر چکے ہیں اور محض فروعی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیار ہیں عملی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ تقدیر پر بھروسہ کر کے ہاتھ پاؤں ڈال دینا ہی جزوِ مذہب قرار دیا جاتا ہے اور اس کا اصطلاحی نام صبر و توکل رکھا گیا ہے۔

رہ گیا دنیاوی ترقی میں زمانہ کا ساتھ دینا، سو اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا جب کہ ایک زمانہ تک علوم جدیدہ کا حصول کفر کے مترادف سمجھا گیا اور اب بھی

ہمارے یہاں کے مذہبی علماء اور قائدین اُمت اُن سے بالکل نابلد ہیں اور نابلد رہنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے ہیں۔

پھر غور کیجئے! ایسا کیوں ہے؟ تاریخ کے صفحات اُٹھا کر دیکھئے کہ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کی ابتداء علمائے مذہب سے نہیں ہوئی اور کیا ذہنی غلامی کی بنیاد ڈالنے والی کوئی اور جماعت تھی؟ بنو اُمیہ کی سلطنت کو تباہ کرنے والے بنو عباس کی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے والے یہی لوگ تھے جو شاہان وقت کی ناجائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے اور جنھوں نے صرف طمع نفس کی بناپر رفتہ رفتہ اسلام کے لٹریچر کو اس قدر گندگی سے آلودہ کر دیا کہ آج اس کے صحیح خط و خال کا مطالعہ از بس دشوار ہے۔

پھر ظاہر ہے کہ جب قرون اولیٰ میں اس جماعت کا یہ رنگ تھا تو عہد حاضر میں اس کی بے بصری کا کیا عالم ہوگا اور جو قوم اپنا مستقبل ان کی تعلیم و ہدایت پر منحصر رکھے گی اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

یقیناً اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتہ سے وابستہ نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے لیکن اس کا علاج نہ پان اسلامزم سے ممکن ہے اور نہ فلسطین میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے بلکہ اس کا تعلق صرف احساسِ قومیت سے ہے اور افسوس ہے ہندوستان کا بدنصیب مسلمان اس احساس سے محروم ہے اور اب تک یہ سودا اس کے دماغ سے نہیں نکلا کہ وہ ہندوستان میں حکمراں ہوکر آیا تھا ——— اور حکمراں قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کو ایسا تفوق حاصل ہے جس کے سامنے یہاں کے تمام باشندوں کو اس کے سامنے گردن جھکا دینا چاہیئے۔

ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں ہے؟ اس کا سر رشتہ

بھی علمائے مذہب ہی کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے سرزمین ہند کو دارالحرب و کفرستان اور یہاں کے رہنے والے کو ہمیشہ کافر کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حائل کردی درآں حالیکہ نہ ہندوستان کفرستان ہے نہ ہندو کافر و مشرک۔

ایک ہندو مندر میں جاکر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے لیکن ایک مسلمان مسجد میں جاکر محراب کے سامنے سربسجود ہوجاتا ہے تو کافر نہیں، ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو مشرک ہے لیکن ایک مسلمان طواف کعبہ کے وقت سنگ اسود کو چومتا ہے تو مشرک نہیں۔ کیوں؟

اگر مسلمان کے یہ مذہبی مراسم خالصۃً للّٰہ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کا مقصود اس سے علیحدہ ہو۔ اگر ایک مسلمان سنگ اسود کو صرف اس لئے چومتا ہے کہ وہ ایک بڑے شخص کی یادگار ہے تو آپ کیوں یقین کریں کہ بتوں کی پرستش کسی اور جذبہ کے تحت کی جاتی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کون سا ہندو ہے جو بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتا ہے اور اگر بعض جاہل افراد ان میں ایسے ہیں تو پھر ان مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا جو قبروں کی خاک چاٹ چاٹ کر تعزیوں اور مقبروں کی جالیوں میں منت کی دھجیاں باندھ باندھ کر ہندوؤں سے زیادہ کفر و شرک میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

بہرحال مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں میں تفریق و اختلاف کا سبب صرف مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے جو ہندوستان میں دونوں کے علمائے مذہب کی طرف سے پیش کی گئی اور اب بھی پیش کی جارہی ہے۔

اس لئے اگر ہندوستان کی ترقی و آزادی کے لئے ہندو مسلمان کا اتحاد ضروری ہے تو سب سے پہلے دونوں جماعتوں کو مذہبی تعصب ترک کرکے اپنا شعار صرف انسانیت کی پرستش قرار دینا چاہئے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پنڈتوں کی گرفت سے ہندو اور علماء کے چنگل سے مسلمان آزاد ہوجائیں۔

عیش یا مسرّت

فرمانروائے خلدآباد کا خزانہ لعل و گہر سے مالا مال ہے اس کی حکومت لاکھوں مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے لطف و تفریح کے جتنے اسباب دولت سے فراہم ہو سکتے ہیں وہ سب مہیا ہیں۔ اسی کے ساتھ دولت حسن بھی موجود ہے، دولت شباب کی بھی کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مسرور اور کون ہو سکتا ہے لیکن دفعۃً قصر کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے، طبیبوں کے چہرے سے سخت فکر کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں کیونکہ بادشاہ جو ایک زمانہ سے بیمار ہے دفعتاً نہایت شدید قسم کے درد قلب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی —— بادشاہ تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کوئی میری سلطنت لے لے، میری تمام دولت پر قبضہ کر لے لیکن اس عذاب سے لمحہ بھر کے لئے کسی طرح نجات دلا دے —— ایک غریب لکڑہارا باہر قصر کے پاس سے گذرتا ہوا دل ہی دل میں کہتا ہے کہ "دولت بھی کیا چیز ہے" کاش مجھے بھی حاصل ہوتی اور میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتا جیسی بادشاہ بسر کر رہا ہے۔

ملکۂ نسرین جو دولت کے لحاظ سے پھولوں کی رانی مشہور ہے اپنے پاس کیا کچھ نہیں رکھتی۔ وہ ہمیشہ مخمل و حریر کی نرمی میں سوتی اور لعل و الماس کی روشنی میں بیدار ہوتی۔

اس نے ہمیشہ پھولوں کی چادروں پر قدم رکھا اور نغمہ و رنگ کی فضا میں آنکھ کھولی
—— حسن و جمال کا عالم یہ کہ

جو در پہ آگیا اُسے دیوار کر دیا

شباب کا یہ رنگ کہ جس نے ایکبار دیکھا جی سے بیزار ہو گیا

سنگِ مرمر کے حوضوں میں بلوریں فوارے چاروں طرف موتی بکھیر رہے ہیں، باغ کے کنجوں میں ہر جگہ تلاطم نکہت برپا ہے۔ پھولوں کی کثرت نے قصر کے گوشہ گوشہ کو سیلاب رنگ سے لبریز کر رکھا ہے، بربط و رباب کے تاروں سے راگنیاں بلند ہو ہو کر فضا میں مستی کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں —— مگر —— ملکہ نسریں ایک کمھلائے ہوئے پھول کی سی افسردگی لئے ہوئے سیج پر پڑی ہوئی ہے اور ریشمی تکیے اس کے نہ تھم سکنے والے آنسوؤں سے تربتر ہو رہے ہیں، کنیزیں التجائیں کر رہی ہیں، سمجھا رہی ہیں، لیکن اس کی ہچکیاں بند نہیں ہوتیں کیوں ؟

صرف اس لئے کہ شاہزادہ نیلوفر جس کے عشق میں وہ برسوں سے مبتلا تھی کسی اور سے محبت کرنے لگا ہے —— ٹھیک اسی وقت ایک غریب کسان کی بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر قصر کے سامنے سے یہ کہتی ہوئی گذر جاتی ہے کہ —— "ملکہ نسریں بھی کیسی خوش نصیب عورت ہے، کاش میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتی۔

حقیقتوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور پردوں کے نقش و نگار کو حقیقت باور کیا جاتا ہے —— یہ ہے انسانی تمناؤں کی ذہانت اور یہ ہے ہماری آرزوؤں کی انتہائی فراست —— ایک غریب تمنا کرتا ہے کاش وہ دولتمند ہوتا، ایک دولتمند اپنے بہت سے روحانی آزار دور کرنے کے لئے غریب ہونے کی آرزو کرتا ہے، ایک فقیر بادشاہ کی جاہ و ثروت کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور ایک بادشاہ اس آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے جو

عیش یا مسرّت

فرمانروائے خلد آباد کا خزانہ لعل و گہر سے مالا مال ہے اس کی حکومت لاکھوں مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے لطف و تفریح کے جتنے اسباب دولت سے فراہم ہو سکتے ہیں وہ سب مہیا ہیں۔ اسی کے ساتھ دولت حسن بھی موجود ہے، دولت شباب کی بھی کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس سے زیادہ مسرور اور کون ہو سکتا ہے لیکن دفعتہً قصر کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے، طبیبوں کے چہرے سے سخت فکر کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں کیونکہ بادشاہ جو ایک زمانہ سے بیمار ہے دفعتاً نہایت شدید قسم کے درد قلب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی —— بادشاہ تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کوئی میری سلطنت لے لے، میری تمام دولت پر قبضہ کر لے لیکن اس عذاب سے لمحہ بھر کے لئے کسی طرح نجات دلا دے —— ایک غریب لکڑہارا باہر قصر کے پاس سے گذرتا ہوا دل ہی دل میں کہتا ہے کہ "دولت بھی کیا چیز ہے، کاش مجھے بھی حاصل ہوتی اور میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتا جیسی بادشاہ بسر کر رہا ہے۔

ملکۂ نسرین جو دولت کے لحاظ سے پھولوں کی رانی مشہور ہے، اپنے پاس کیا کچھ نہیں رکھتی۔ وہ ہمیشہ مخمل و حریر کی نرمی میں سوتی اور لعل و الماس کی روشنی میں بیدار ہوتی۔

فقیر کو حاصل ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان عیش کا خواہشمند ہے یا مسرت کا کیونکہ سامانِ عیش سامان مسرت نہیں، اسباب مسرت اسباب عیش نہیں۔ بہتر اکثر ایسے ہیں جو عیش کو مسرت جان کر اسی کی تمنا کرتے ہیں اور کمتر ایسے ہیں جو صرف مسرت کے طلبگار ہیں اور عیش کے خواہشمند نہیں۔

عیش نام ہے جسم کی آسائش کا اور خواہش ظاہری کی لذت کا۔ مسرت نام ہے نفس کے اطمینان اور روح کی راحت کا ——— پھر یہ تو ٹھیک ہے کہ اسباب عیش حاصل ہونے کے بعد انسان مسرتِ روح کے لئے تڑپتا رہے لیکن راحت روح سے آشنا ہونے کے بعد سامانِ عیش کی جستجو کرنا کیا معنی؟

اس وقت جبکہ دنیا میں مادہ روح سے برسرپیکار ہے، عیش کی خواہش مسرت کے صحیح مفہوم کو دنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے یعنی اس وقت جبکہ زر و دولت کی محبت نے دنیا کے اقتصادی و معاشی وسائل کو یکسر آئین درندگی بنا رکھا ہے کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے اور جس عمیق غار کی طرف "انسانیت" کو دھکیلا جا رہا ہے اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے یا نہیں؟

امریکہ بیتاب ہے کہ ساری دنیا کی دولت اس کے قبضہ میں آ جائے، فرانس مضطرب ہے کہ جرمنی پر اس کا تسلط قائم ہو جائے، جرمنی بیقرار ہے کہ فرانس کو فنا کر دے، اٹلی بے چین ہے کہ روما کی قدیم سطوت استبداد کو پھر زندہ کر دے، جاپان کوشش کر رہا ہے کہ وہ ایشیا کو محکوم بنائے ——— لیکن کیا کوئی ایسی قوم بھی ہے جس نے جغرافی و ملکی امتیاز کو مٹا کر صرف "انسانیت" کی خدمت کو اپنا مقصود قرار دیا ہو؟

یہ ہے مادی ترقی کا وہ پہلو جس پر آج فخر کیا جاتا ہے اور یہ ہے علم و حکمت کی کاوشوں کا وہ منظر جسے انسان کا منتہائے نظر قرار دیتے ہیں ——— پھر آج تو نہیں کل وہ وقت آئیگا

جب انسانیت کا خون آلود چہرہ لوگوں کی نگاہ سے اس حجاب کو دُور کرے گا اور بتائیگا کہ عیش کی راہیں مسرت کی راہوں سے بالکل مختلف ہیں اور وہ جسم جو ہر وقت پھولوں پر لوٹتے رہتے ہیں اُن کے لئے آخرکار پنکھڑیاں بھی خار ہو جایا کرتی ہیں۔

یقیناً حصولِ مسرت حصولِ عیش کا منافی نہیں بشرطیکہ عیش انفرادی حیثیت نہ اختیار کر جائے لیکن انسان کی اس خود غرضی کو مٹانے والا کون ہو سکتا ہے؟ کیا وہ انسانی قانون جو صرف تیغ و تفنگ کی مدد سے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب قرار دیتا ہے؟ کیا مادی علوم و فنون کی ترقی جو سب سے زیادہ مہلک گیس تیار کر کے انسان پر عرصۂ حیات تنگ کر دینا چاہتی ہے؟ کیا سرمایہ و دولت کا وہ نظامِ استعماری جو کمزور و ضعیف انسان کا صرف خون نچوڑ سکتا ہے؟ ——— نہیں ——— بلکہ صرف وہ بلند تعلیم جو تمام نوعِ انسان کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرنا چاہتی ہے، وہ نظامِ اخلاق جو رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹا کر جملہ افرادِ انسانی کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے، وہ اصولِ حیات جو اسپارٹا والوں کی طرح ضعیف و کمزور کو ہلاک کر دینے کا حامی نہیں ہے، وہ طریقِ ہدایت جو ترقی کا مفہوم زر و دولت کا انبار نہیں بلکہ صرف دنیا کا امن و سکون قرار دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایسی بلند تعلیم صرف ایک ہے، ایسا نظامِ اخلاق صرف ایک ہے، یہ اصولِ حیات صرف ایک مسلک نے بتایا، یہ طریقِ ہدایت صرف ایک مذہب نے پیش کی۔ لیکن اب اس تعلیم و مذہب کی جستجو کہاں کی جائے۔ کتابوں میں؟ مگر عمل کو کتابوں سے کیا تعلق ——— ان افسانوں میں جواب موجود نہیں ہیں؟ مگر اس سے نتیجہ ——— ! ان مدعیانِ بلند بانگ کی زندگی میں جو اس وقت موجود ہیں ——— ہاں مگر اس لئے نہیں کہ اُن سے کوئی درس حاصل کیا جائے بلکہ صرف اس لئے کہ اس تعلیم پر آنسو بہایا جائے جس کے یہ علمبردار ہیں اور اس مذہب کے جنازے پر ماتم کیا جائے جس کو دفن کرنے کیلئے یہ نہایت تیزی سے اپنے شانوں پر اُٹھائے لئے جا رہے ہیں۔

خدا مذہبیت کے زاویۂ نگاہ سے

جتنے مذاہب اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان سب کے معتقدات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "خدا سے ڈرنا چاہئے" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے آخر اس تعلیم کو مان کیوں لیا، اس درس میں کون سی ایسی بات تھی جس نے اس قدر مضبوطی کے ساتھ اسے خدا کی طرف سے خائف بنا دیا۔

اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ اول اول انسان نے جب اس دنیا میں قدم رکھا تو چاروں طرف دشمن ہی دشمن اس کا احاطہ کئے ہوئے تھے اور صحرا کے خونخوار درندوں سے ہر وقت مقابلہ رہتا تھا۔ پھر چونکہ فطرت کی طرف سے اس کو قوت جسمانی کے مقابلہ میں قوت دماغی بھی عطا ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنی تدابیر سے ان دشمنوں سے جنگ کرتا تھا اور اکثر بیشتر کامیاب بھی ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سے ڈرتا تو ضرور تھا لیکن ان کی پرستش پر مجبور نہ ہوا تھا کیونکہ پرستش نام ہے انتہائی کامل کا پورے اضطرار و عجز کے ساتھ سپر ڈال دینے کا اور درندوں کے مقابلہ میں اس حد تک اس کی توہین نہ ہوتی تھی۔ لیکن انسانوں کا ایک شدید دشمن اور بھی موجود تھا جسے ہم "حوادث طبیعی" کہتے ہیں، یعنی وہ دیکھتا تھا کہ دفعتاً افق سے نہایت ہی گہرا سیاہ بادل اٹھتا ہے اور آناً فاناً اس کے جھونپڑے کو بہا لے جاتا ہے۔ وہ تھکا

سے واپس آتا ہے اور اچانک اس کا بدن آگ کی طرح جلنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے۔ وہ کھیتیاں کرتا ہے لیکن بارش نہ ہونے سے وہ سب کی سب ——— خشک و تباہ ہو جاتی ہیں۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ باوجود تمام اسباب ظاہری فراہم کرنے کے بعض اوقات نتیجہ حسب دلخواہ حاصل نہیں ہوتا، وہ حیران رہ جاتا تھا کیونکہ اس "رجم عن الغیب" کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا اور وہ ان تمام باتوں کو ان بڑی بڑی روحوں کا کرشمہ خیال کرتا تھا جو اس کے نزدیک آسمان میں رہتی تھیں، چنانچہ وہ ان کے خوش کرنے کے لئے قربانیاں کرتا تھا، روتا تھا، گڑگڑاتا تھا تاکہ اس کی امیدیں پامال نہ ہوں ——— یہ تھی اولین بنیاد مذہب کی جو سب سے پہلے ارواح پرستی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ پھر جب انسان پر کچھ زمانہ اور گزر گیا تو اس نے اپنے خیال کے مطابق ان ارواح کی صورتیں بھی قائم کیں اور بت بنا بنا کر پوجنا شروع کیا۔ یہ تھا دوسرا دور مذہبیت کا لیکن اس کے بعد جب انسان میں زیادہ معقولیت پیدا ہوئی تو اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خدا کو ایک "قوتِ مجردہ" قرار دے کر یزداں پرستی شروع کی جو یقیناً مذہب کی نہایت اچھی ارتقائی صورت ہے، لیکن جو تصور اس نے خدا کی عظمت و جلالت ہیبت و سطوت کا پہلے قائم کر لیا تھا وہ علیٰ حالہ باقی رہا۔

الغرض خدا کی طرف جس چیز نے انسان کو مائل کیا وہ صرف حوادث طبیعی تھے لیکن کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ وہی چیز جس نے کسی وقت انسان سے خدا کے وجود کو تسلیم کرا لیا تھا، آج اسی کی بنا پر خدا سے انکار کیا جا رہا ہے اور جس تاثرِ بے چارگی نے اس کو ایک قوتِ برتر و اعلیٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا آج وہی اعتراف عجز و بے کسی اس قوت کے انکار پر مائل کر رہا ہے۔ پھر اگر انسان کا یہ میلان واقعی سرکشی ہے تو بہت بڑی سرکشی ہے اور اگر کسی حقیقت کا انکشاف ہے تو بڑی حقیقت کا انکشاف ہے۔

خدا کا وجود ثابت کرنے کے لئے یوں تو بڑے بڑے دلائل پیش کئے جاتے ہیں لیکن اس سے انکار کرنے والے، اس کو نہ ماننے والے کیا کہتے ہیں۔ آئیے آج کی صحبت میں

اس پر مختصر سی گفتگو کریں۔

منکرین خدا کے خیالات

(۱) کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمام چیزیں پیدا کیں اور وہی ان سب کا رکھوالا ہے (مدبر السماوات والارض) اس لئے مخلوق کو اس کا شکر گزار و مطیع ہونا چاہیئے اور اسی اظہار شکر و اطاعت کا دوسرا نام مذہبیت ہے جو تمام اقوام عالم میں رائج ہے۔

(۲) ہزاروں لاکھوں سال تک یہ عقیدہ قائم رہا کہ خدا قربانیاں چاہتا ہے اور ان قربانیوں کے عوض وہ مینہ برساتا ہے، کھیتیاں اگاتا ہے اگر قربانیاں نہ کی جائیں تو پھر وہ قحط، وبا، طوفان و زلزلہ بھیج کر اپنے غصہ کا اظہار کرتا ہے۔

(۳) اس وقت تک تمام مذہبی اقوام کا عقیدہ راسخ یہی ہے کہ خدا التجاؤں، دعاؤں کو سنتا ہے اور پورا کرتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی کہ وہ ایمان لانے والوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور ان کی روحوں کو عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہ ہے گویا اصل روح مذاہبِ عالم کی تعلیمات کی۔

اب ان تعلیمات کو سامنے رکھ کر ایک منکر خدا، ایک منکر مذہب سوال کرتا ہے کہ

۱۔ کیا مذہب کی بنیاد حقائق مسلمہ پر مبنی ہے؟ کیا واقعی خدا کوئی چیز ہے؟ اور اس نے ہمیں تمہیں پیدا کیا ہے؟ کیا حقیقتاً وہ دعاؤں کو قبول کر لیتا ہے اور قربانیوں سے خوش ہوتا ہے۔

۲۔ پھر اگر واقعی خدا ہی نوع انسان کا پیدا کرنے والا ہے تو اس نے کوڑھی، اپاہج، دیوانے، فاتر العقل لوگ کیوں پیدا کئے، مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کی تخلیق کیوں کی۔ اور کیا کوئی ایسی قوت جو ہر نوع مکمل، ارفع و اعلیٰ ہو، اس سے ایسی ناقص مثالیں تخلیق کی ظاہر ہو سکتی ہیں۔

اگر خدا تمام نظامِ عالم اور دُنیا کے جملہ کاروبار کا سنبھالنے والا ہے یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ ایک ذرّہ بھی بغیر اس کی مرضی کے حرکت میں نہیں آسکتا تو کیا وہ نیرو اور چنگیز کی تخلیق کا ذمّہ دار نہیں اور کیا وہ تمام انسانی لڑائیاں جن میں لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون پانی کی طرح بہہ جاتا ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے ہو جاتی ہیں؟ کیا وہ اس کا ذمّہ دار نہیں کہ اس کی مخلوق کا بڑا حصّہ صدیوں تک غلامی کے بوجھ سے دبا ہوا کراہتا رہا اور کوڑوں کی مار اس کی پیٹھ سے خون کے فوارے بلند کرتی رہی۔ اور کیا خدا کا مُدبّر بالامر ہونا اس امر کی اجازت دے سکتا تھا کہ ماؤں کی گود سے اُن کے شیر خوار بچّے چھین کر فروخت کر دیئے جائیں اور وہ تڑپنے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دی جائیں۔

کیا اہلِ مذاہب نے جو نوعِ انسانی کے ساتھ مظالم روا رکھے ہیں وہ خدا کی مرضی کے خلاف تھے اور کیا خدا اس کو گوارا کر سکتا تھا کہ ان کا نام لے کے لوگوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دی جائیں۔ ان کو زندہ جلا دیا جائے اور خاردار چھیوں میں دبا کر ان کے جسم کا ریشہ ریشہ علیحدہ کر دیا جائے۔

کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ایک ظالم و کمینہ انسان دوسرے شریف و نیک انسان کو پامال کر دے۔ اور کیا محبانِ وطن کے ساتھ دار و رسن کے معاملہ کے علاوہ کوئی اور معاملہ پسند نہیں کرتا۔

اگر واقعی خدا نظامِ عالم کا ذمّہ دار ہے تو:۔

۱۔ طوفان و زلزلہ اور قحط و وبا کے مصائب لانے سے کیا فائدہ اس نے سوچا ہے؟

۲۔ خونخوار درندوں اور زہریلے کیڑوں کی تخلیق سے کیا نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے۔

۳۔ ناحق وحشیوں کو دُنیا میں کیوں پیدا کیا؟ کیا شیرؔ اس لئے تو پیدا نہیں کیا گیا

وہ غریب ہرنوں کو ہلاک کرتا پھرے، کیا عقاب کی چونچ اس لئے نکیلی بنائی کہ وہ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔

۴۔ کیا مہلک بیماریوں کے لاتعداد جراثیم اسی لئے پیدا کئے گئے کہ وہ انسانوں کو ہلاک کرتے رہیں اور کیا خدا کے لئے مناسب تھا کہ سل و دق کے جراثیم کی غذا انسانی پھیپھڑے کو قرار دے۔

اِن واقعات پر غور کرنے کے بعد لازماً ہم جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں وہ صرف یہ کہ مذہب نام ہے صرف بے بنیاد خوف کا جسے خود انسان کے واہمہ نے پیدا کیا۔ یہی خوف ہے جو اس سے معابد و قربان گاہ کی تعمیر کراتا ہے اور یہی ڈر ہے جو اُسے دوزانو کرکے اس کے جسم پر کپکپی طاری کر دیتا ہے (جس کا دوسرا نام طاعت و عبادت ہے) پھر ظاہر ہے کہ جو تعلیم صرف جذبۂ خوف و ڈر اس کی پیدا کرنے والی ہوگی وہ کبھی بنی نوعِ انسان کی ترقی کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مذہب نام ہے اُس غلامانہ ذہنیت کا جسے صرف خوف و بزدلی یاس و بے چارگی اور غربت و مسکنت پیدا کرتی ہے اور جو جرأت و ہمت کے اُن جذبات سے جن پر تمام ترقیوں کا انحصار ہے انسان کو محروم کر دیتی ہے، مانا کہ خدا سب سے بڑا آقا ہے اور انسان اس کا سب سے حقیر غلام لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غلامی خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو خوشگوار چیز ہو سکتی ہے؟ آقا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا!—

اچھا اب اور آگے چلئے!

اگر خدا کا وجود مان بھی لیا جائے تو یہ بات کیونکر ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ رحیم و کریم بھی ہے، محبت و شفقت والا بھی ہے۔ لاکھوں بندگانِ خدا ایسے ہیں جو دوپہر کی گرمی میں ہل چلا رہے ہیں سر کا پسینہ ایڑی تک بہہ رہا ہے جسم تھکن سے چور چور ہے اور وہ ان

تکالیف کو صرف اس لئے برداشت کر رہے ہیں کہ جب ان کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی تو ان تمام مصائب کا نعم البدل مل جائے گا، لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ تکمیل آرزو کا زمانہ آتا ہے آسمان کو دیکھتے دیکھتے اُن کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور بارش کا ایک قطرہ ان کی خشک کھیتیوں پر نہیں گرتا یا یہ کہ طوفانی بادل اُٹھتا ہے اور ان کی تمام محنتوں کو چشم زدن میں بہا لے جاتا ہے ــــ یہ کیا نظام ہے؟ کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ ہزاروں بے گناہ انسان بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہو کر فنا ہو جائیں، لاکھوں معصوم بچے اپنی ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لپٹ کر تڑپتے اور بلکتے رہیں۔ اگر غریب کسانوں پر یہ عذاب اُن کے کسی گناہ کی پاداش میں ڈالا گیا تو ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا جو دودھ کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترسا ترسا کر یوں ہلاک کر دیئے گئے۔

حادثہ باد سموم کو دیکھو جو ہزاروں میں گاؤں کے گاؤں تباہ کر جاتی ہے زلزلہ کی تباہ کاریوں پر غور کرو جو ہزاروں انسانوں کو زندہ نگل جاتی ہیں، کوہ آتش فشاں کا خیال کرو جو بستیوں کی بستیاں جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے، وبائی بیماریوں کو دیکھو جو لاکھوں کا ستھراؤ کر کے رکھ دیتی ہیں ــــ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا یہ تمام مصائب نازل نہ کرتا تو کیا بنی نوع انسان یہ خیال قائم کر لیتی کہ خدا اُن کی پروا نہیں کرتا اور کیا خدا کی شفقت و مہربانی صرف قحط و زلزلہ و باد گرسنگی ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔

ہم کو بتایا گیا ہے کہ تمام انسان یکساں عقل و دماغ کے پیدا نہیں کئے گئے، ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے لیکن کیا اس تفریق و امتیاز کا کوئی سبب بتایا جا سکتا ہے؟ ــــ اگر اچھی عقل رکھنے والی قوموں کو خدا کے اس عطیہ پر اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے تو کیا ادنیٰ درجہ کی قوموں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ صرف اس لئے کہ وہ جانور نہیں بنائے گئے۔

اگر خدا نے قوموں میں یہ امتیاز روا رکھا تھا تو یقیناً وہ اس سے بھی آگاہ ہوگا

کہ انھی قومیں ادنیٰ کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ ان کے لاکھوں افراد کو غلام بنا کر کوڑوں کی مار سے تڑپایا کریں گی، میدان کے میدان اُن کی لاشوں سے پاٹ دیں گی اور ہزاروں معصوم بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کریں گی۔ پھر اگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے خدا نے یہ امتیاز روا رکھا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اپنے خدا کو کون محبت و شفقت کرنے والا خدا کہے گا۔

وہ تنگ و تاریک قید خانے جہاں شریف الاخلاق انسان تڑپ تڑپ کر جانیں دیدیتے ہیں، وہ سولیاں جن پر ہمیشہ خدا کے نیک بندوں کا ہی خون بہایا جاتا ہے، وہ بے یار و مددگار غلام جن کے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں، وہ بہت سے خدا کا نام بلند کرنے والے جن کا جسم شکنجوں میں دبا کر پیس ڈالا جاتا ہے، وہ بہت سی دکھیاری مائیں جن کی گودیں تیغ و تفنگ کی قوت سے خالی کر دی جاتی ہیں، وہ بہت سے معصوم شیر خوار بچے جن کے نرم و نازک جسموں کو تلوار دو نیم کر دیتی ہے، وہ بے شمار فاقہ زدہ انسان جن کے جسم میں سوا پوست و استخوان کے کچھ نظر نہیں آتا، وہ مہلک امراض میں تڑپنے اور کراہنے والی لاتعداد انسانی مخلوق، وہ طوفان و سیلاب سے سیکڑوں تباہ ہو جانے والے گاؤں، وہ امساک باراں یا کثرتِ باری سے خشک و افسردہ ہو جانے والی کھیتیاں، وہ جابرانِ عالم جو ذبح کئے ہوئے ہزاروں انسانوں کے جسموں کا مینار بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں، وہ ظالم و سفاک سلاطین جن کا اپنی عیش کوشی پر قوم کی قوم کو قربان کر دینا ادنیٰ مشغلہ ہے۔ وہ بے شمار موذی جانور جن کے دانتوں سے دوسرے غریب جانوروں کا خون ہر وقت ٹپکتا رہتا ہے، وہ لاتعداد زہریلے سانپ جو ہلاکت پھیلانے کے لئے اپنے تالوؤں میں زہر کی تھیلیاں لئے ہوئے اِدھر اُدھر رینگتے پھرتے ہیں، وہ ہر جگہ ہر وقت قوی کا ضعیف کو پامال کرتے رہنا، وہ مکر کا صداقت پر، جھوٹ کا سچائی پر، بدی کا نیکی پر غالب آجانا —— یہ سب کیا ہے؟

کیا یہ سب کچھ اسی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے جسے رحیم و کریم کہتے ہیں، جو بڑا شفقت کرنے والا بتایا جاتا ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو مذہب کے بتائے ہوئے وجودِ خداوندی کو نہیں مانتے لیکن وہ ایک ایسی قوتِ برتر و اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں جو انسان کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ یہ قوت کیا ہے؟ آئیے اس پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈال لیں۔ انسان کی گزشتہ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ برابر ترقی کر رہا ہے اور اس کی ترقی نتیجہ ہے محض اس کے تجربات کا ——— ایک شخص سفر کر رہا ہے اور دورانِ سفر میں وہ ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں دو راستے علیحدہ علیحدہ پھوٹتے ہیں وہ قیاس سے کام لے کر ایک راستہ کو اختیار کرتا ہے لیکن جب وہ اس غلطی سے آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر واپس آتا ہے اور دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے جو اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

ایک بچہ شعلہ کی رنگینی کو دیکھ کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن جب اس کا ہاتھ جلنے لگتا ہے تو ہٹا لیتا ہے اور پھر کبھی اس کی جرأت نہیں کرتا ——— اس قسم کی ہزاروں مثالیں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی تجربہ ہی وہ قوت ہے جو اس کی رہنمائی کرتی رہتی ہے اور یہ قوت ضمیرِ انسانی سے متعلق ہے نہ خدا کی، مہربانی سے، نہ وہ کسی ارادہ کی مالک ہے نہ کسی مقصود کی متمنی بلکہ وہ محض نتیجہ ہے انسانی تجربات کا جسے واقعات و حادثات سے کسی طرح علیحدہ نہیں کر سکتے۔

اس لئے خدا کے وجود کو ایک ایسی قوت تسلیم کر لینا جس نے ہمارے اندر اخلاق کی حس ودیعت کر دی ہے، ضمیر کی شمع روشن کر دی ہے، درست نہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہم کو تلخ تجربوں کے بعد حاصل ہوتا ہے اور کسی دوسری قوت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور قبیلہ و خانوادہ کی زندگی بسر کرنے پر

ضعفاً مجبور ہے، پھر اگر کسی خاندان، قبیلہ یا قوم کے افراد اجتماعی مسرت کا باعث ہوا کرتے ہیں تو ان کی تعریف کی جاتی ہے ورنہ برائی اور یہی وہ چیز ہے جو ایک قوم کی زندگی اور اس کے تمدن کا مخصوص معیار مقرر کر دیتی ہے اور اس میں کوئی "مافوق العادت" بات نہیں پائی جاتی۔

فرض کیجئے کہ خدا موجود ہے جو غیر محدود و لاانتہا ہے، پھر ظاہر ہے کہ جو چیز غیر محدود ہوگی وہ کیف و کم سے بے نیاز ہوگی اور جو کیف و کم سے بے نیاز ہے وہ نفع و مضرت سے بلند ہے اس کو نہ کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی تاثر طاری ہو سکتا ہے، اس لئے اگر انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک غیر محدود خدا کو حمد و تعریف کی ضرورت ہوتی ہے یا وہ انسانی تعریف سے خوش ہوتا ہے تو اس کو سوا حماقت کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کیا نظام عالم کسی کی دعا سے بدل سکتا ہے، کیا ہم عبادت سے سمندر کے مد و جزر کو روک سکتے ہیں، کیا قربانیوں سے ہوا کا رخ بدلا جا سکتا ہے، کیا سربسجود ہو جانے سے کسی کو دولت مل سکتی ہے اور کیا الحاح و زاری سے کوئی بیمار اچھا ہو سکتا ہے؟

مذہب کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ نظام عالم کا کوئی مدبر ضرور ہے اور وہ مدبر یا مالک انسانی التجاؤں کو سنتا ہے، اپنے بندوں کو انعام و سزا دیتا ہے اور عبادت و تعریف سے خوش ہوتا ہے لیکن کیا یہ عقیدہ کسی واقعہ و حقیقت پر مبنی ہے، کیا کوئی ایسا نظریہ موجود ہے جو ہم کو ایسا باور کرنے پر مجبور کر دے، یقیناً نہیں ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے محض وہم و قیاس کا ظن و تخمین کا یا پھر ان مصالح کا جن کی بنا پر لوگوں کی تخویف یا تشویق ——— ضروری سمجھی گئی۔

اب اس کے مقابلہ میں لامذہب دہریہ کو دیکھئے کہ اس کا نظریہ کیا اور کیسا ہے، اور اس کے اعتقاد کی تعمیر کن چیزوں پر قائم ہے۔ پہلی چیز مادہ ہے جو ... مر نہیں، دوسری چیز قوت ہے اور یہ بھی فنا نہیں ہو سکتی، تیسری چیز یہ ہے کہ مادہ اور قوت دونوں جدا نہیں ہو سکتے یعنی نہ مادہ بغیر قوت کے پایا جا سکتا ہے نہ قوت بغیر مادہ کے اور چوتھا یہ ہے کہ جو چیز فنا

نہیں ہو سکتی وہ کبھی پیدا بھی نہیں ہوئی ——— اور اس طرح گویا یہ ثابت ہو گیا کہ مادہ اور قوت ازلی و ابدی چیزیں ہیں اور ان کا خالق کوئی نہیں۔ پھر جب کائنات کا وجود صرف مادہ و قوت کا ممنون ہے تو ظاہر ہے کہ خدا کے ماننے کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سلسلۂ تخلیق اسی طرح ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ اور انسان کی تخلیق بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے جس کا تعلق کسی خاص ارادۂ خداوندی سے نہیں ہے۔ جو کچھ ممکن تھا وہ قوت و مادہ کے امتزاج سے واقع ہوا۔ جو ممکن ہے وہ واقع ہو رہا ہے اور جو ممکن ہوگا وہ ظہور میں آئے گا ——— اجرام فلکی کی تخلیق، موسموں کا تغیر و تبدل، نباتات و حیوانات کا وجود، قوتِ ذہن و ادراک، اور تمام وہ باتیں، جو عالم کیف و کم سے تعلق رکھتی ہیں، سب نتیجہ ہیں مادہ کے فعل و انفعال کا اور اسی سے یہ تمام تنوع کائنات میں نظر آتا ہے اور ابدالآباد تک نظر آئے گا۔

ہزاروں سال سے نوع انسانی کی اصلاح کے لئے کوشش ہو رہی ہے اور اسی اصلاح کے لئے لوگوں نے خدا کا خیال پیدا کیا، مذہب کی بنیاد ڈالی، صحف الہامی پیش کئے دوزخ و جنت پر یقین دلایا، معابد تعمیر کئے۔ عبادتیں کرائیں لیکن اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ جس چیز کا وجود ہے یعنی مادہ کا وہ بالکل بے حس ہے۔ نہ اس کے سامنے کوئی تصور ہے نہ ارادہ، نہ تاثر ہے، نہ ادراک۔ بغیر قصد کے وہ پیدا کرتا ہے اور بغیر کسی وجہ کے ہلاک کر ڈالتا ہے۔

اس لئے اب سوال یہ ہے کہ نوع انسانی کی نجات کیونکر ممکن ہے یعنی اصلاح اخلاق و تمدن جسے مذاہب عالم اب تک پورا نہ کر سکے کیونکر تکمیل تک پہونچ سکتی ہے؟ اس کے جواب میں صرف سائنس کو پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ سے مادہ پر فتح پا سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ہم پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ نیک کام خود آپ اپنی جزا ہے اور برا کام آپ اپنی سزا۔

یہاں تک کہ جو کچھ بیان کیا گیا وہ خلاصہ ہے ان لوگوں کے خیالات کا جو خدا اور مذہب کے قائل نہیں ہیں۔ اب آپ اس پر ایک بسیط تبصرہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کوئی

حقیقت پائی جاتی ہے یا نہیں۔

جس حد تک دلائل کا تعلق ہے خدا کے اثبات و انکار کا مسئلہ اتنا اُلجھا ہوا ہے کہ شاید ہی انسان کبھی اس گتھی کو سلجھا سکے۔ اس شخص سے جو خدا کا ماننے والا ہے دریافت کیجئے کہ وہ کن دلائل کی بنا پر خدا کے وجود کا قائل ہوا ہے تو وہ سوا اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اتنا بڑا عالم بغیر کسی صانع کے آپ ہی آپ کیوں کر وجود میں آسکتا ہے۔ بظاہر یہ دلیل اتنی صاف و صریح اتنی روشن و واضح ہے کہ اس میں چون و چرا کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن ایک منکرِ خدا سوال کرتا ہے کہ جب بغیر وجود صانع کے کائنات کا پایا جانا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو خدا کا آپ ہی آپ ظہور میں آجانا کس طرح سمجھ میں آجاتا ہے تو اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا جاسکتا اور عقلِ انسانی گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

اسی طرح جب منکرِ خدا سے پوچھا جاتا ہے کہ مادہ اور قوت کیونکر وجود میں آئے تو وہ جواب دیتا ہے کہ از خود پیدا ہو گئے۔ اور جب اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "خدا کا از خود پیدا ہو جانا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آتا لیکن مادہ و قوت کا آپ ہی آپ ظہور میں آجانا سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ کیا بات ہے" تو وہ بھی گھبرا جاتا ہے اور اس کے پاس بھی اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہوتا۔

الغرض وہ خدا ہو یا مادہ، آپ ہی آپ پیدا ہو جانا ہم کو اس قدر عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک انسان خود تو آنکھ بند کرکے بغیر کسی دلیل و حجت کے شاید مان بھی لے اگر اس کا ضمیر اس یقین کی طرف رہبری کرتا ہے لیکن کسی ایسے شخص کو باور کرانا جو ہم سے منطقی وارذانی دلیل کا طلبگار ہو بالکل محال ہے۔

اس لئے جس حد تک دلائل عقلی کا تعلق ہے اس مسئلہ کی نوعیت صرف یہ قرار پاتی ہے کہ اگر آپ ہی آپ کسی چیز کا ظہور میں آنا سمجھ میں آسکتا ہے تو خدا اور مادہ دونوں پر منطبق ہو سکتا ہے ورنہ ایک پر بھی نہیں ——— اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس باب میں دونوں جماعتیں اس درجہ کمزور واقع ہوئی ہیں اور بلحاظ وجودِ خدا اور مادہ

دونوں ایک حیثیت کی مانی جاتی ہیں تو خدا کے ماننے والے کیوں مادہ کی قدامت پر ایمان نہیں لے آتے یا مادہ پرست جماعت کیوں خدا کے ماننے سے احتراز کرتی ہے۔

اس کا جواب اہل مذاہب کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اگر خدا کو چھوڑ کر صرف مادہ کی قدامت پر ایمان لایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان کو اخلاقی لحاظ سے بالکل زندہ بنا دیا جائے اور وہ کسی قوت برتر و اعلیٰ کے خوف باز پرس سے مطمئن ہو کر جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ ایک ملحد و منکر کہتا ہے کہ اگر خدا کا ماننا انسان کی درستی اخلاق و اصلاح تمدن کو مستلزم ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوا اور اگر خدا واقعی قادر مطلق ہے تو اس نے کیوں اس وقت تک تمام بربادیوں، ہلاکتوں، مصیبتوں اور برخبانیوں کو روا رکھا۔ اس کا جواب اہل مذاہب زیادہ سے زیادہ یہی دے سکتے ہیں کہ وہ مالک و مختار ہے اور اپنے مصالح کو وہی خوب جانتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ فریق مخالف کو اس جواب سے تسکین نہیں ہو سکتی اور اس طرح گویا دونوں فریق ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

منکرین خدا کی جماعت تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ پکا منکر و ملحد گروہ ہے جو انتہائی یقین کے ساتھ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے مثلاً فیور بیش Feuer Bach جو کہتا ہے کہ "خدا رات یا دن کی طرح واضح اور آفتاب کی طرح روشن نہیں" یا فلورنس Flourence جس نے ایک جگہ صاف صاف لکھ دیا کہ "خدا کے وجود کا خیال نوع انسانی کے ساتھ سخت دشمنی ہے"۔

——— دوسرا گروہ مشرکین کا ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں اور یہ ارتیابیت اس کی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ تیسرا گروہ نادرین کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کے وجود کا جو ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ مفید علم و یقین نہیں۔

اول الذکر گروہ تو خارج از بحث ہے کیونکہ انکار محض کا ثبوت آج تک نہ کوئی دے سکا ہے

دے سکتا ہے علاوہ اس کے جب تک تمام کائنات اور اس کے موجودات کا استقصار نہ کر لیا جائے کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے وجود کی کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی، بالکل ممکن ہے کہ مادہ کی قدامت پر ایمان لانے والے اب آیندہ کوئی ایسی دلیل پا سکیں جو ان کے نظریہ کو بدل دینے والی ہو اور وہ مادّہ و قوّت کی ازلیت و ابدیت سے انکار کرنے پر مجبور رہوں۔ موخرالذکر باتی دو جماعتیں ضرور قابل لحاظ ہیں، اور اس وقت مغرب کا بڑا حصّہ انھیں دو میں سے کسی ایک خیال کا موید ہے۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ اہل مذہب یا خدا کے ماننے والے ان کے تذبذب کو دُور کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کیونکر۔ ؟

جواب کی فقط ہر دو ہی صورتیں ہوا کرتی ہیں، یا تو کوئی شخص اپنے دعوے کو دلیل و برہان کر ثابت کر دے یا مخالف پر بھی اسی قسم کا اعتراض کر دے۔ اوّل الذکر صورت جواب کی اثباتی ہے جو یقیناً بہترین صورت دوسرے کو قائل کرنے کی ہوا کرتی ہے لیکن دوسری صورت جواب کی الزامی ہے جو مخاطب کو خاموش تو کر سکتی ہے لیکن مطمئن نہیں کر سکتی۔

یقیناً ہم ایک منکر خدا کے مقابلہ میں کوئی ایسا بدیہی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتے جو اُسے وجود باری کے یقین پر مجبور کر دے لیکن اگر ہم خود اسی کے نظریوں سے یہ ثابت کر سکیں کہ وہ باوجود انکار خدا کے کسی نہ کسی طرح خدا کا قائل ہے تو شاید ایک حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آپ کسی بڑے سے بڑے منکر خدا سے سوال کیجئے کہ کیا اس کا خدا سے انکار کرنا اس بنا پر ہے کہ وہ خدا سے نفرت کرتا ہے یعنی اگر واقعی کسی خدا کا وجود ہو تو وہ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، ظاہر ہے کہ اس کا جواب وہ نفی میں دے گا کیونکہ نفرت و استکراہ کی کوئی وجہ موجود نہیں اس لئے خدا سے انکار کرنے کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے وجود کی دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔ یا یہ کہ اس کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ ایک چیز اپنے آپ کیونکر پیدا ہو گئی لیکن اسی کے ساتھ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ وہ خدا سے انکار کرنے کے باوجود خدا ہی کی طرح ایک دوسری چیز مادہ کے از خود پیدا ہونے کا بھی قائل ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ حقیقی معنیٰ میں منکر خدا تو کوئی نہیں ہے بلکہ خدا کو جس مفہوم میں پیش کیا جاتا ہے وہ بعض کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کو تسلیم نہ کرکے وہ دوسرے نام اور دوسرے مفہوم کے ساتھ خدا کو پیش کرتے ہیں اس لئے حقیقتاً دنیا میں یہ اختلاف خدا کے وجود یا عدم وجود میں نہیں ہے بلکہ صرف اس تعبیر یا اس مفہوم میں ہے جو خدا کے تصور سے متعلق ہے یعنی ایک اگر اس کا تصور اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ وجود میں آیا ہے، قادر مطلق ہے، خلاق عالم ہے، ہر وقت ہر آن اختیار کامل کے ساتھ بنانے بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے، نیکی پر انعام دیتا ہے، برائی پر سرزنش کرتا ہے، اس سے بازپرس نہیں کی جا سکتی وغیرہ وغیرہ تو دوسرا بھی جو بجائے خدا کے مادہ و قوت کا ماننے والا ہے کم و بیش اسی خیال کا مؤید ہے کیونکہ وہ بھی مادہ کو از خود پیدا ہو جانے والا تسلیم کرتا ہے، اسی کو تخلیق عالم کا سبب قرار دیتا ہے، اسی کی مختلف کیفیات کو، وہ اشیا کے بننے بگڑنے سے تعبیر کرتا ہے پھر بھی اگر کوئی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ ایک اپنے خدا کو ارادہ کا مالک سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں یعنی ایک کا خدا اگر جاننے بوجھنے والا ہے، سمیع و بصیر ہے تو دوسرے کا ایسا نہیں ہے لیکن اگر ہم اہل مذہب میں سے اس جماعت کے اعتقاد کو اپنے سامنے رکھیں جو مقادیر الٰہیہ میں تغیر و تبدل کا قائل نہیں ہے تو یہ فرق بھی دور ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ایک مقدرات کو بدلنے کی قدرت رکھنے کے باوجود نہیں بدلتا[1] تو دوسرا بدل نہیں سکتا اور ان دونوں کا نتیجہ وہی ایک نکلتا ہے۔

اب رہ گیا سوال انعام و سرزنش کا سو میری رائے میں یہاں بھی باہم کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھانا چاہتا ہوں۔

اہل مذاہب کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت کرو کہ نجات اسی سے متعلق ہے، مادئین کہتے ہیں کہ علم حاصل کرو کیونکہ ترقی اسی سے وابستہ ہے اس لئے اب مقابلہ ہوا درمیان عبادت و علم کے اور نجات و ترقی کے۔ پھر آئیے غور کریں کہ کیا ان دونوں میں واقعی کوئی

---

[1] لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

اصولی تضاد پایا جاتا ہے، یا صرف تعبیرات کا اختلاف ہے۔

اگر آپ عبادت کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ خدا کی محض ظاہری پرستش یعنی خاص مراسم و حرکات کی پابندی کبھی کسی مذہب کا مقصود حقیقی نہیں رہا ہے کیونکہ خدا کو بے نیاز مطلق سمجھنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خدا کو نہ عبادت سے کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ ترک عبادت سے کوئی نقصان، اس لئے ظاہر ہے کہ عبادت کا مقصود اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ہمیں کو اس سے فائدہ پہونچے اور یہ فائدہ اُسی وقت مترتب ہو سکتا ہے جب عبادت سے خود ہمارے اندر کوئی ذہنی تبدیلی ہو اور ذہنی تبدیلی سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اپنی اس اہلیت کو بروئے کار لائیں جو مظاہر قدرت اور نوامیس فطرت سے استفادہ کا باعث ہوا کرتی ہے اس لئے آپ دیکھیں گے کہ عبادت کے ساتھ ہی ساتھ اچھے کام کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے اور غور و فکر تدبر و تعقل کا بھی حکم دیا گیا ہے، تاریخ مذاہب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو صورت عبادت کی متعین کی گئی وہ نوامیس طبعی سے متعلق تھی اور مظاہر قدرت ہی پر غور کرنے کا دوسرا نام عبادت تھا۔ چنانچہ آفتاب کی پرستش، آگ کی پوجا، دریا کا احترام اور اسی طرح کے اور بہت سے معتقدات اسی لئے پیدا ہو گئے اور اب تک بعض قوموں میں پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ آفتاب کی پرستش سے مقصود صرف اس امر کا اعتراف تھا کہ وہ نہ صرف انسانی زندگی بلکہ انسانی ترقی کے لئے کس درجہ ضروری چیز ہے اور اسی طرح آگ اور دریاؤں کی پوجا سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ کارِ حیات انسانی میں کیسے زبردست ممد و معاون ہیں اس کو سالہاسال کے تجربوں نے بتا دیا تھا کہ اگر سورج نہ ہو تو کھیتیاں بارآور نہیں ہو سکتیں، اگر دریا اور چشمے نہ ہوں تو امساکِ باراں کے وقت نہ زراعت کی آبپاشی ہو سکتی ہے نہ مویشیوں کو پانی میسر آ سکتا ہے، اسی طرح وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آگ کتنی اہم و ضروری چیز ہے، الغرض مظاہر قدرت کی پرستش

بھی اسی اصول فطرت کے تحت جاری ہوئی کہ انسان کو ان کا علم حاصل کرکے اپنی ترقی میں کام لینا تھا

اب اس کے بعد آپ اس زمانہ کو لیجئے جب انسان آہستہ آہستہ ترقی کرکے پختگی عقل و دماغ کو پہونچا، اور اس نے خدا کا ایک بلند مفہوم پیش کرکے پرستش قرار دیا تفکر وتدبر کو جو تمام کائنات کو محیط تھا اور انسان کی عظیم الشان اہلیت کو جس کا دوسرا نام خلافت خداوندی تھا' وراثت الٰہی تھا اور جس کو صاف صاف کھول کر یوں کہہ دیا کہ "علم آدم الاسماء کلہا" [1] (یعنی آدمی کو ہم نے سب کچھ بتا دیا ہے) یہ بڑی زبردست پیشین گوئی تھی انسان کے دماغی ارتقا اور ذہنی استغناء کی' جو آخر کار پوری ہو کر رہی اور جس کا ثبوت عہد حاضر کے اختراعات سے بخوبی مل سکتا ہے۔

اس بیان سے غالباً یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ مادہ و قوت کے ماننے والے جس چیز کو علم و سائنس کہتے ہیں مذہب اس کو لفظ عبادت و پرستش سے تعبیر کرتا ہے یعنی اگر وہ کہتے ہیں کہ انسانی فلاح علمی جستجو پر منحصر ہے تو یہ بھی یہی کہتے ہیں کہ انسان کی نجات وابستہ ہے تفکر و تدبر سے اور مظاہر قدرت کے اس عمیق مطالعہ سے جو انتہائی انقیاد کی کیفیت انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے' البتہ نجات کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق وہاں آکر ضرور پیدا ہو جاتا ہے جہاں سوال تمام نوع انسان کی اجتماعیت کا ہے۔ اور مذہب قومیت کے تنگ مفہوم سے بلند تر "انسانیت" کا مفہوم پیش کرتا ہے۔

یقیناً جو مفہوم نجات کا ہے وہی ترقی کا ہے اور یہ سب کچھ اسی دنیا سے متعلق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان نے تمام موجودہ ترقیوں کے ساتھ اس مقصود کو حاصل کر لیا ہے جسے حقیقتاً نجات یا ترقی کہا جا سکتا ہے' غالباً نہیں۔ کیونکہ نجات یا ترقی کے مفہوم میں سب سے پہلے جو چیز ایک متمدن انسان کے سامنے آ سکتی ہے وہ دنیا کا امن و سکون ہے۔

---

[1] اسماء سے مراد یہاں چیزوں کے نام نہیں ہیں بلکہ تعینات فکر و دماغ مقصود ہیں۔

چونکہ جب تک یہ حاصل نہ ہو مادی یا ذہنی ترقی کی کوئی غایت متعین نہیں ہو سکتی اور دنیا کے امن و سکون کا جو حالت اس زمانہ میں ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں کہ ایک ہی قوم، ایک ہی مسلک و مشرب، ایک ہی ذوق و معاشرت والی جماعتوں میں کتنا اختلاف نظر آتا ہے اور بظاہر کوئی صورت اس کے دور ہونے کی نظر نہیں آتی۔

علمی ترقیاں بجائے اس کے کہ نوع انسانی کے تمام افراد کو کسی ایک مرکز پر لائیں آپس میں جنگ و جدال کی نئی نئی راہیں پیدا کر رہی ہیں اور خدا کی عطا کی ہوئی وہ ذہنیت جو رشتۂ اخوت و محبت استوار کرنے کے کام میں آنی چاہئے تھی۔ فساد و ہلاکت کی اشاعت میں صرف ہو رہی ہے اور اسی نقطہ پر پہنچ کر ہم کو مذہبی نجات اور دنیاوی ترقی کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ مذہب کہتا ہے انسانی نجات منحصر ہے پُرامن ترقی پر اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ نجات نام ہے صرف فراہمی زر و دولت کا۔ مذہب بتاتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت و خلوص کا برتاؤ کرو، ان کا کہنا ہے کہ دوسرے کی ہلاکت پر اپنا تفریحات تعمیر ہوتا ہے۔ مذہب کی ہدایت یہ ہے کہ رموز قدرت کی تحقیق کرو افادۂ عام کے لئے اور ان کا عمل یہ ہے کہ قوت ایجاد و اختراع صرف کرو بربادی و ویرانی پھیلانے کے لئے۔

یقیناً فن پرواز انسانی ترقی کا قابل فخر کارنامہ ہے لیکن کیا اس کے ذریعہ سے بم گرا کر خدا کی بے گناہ مخلوق کو ہلاک کرنا ترقی کی علامت قرار دیا جائے گا؟ عناصر کی تحقیق اور کیمیائی اختراعات کے افادہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن کیا اس سے زہریلی گیس پھیلا کر ہزاروں بندگان خدا کو موت کی آغوش میں دے دینا انسانی ترقی کہلائے گی۔ صنعت و تجارت کو ترقی دے کر مال و دولت حاصل کرنا یقیناً پسندیدہ امر ہے لیکن کیا جذبۂ مسابقت سے مغلوب ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو لوٹ لینے کی فکر میں رہنا اور مسئلہ زر کو اتنا پیچیدہ بنا دینا کہ خود انسانی دماغ بھی اس کو نہ سلجھا سکے، ترقی و فلاح کا باعث ہو سکتا ہے۔
الغرض اس وقت کی تمام اختراعات و ایجادات نے جملہ اقتصادی اور معاشرتی مسائل نے

ایک ایسا اضطراب دنیا میں پیدا کر دیا ہے کہ امن و سکون تو کجا' انسان کو جینا بھی دشوار ہو گیا ہے اور دنیاوی ترقی کا یہی وہ نقصان رساں پہلو ہے جس سے بچنے کے لئے خدا اور مذہب کا وجود ضروری ہے اور بقول والٹیر "اگر خدا نہیں ہے تو بھی ہمیں خدا پیدا کرنا پڑے گا"۔

منکرین خدا کا ایک زبردست اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر خدا رحیم و کریم ہے' شفقت و رافت والا ہے تو وہ طوفان و سیلاب سے' وبائی امراض سے کیوں لاکھوں بندگانِ خدا کو ہلاک کرڈالتا ہے' ایک ظالم کو ظلم کرنے کے لئے کیوں زندہ رکھتا ہے' دنیا میں محکومی و غلامی کو کیوں قائم رہنے دیتا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں'

یہ امر تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلم ہے کہ انسان نتیجہ ہے عالم خلق کی تدریجی ترقی کا اور اس کے ذہن و دماغ کا ارتقاء بھی اسی تدریج کا پابند رہا ہے اور رہے گا ——— فرض کیجئے کہ خدا ایک ایسا عالم پیدا کرتا جہاں سب کو ہر وقت راحت ہی راحت ہوتی خلش و اضطراب' خوف و اندیشہ کا نام نہ ہوتا' تو ظاہر ہے کہ ایک انسان اس جانور سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا جسے ایک جگہ پابند رکھ کر دونوں وقت بہترین غذا دی جاتی ہے اور کیا اس صورت میں خدا پر یہ اعتراض نہ ہوتا کہ انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

پھر جب انسان تدریجی ترقی کے لئے پیدا کیا گیا تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایسے ہی اسباب پیدا کرنا بھی ضروری تھے اور وہ اسباب سوا اس کے کچھ نہ ہو سکتے تھے کہ اس کی راہ میں موانع پیش کئے جائیں اور وہ ان کے دور کرنے کی تدبیریں سوچنے میں اپنے دماغ سے کام لیتا۔

اگر سیلاب نہ آتے تو انسان اپنی اور اپنی کھیتیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے بند اور پل وغیرہ کی تعمیر کیونکر معلوم کرتا۔ اگر امساک باراں نہ ہوتا تو اس کا دماغ چاہ و نہر کی تعمیر کی طرف کس طرح متوجہ ہو سکتا۔ اگر بیماریاں نہ ہوتیں تو ان سے بچنے کے لئے علم العقاقیر

وعلم الکیمیا کے وجود میں آنے کی کیا صورت تھی۔ اگر دنیا مستبد بادشاہ اور ظالم آقا سے خالی ہوتی تو آزادی و حریت کے جذبات کیونکر پیدا ہوتے۔ الغرض آپ عہد حاضر کی کسی بھی ذہنی ترقی کو لے لیجئے، وہ یقیناً نتیجہ ہوگی کسی نہ کسی ایسی کیفیت کا جو ناموافق حالات سے پیدا ہوئی تھی، اور اس لئے موجودہ ترقیاں ممنون ہیں صرف انھیں چیزوں کی جن کے پیدا کرنے کا الزام خدا پر قائم کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قدرت کے اس نظام میں تعمیر کے ساتھ تخریبی پہلو بھی شامل ہے یعنی پہلے تخریب ہے اور پھر تعمیر لیکن یہ بھی محض ہم اپنے تاثرات کے لحاظ سے کہتے ہیں ورنہ وہاں یہ بھی کوئی چیز نہیں، کیونکہ خدا جسے بے نیاز مطلق سمجھا جاتا ہے، عالم تاثر سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور جو اصول رحم و کرم کے ہم نے اپنے دنیاوی تعلقات کی بنا پر قائم کر لئے ہیں وہ اس پر منطبق نہیں ہو سکتے۔

اس بیان سے غالباً یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً مذہب و سائنس دونوں ایک چیز ہیں اور جو چیز مادیین کے نزدیک علم و ترقی سے تعبیر کی جاتی ہے وہی اہل مذہب کی زبان میں عبادت و نجات ہے البتہ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ منکرین خدا کی علمی ترقی میں اخلاق کو نظر انداز کر کے اس کی اجتماعی حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اہل مذہب اس ترقی میں اخلاق کو بھی شامل کرتے ہیں کہ بغیر اس کے نوع انسانی کی نجات یا دنیا کا امن و سکون کبھی حاصل نہیں ہو سکتا

بقائے روح و معاد

مسٹر عبدالمجید حیرت بی اے شملہ کے جواب میں

محترمی۔ السلام علیکم

(۱) آپ یہ باور نہیں کرتے کہ خدا (فعال لما یرید) ہے اور عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرے کی نگرانی کرتا ہے۔

(۲) آپ بقائے روح، حیات بعد الموت یا معاد کے قائل نہیں، بہر حال آپ اس کے تو قائل ہیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور فطری مذہب ہے پھر اگر یہ وہی اسلام ہے جسے قرآن مجید پیش کرتا ہے تو کیا آپ قرآن مجید سے نمبر (۱) و (۲) پر کوئی دلیل پیش کر سکیں گے۔

بقائے روح کے باب میں آپ غالباً مغرب کے تازہ انکشافات سے بے خبر نہ ہوں گے۔

میں آخرت کا قائل ہوں، اس لئے کہ

(۱) لفظ دنیا آخرت پر دلالت کرتا ہے۔

(۲) آخرت دنیا کے لئے انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کئے جانے کی تعلیم ہے۔ بجز جب یہ نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ

ہر طاعت کا ثواب اور گناہ کا عذاب ـــ یا آپ کے رنگ میں ہر طاعت کا واقعی عذاب اور ہر گناہ کا واقعی ثواب انسان کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس شک کو یقین سے بدلنے کے لئے ایک یوم آخرت تسلیم نہ کر لیا جائے۔

بلا اجر آخر آخرت پر جناب علی کرم اللہ وجہ کے اس منطقی استدلال کو دیکھئے جسے سن کر ایک یہودی حلقہ بگوش اسلام ہوا یعنی اگر اس دنیا کے بعد کچھ نہیں تو نیک و بد کی جزا و سزا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں لیکن اگر آخرت ایک امر واقعی ہے تو پھر نقصان میں کون رہتا ہے اور نفع میں کون۔

چنانچہ میں اگر آخرت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہوں تو اس میں کیا "حرج" ہے میں حیران ہوں کہ اس عقیدہ کے رکھنے والے پر نیچے اور جاتوں کی دُور دراز کا رشال کیونکر چسپاں ہو سکتی ہے۔

(نگار س) میرا یہ کہنا کہ "خدا ایک ایک چیز ایک ایک ذرہ کی نگرانی نہیں کرتا" صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر (IN DIVIDUALLY) کائنات کی ہر ہر چیز کے لئے اپنی قوت کو منقسم نہیں کرتا، بلکہ مجموعی طور پر تمام نظام عالم کے لئے چند اصول و ضوابط مقرر کر دیئے ہیں۔ اور انھیں کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

آپ کپڑا بننے کے کسی بڑے کارخانے میں ضرور کبھی نہ کبھی تشریف لے گئے ہوں گے اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ہزاروں "کرگھے" خود بخود چل رہے ہیں کپڑا بنتا جا رہا ہے۔ رولر اپنے کپڑے کو لپیٹ رہے ہیں۔ درآں حالیکہ وہاں کوئی انسانی ہاتھ موجود نہیں ـــ پھر یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کارخانہ کا انجینئر بجلی یا بھاپ کی مدد سے مشین کو حرکت دے کر عموی

طور پر ہر ہر کام کی نگرانی کر رہا ہے لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مشین کے ہر ہر پرزے کی جنبش، کرگھے کے ہر ہر تار کا اوپر نیچے ہونا، ایک ایک بنولے کا روئی سے علیحدہ ہونا، ایک ایک پنی کا تیار ہونا، ان سب پر انجنیر کی نگاہ ہے۔

پھر چونکہ انجنیر کے ہاتھ میں بھاپ یا بجلی کی وہ قوت موجود ہے جس سے تمام کام انجام پا رہے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام کارخانوں کا نگراں ہے لیکن یہ کہنا کہ کارخانہ کے ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی علیحدہ علیحدہ اس کی نگاہ ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

۲۔ بقائے روح اور معاد کے متعلق آپ کا مجھ سے مطالبہ ہے کہ اگر میں اسلام کو دنیا کا آخری فطری مذہب تسلیم کرتا ہوں تو مجھے قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہئیے کہ بقائے روح اور معاد دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے نمبر ا کا بھی ثبوت قرآن پاک سے طلب کیا ہے۔

میرے عزیز دوست آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ میں ان باتوں کا منکر ہوں یعنی میں آپ کے اس دعویٰ کو نہیں مانتا کہ خدا ہر ہر ذرّہ پر انفرادی طور سے نگرانی کرتا ہے اور اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ روح باقی رہتی ہے اور حیات بعد الممات کوئی چیز ہے —— اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اس دعویٰ پر دلیل پیش کرنا چاہئیے نہ کہ مجھے —— آپ جس سے بھی پوچھیں گے وہ بتا دے گا کہ ثبوت پیش کرنا اس شخص کا کام ہے جو کسی بات کا اقرار کرنا چاہتا ہو۔ منکر یا تو آپ کی دلیل سے قائل ہو کر آپ کا ہمنوا ہو جائے گا یا آپ کے دلائل کی کمزوری کو ثابت کر کے دوسرا ثبوت آپ سے چاہے گا، اس لئے براہ کرم پہلے آپ ہی مسلم مجھ پہ ثابت کیجئے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ درست ہے، پھر میں بتاؤں گا کہ آپ کے دلائل کن وجوہ کی بنا پر ناقابلِ تسلیم ہیں۔

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کے باب میں مغرب کے تازہ انکشافات سے

جتنا میں بے خبر نہ ہوں گا ——— یقیناً میں بے خبر نہیں ہوں اور نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مکر و فریب کا اتنا بڑا جال شاید ہی دُنیا میں کبھی پھیلایا گیا ہے ——— سائینٹیفک امریکن کی شائع کی ہوئی وہ رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو ایک کمیشن نے تمام بلاد یورپ کی سیاحت کرنے کے بعد مرتب کی تھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس وقت تک جتنے روحانیئین یورپ میں پائے جاتے ہیں ان میں سے ۹۰ فیصدی مکار و شعبدہ باز ہیں اور باقی دس فی صدی وہ ہیں جو اس فریب میں مبتلا ہونے کے بعد قصور فہم کی وجہ سے فریب کو حقیقت باور کرنے لگے ہیں۔

۲— آپ نے آخرت کے وجوب پر تین دلیلیں پیش کی ہیں اور معاف فرمایئے اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو فریق ثانی کو قائل کر سکے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ لفظ دنیا، آخرت پر دلالت کرتا ہے اس لئے آخرت کا ماننا ضروری ہے ——— لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ لفظ دنیا کا وہ مفہوم جو آخرت پر دلالت کرتا ہے کس کا متعین کیا ہوا ہے۔ کیا آپ ہی اس کے واضع اور آپ ہی اس کے مفسر نہیں ——— میرے سامنے اگر لاکھ مرتبہ لفظ دُنیا بولا جائے تو کبھی ایکبار بھی اس کو حس کہ آخرت کا یقین نہیں ہوتا۔ آپ دُنیا کو آخرت کا نقیض بتاتے ہیں۔ میں اسے انعدام کا نقیض سمجھتا ہوں یعنی جس طرح لفظ دنیا بول کر آپ کا خیال اس کے نقیض و آخرت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یوں مردے اٹھیں گے، اس طرح ان کا حساب و کتاب ہوگا، یوں عتاب میں مبتلا کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ اسی طرح لفظ دُنیا بول کر میرا خیال اسی کے نقیض، انعدام محض کی طرف جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو عالم عدم میں چلا جاتا ہے گویا کہ وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔

آپ کی دوسری دلیل اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "آخرت انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم دیتا ہے" درآں حالیکہ آخرت کا جو مفہوم پیش کیا جاتا ہے اس میں سوائے غرض و طمع کے کچھ اور ہے ہی نہیں۔ کیا اچھے کاموں کے عوض میں سونے

چاندی کے محلوں دودھ شہد کی نہروں حسین وجمیل دوشیزہ حوروں اور بے ریش و بروت لڑکوں کے دیئے جانے کا وعدہ کرنا بےنفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہو سکتی ہے اور کیا برے کاموں کی پاداش میں شعلہ زار جہنم کا منظر پیش کرنا ایک شخص کو بےنفسی کے ساتھ نیکی کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ جبکہ بےنفسی کو تعلق نہ لالچ سے ہونا چاہیئے نہ خوف سے اگر ہم کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتے ہیں اس ڈر سے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم کو قید و بند میں ڈال دیا جائے گا یا اس لالچ سے کہ اس احسان کا معاوضہ زیادہ بہتر صورت میں ملے گا۔ تو کیا دنیا میں کوئی شخص ہمارے اس فعل کو بےنفسی پر محمول کر سکتا ہے؟ اسی نکتہ کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اگر آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ جنت و دوزخ کا بیان صرف تشبیہی بیان ہے اور حقیقت کچھ اور ہے تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بیان میں ترغیب و تخویف ضرور پائی جاتی ہے، جو بےنفسی کے بالکل منافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مطلق جزا و سزا کا خیال ہی بےنفسی کو محو کر دینے والا ہے اور جب تک عذاب و ثواب کی تمام کارگاہ کو باطل ٹھہرا کر یہ اصول نہ قرار دیا جائے کہ "نیکی ایک فرض انسانی ہے جو بلا خیال ثمر یا بغیر اندیشۂ تعزیر ادا ہونا چاہیئے" بےنفسی کا خیال کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اسی ضمن میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب اس دنیا میں نہیں ملتا تو کیا وجہ ہے کہ یوم آخرت نہ تسلیم کیا جائے۔

اس میں بھی آپ نے خود ہی ایک بات فرض کر لی ہے اور خود ہی اس کو دلیل بنا کر پیش کر دیا ——— میں تو کہتا ہوں کہ کوئی طاعت ایسی نہیں جس کا ثواب یہاں نہ مل جاتا ہو اور کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو بشرطیکہ آپ طاعت کا مفہوم "اچھا کام" قرار دیں اور گناہ کا مفہوم برا کام ——— کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ

رنج شناسی و اداے فرض کے بعد ضمیر انسانی کو جو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ مسرت کسی اور چیز میں ہو سکتی ہے اور حق تلفی و ناحق کوشی کے بعد جو اضطراب نفس انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ عذاب کوئی اور ممکن ہے ـــــ لیکن اگر کسی کا ضمیر بالکل مُردہ ہو چکا ہے اور حق و باطل کی تمیز کسی میں باقی نہیں رہی تو تاریخ عالم اٹھا کر دیکھئے کہ اسی دنیا میں اس کا کیا انجام ہوا، افراد کو چھوڑیئے میں تو قومی و اجتماعی زندگی میں بھی اسی اصول کو کار فرما دیکھتا ہوں اور قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح ایمان لاتا ہوں کہ

هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ

پھر بتایئے کہ کیا اس آیت میں جس ہلاکت قومی کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے اور کیا یہ عذاب آپ کی مفروضہ اخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

ممکن ہے ابھی آپ کی تسکین نہ ہوئی ہو، لیکن اگر میں خود کلام مجید سے یہ ثابت کر دوں کہ عذاب و ثواب کا تعلق اسی دنیا سے ہے تو پھر آپ کیا کہیں گے۔ اچھا تکلیف تو ہوگی کلام مجید اٹھایئے اور سورۂ ہود کی آیات ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸ ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہوتا ہے:۔

فاما الذین شقوا ففی النار لھم فیھا زفیر و شھیق ۰ خالدین فیھا ما دامت السمٰوات و الارض و اما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیھا ما دامت السمٰوات و الارض۔	جن لوگوں نے شقاوت کی وہ آگ میں پڑے کراہ رہے ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے۔

کیا عذاب و ثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ روشن و واضح الفاظ کی ضرورت ہے کیا ما دامت السمٰوات و الارض کے الفاظ اس بات کا ثبوت نہیں کہ جنت و دوزخ اس دنیا کے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق نہیں کیونکہ اگر آپ عذاب و ثواب کو عالم آخرت سے متعلق کریں گے تو پھر ما دامت السمٰوات و الارض کہنا کوئی معنی رکھے گا۔

عالم آخرت تو آپ کے نزدیک قیامت یا ماوراء عالم دنیا سے واسطہ رکھتا ہے جب یہ زمین و آسمان کچھ نہ ہوں گے۔

آپ کی تیسری دلیل جس میں آپ نے جناب امیر اور یہودی کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق سوا اس کے کیا عرض کروں کہ

برتمناہائے عرفی خندہ می آید مرا

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب امام جعفر صادق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ملحد نے آپ سے سوال کیا کہ مرنے کے بعد روح کہاں چلی جاتی ہے؟ آپ نے جواب دیا چراغ گل ہونے کے بعد اس کی روشنی کہاں چلی جاتی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ جواب سننے کے بعد وہ ایمان لے آیا۔

درآں حالیکہ نہ جناب امیر کے جواب پر یہودی کو آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت تھی اور نہ ملحد کو جناب امام جعفر صادق کے استدلال پر مسلمان ہونے کی۔

میرے نزدیک یہ دونوں روایتیں نادرست ہیں اور میں کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جناب امیر یا جناب امام جعفر صادق نے ایسی بچوں کی سی باتیں کی ہوں گی، کیونکہ تھوڑی دیر کے لئے ہم مان بھی لیں کہ جناب امیر کا جواب مسکت تھا اور یہودی بھی جنت پر ایمان لے آیا تو کیا اس کا آخرت کے وجود کو تسلیم کرنا حقیقتاً اطمینان قلب کے ساتھ تھا یعنی اس دلیل سے کوئی اذعانی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں، اس نے اگر مانا بھی تو صرف اس لئے کہ ایسا ماننے میں کوئی حرج نہیں اور مصلحت اسی میں ہے پھر مصلحت و یقین میں جتنا فرق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

فرض کیجئے میں آپ کے پاس آؤں اور کہوں کہ مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ چاہوں تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگا دوں اور واقعی میں آگ لگا دوں گا۔ اگر آپ نے میری اس قوت کا اعتراف نہ کیا، آپ کو اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے لیکن آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ "مان بھی لو تمہارا کیا حرج ہے، اگر اس میں ایسی قوت نہیں ہے تو مان

لینے میں تمہارا کیا نقصان ہے، لیکن خدا کے لئے بتایئے کہ کیا آپ کا یہ اعتراف تصدیق قلب کے ساتھ ہوگا، ہرگز نہیں۔ پھر اگر جناب امیر کی اس دلیل پر وہ یہودی ایمان لے بھی آیا تو کیا واقعی وہ مسلمان ہو گیا ہوگا جبکہ اسلام و ایمان کے لئے تصدیق بالقلب ضروری ہے۔

یہی حال جناب امام جعفر صادق کی دلیل کا ہے ——— ایک ملحد جو روح تھا کا منکر ہے، آپ سے سوال کرتا ہے کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے آپ چراغ کی روشنی کا حوالہ دے کر خود اُسی سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ کہاں چلی جاتی ہے، آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اس میں بقائے روح کے لئے کون سی دلیل پیش کی گئی، بلکہ اس سے تو اُسی ملحد کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جس طرح چراغ گل ہونے کے بعد اس کی ضَو فنا ہو جاتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے، اکابر اسلام سے اس قسم کی روایتوں کو نسبت دینا حقیقتاً ان کی توہین کرنا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف اُن ادنیٰ درجہ کی ذہنیتوں کا جو اپنی دماغی اُپج کو اہمیت دینے کے لئے خواہ مخواہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں۔ جناب امیر اور جناب امام جعفر صادقؑ کا کیا ذکر ہے، احادیث اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ کی ذات گرامی سے ایسے افعال منسوب کئے جاتے ہیں کہ آج ان کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا ایک رسول کے اخلاق واقعی ایسے ہو سکتے ہیں اور کیا ایک مُلہم من اللہ ہستی سے ایسی باتوں کا اظہار ہونا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابل قبول نہیں جانتا۔ اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجئے۔ بلکہ خود اُن تمام روایات کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے جو اس باب میں بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لے کر دوزخ یا جنت میں پہنچنے تک کیا کیا مراحل و منازل سامنے آتے ہیں اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجئے کہ باور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں۔

بُعد المشرقین

جناب ملک محمد سمیع اللہ خان صاحب تحصیلدار کالپی کے ایک خط کا جواب

معاف فرمائیے یہ چند سطور جذبۂ دل سے متاثر ہو کر آپ کو لکھ رہا ہوں
یوں تو آپ کا نام نامی عرصہ سے سنتا تھا مگر اس سے قبل نہ تو
آپ کے متعدد و مسلسل مضامین دیکھے تھے اور نہ کبھی شرف نیاز کا موقعہ
حاصل ہوا تھا۔ ایک شوق تو پورا ہو رہا ہے دوسری تمنا دیکھئے کب
بر آئے۔ اخباروں میں آپ کے علم و عقائد کے متعلق بہت پروپیگنڈا
ہوتا رہا مگر میں نے آپ کے مضامین دیکھنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی
اتفاق سے میرے ایک دوست نے جو یہاں ڈاکٹر ہیں 'نگار' کا ایک
مضمون دکھلایا۔ اس کا پڑھنا تھا کہ شوق و جستجو کا یہ عالم ہوا کہ بہت
سے پرانے پرچے نگار کے منگوا کر اور چن چن کر آپ ہی کے مضامین دیکھے۔
اس میں شک نہیں کہ لطف بیان آپ کا حصہ ہے اور واقفیت عامہ
سے اکثر مضامین آپ کے لبریز ہوتے ہیں۔ آپ کے بعض بعض اصول اور
عقائد سے گو مجھ کو اتفاق نہیں۔ تاہم پھر بھی جو کچھ آپ کر رہے ہیں
وہ بہت ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں کہوں کہ جس طرح ایک طرف

مولویوں کی جماعت اپنی کوتاہ نظری میں نقطۂ بُعد پر ہے اسی طرح وسعتِ خیال اور آزادی روی میں جناب دوسرے کنارے پر ہیں۔ اگر کاش بین بین کے نیک اصول پر آپ اُتر آئیں تو شاید مسلم سوسائٹی کے واسطے جوہرِ بے بہا ثابت ہوں۔ اِس میں شک نہیں کہ آپ کا علم، آپ کی فراست آپ کی ذہانت اور آپ کی قوت استدلال ایسی ہے کہ آپ جو چاہیں ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر خدارا یہ تو فرمائیے کہ صحیح راستہ سوائے ایک کے دوسرا کیسے ہو سکتا ہے جیسا کہ آپ کا خیال ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اعمالِ حسنہ اچھی چیزیں ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر رہبر صحیح ہے تو منزلِ مقصود پر آدمی پہونچ جائے گا ورنہ باوجود کوشش اور محنت کے بھٹک جائے گا۔ بہرطور میرے خیال میں قربِ الٰہی بھی ضروری ہے، معاف کیجئے گا میری اِس جسارت کو کہ آپ جیسے جید عالم متبحر کے مضامین پر ایک قسم کی رائے زنی کرتا ہوں، لیکن یہ الفاظ محض ایک رو میں قلم سے نکل گئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرے دل کو آپ کی طرف سے نادیدہ انسیت کیوں پیدا ہو گئی ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے ازبس مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے میرے عقائد اور مقتضائے نگار کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد قائم کی ہے اور آپ نے عوام کی طرح بعض مولویوں کے غلط پروپاگنڈے پر اعتماد کر کے مجھے کافر و ملحد سمجھنے کا ثواب حاصل نہیں کیا۔ آپ اپنی تحریر میں ایک جگہ ظاہر فرماتے ہیں کہ میرے بعض اصول و عقائد سے آپ کو اتفاق نہیں، بہتر ہوتا اگر آپ ان کی صراحت فرما دیتے کیونکہ تحریرِ گرامی کا مطالعہ کرنے کے بعد

آپ کا جو اعتقاد میں نے معلوم کیا ہے بعینہ وہی اعتقاد میرا بھی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اصولاً آپ کو میرے کس خیال سے اختلاف ہے ——

ممکن ہے کہ آپ نے بعض فروعی مسائل کو اصول میں شامل کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو یا یہ کہ میری بعض تعبیرات کو ناپسند فرماتے ہوں۔ بہرحال آپ ہی کے دو مقرر کردہ اصول کو سامنے رکھ کر خیال کی اجازت چاہتا ہوں ممکن ہے کہ یہ پردہ اُٹھ جائے اور پھر آپ مجھے بھی اسی جگہ پائیں جہاں آپ کا پائے ثبات قائم ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اعمال حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے؟ دوسرے یہ کہ آپ کے خیال میں قرب الٰہی بھی ضروری چیز ہے ——

معاف فرمائیے اگر میں سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کر دوں کہ "کسی بارگاہ میں رسائی ہونے" کا کیا مفہوم ہے اور "قرب الٰہی" سے آپ کا کیا مقصود ہے —— اگر قرب الٰہی اور بارگاہ کی رسائی سے آپ کا مدعا ایک ہے (اور غالباً ایسا ہی ہوگا) تو آئیے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کر لیں کہ مذہبی زبان میں یہ الفاظ بول کر کیا مفہوم مراد لیا جاتا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ کیا ہیں؟ اتنا تو غالباً آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ "قرب الٰہی" سے وہ نزدیکی یا مواصلت مراد نہیں ہو سکتی جیسی اس دنیا میں دو انسانوں یا دو مادی اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے اور نہ "بارگاہ کی رسائی" سے اس نوع کا قرب مقصود ہو سکتا ہے جیسا ایک غریب کسان کو کبھی کبھی آپ کے حضور میں حاصل ہو جاتا ہے —— پھر جب حقیقت یہ نہیں ہے تو غور کرنا چاہیئے کہ اہل مذہب کی اس سے کیا مراد ہے اور وہ اس پند و موعظت سے کس نتیجہ پر پہونچنا چاہتے ہیں۔

میں اس وقت ذات باری کی حقیقت سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس اُلجھن میں پڑوں گا کہ اس کی ذات و صفات میں تفریق ممکن ہے یا نہیں! بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ صرف اس تعلق پر غور کروں گا جو خدا یا قدرت کے ساتھ نوعِ انسانی کو حاصل ہے ——

یہ امر یقیناً محتاجِ صراحت نہیں کہ خدا جس کو بے نیازِ مطلق کہا جاتا ہے، وہ آفریدگار عالم جو اپنی ذات سے کامل و اکمل ہے اور وہ قدرت جو بلا کسی رعایت کے ہر وقت سرگرمِ کار ہے، کسی فانی مخلوق کی کبھی محتاج نہیں ہو سکتی اور نہ ہمارا کوئی فعل اس کو کسی طرح متاثر کر سکتا ہے ——— پھر جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے ہمارے اعمال کا اثر ہماری ہی ذات پر پڑنا چاہیے، ہماری ہی زندگی کو اُن سے متاثر ہونا چاہیے اور ہماری بھلائیوں یا برائیوں کا دائرہ اثر ہماری معاشرتی و تمدنی زندگی سے آگے نہ بڑھنا چاہیے ——— یعنی اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اس کا نتیجہ ہمارے ہی لئے بہتر ہوگا اور اگر معاصی و بداخلاقی میں مبتلا ہوں گے تو ہم خود تباہ و برباد ہوں گے ——— یہی ہے وہ نکتہ جس کو کلام مجید میں کہیں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

کسی جگہ ——— إِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ——— کہہ کر اس کی توضیح کی گئی ہے اور کہیں طرزِ بیان بدل کر اسی حقیقت کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ

——— فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ———

اور کسی جگہ ——— إِنَّ الْأَرْضَ ——— يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ سے اس راز کو کھول دیا گیا ہے۔

بہر حال آپ تمام کلام مجید کا مطالعہ کر جائیے۔ کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہمارے اعمال خدا کو بھی کسی طرح متاثر کر سکتے ہیں اور اس کی برہمی یا خوشنودی کا مفہوم ہماری تباہی یا فلاح کے علاوہ کچھ اور ہے۔ جس سے قربِ الٰہی یا نارسائی

۱؎ عام طور پر اس کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے حالانکہ یہدی کا مفعول پورا فقرہ من یشاء واقع ہوا ہے اور یشاء کا فاعل مَن ہے اس لئے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے۔

بارگاہ کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ٹھہرتا کہ اگر ہم اچھے اعمال کے پابند رہیں گے تو اخلاق کی درستی کی صورت میں جو نتیجہ پیدا ہوگا۔ اسے مذہبی زبان میں قربِ الٰہی سے تعبیر کریں گے اور اور اس کے برعکس اگر ہمارے اخلاق ذلیل و ردی ہوں گے تو تباہی و بربادی میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہی ہے خدا سے دوری یا اس کی برہمی و ناخوشی۔ پھر اگر آپ اس تخیل کو اور زیادہ وسیع کریں اور خدا و انسان کے تعلق پر زیادہ غائر نگاہ ڈالیں تو بآسانی یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ دوزخ و جنت بھی اپنی اسی اہلیت و نااہلیت سے متعلق ہے اور قومی خوشحالی و بربادی کے اظہار کے لئے "جنات نعیم" اور "اسفل السافلین" سے بہتر الفاظ کوئی اور ہو نہیں سکتے۔

بہرحال اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ انسان کو عقل و ہوش عطا کئے جانے کا اقتضا یہی ہونا چاہیے کہ اس سے اچھے کاموں کی توقع کی جائے جو مقصود فطرت ہے ——— پھر جب اصل چیز صرف اعمالِ حسنہ قرار پائے تو یہ کہنا کہ بلا کسی وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے صرف یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ ہم کو درستیِ اخلاق کے لئے کوئی صحیح و مؤثر طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیئے ——— لیکن اس طریقہ یا وسیلہ کو اصل مقصود نہ قرار دینا چاہیئے۔

الٰہیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ آلہ یا ذریعہ صرف ایک آلہ یا ذریعہ ہونے کی حد تک قابلِ اختیار ہوتا ہے نہ کہ اصل مقصود کی حیثیت سے ——— اور یوں بھی روز کی زندگی میں ہم اس حقیقت کا مطالعہ کر سکتے ہیں کہ وسیلہ و مقصود یا جادہ و منزل میں کتنا فرق ہے۔

اگر آپ نے اس حد تک میرے صحیح مدعا کو سمجھ لیا ہے تو بآسانی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میرے اور مولوی کے اعتقادات میں کیا فرق ہے ——— میں کیا کہتا ہوں اور وہ کیا سمجھانا چاہتا ہے ——— اصول مذکورہ بالا کی بناء پر میرا کہنا یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم کا مقصد انسان کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ اور ان میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ وقت و زمانے

کے لحاظ سے ہر نیا دین اپنے پہلے دین کے لحاظ سے زیادہ مربوط و مستحکم آئین لے کر آتا تھا، حتیٰ کہ اسلام کا ظہور ہوا اور اُس نے ایک حرفِ آخر کی صورت سے ہمیشہ کے لئے انسان کو کسی اور مذہب کی استمداد سے بے نیاز کر دیا ـــــ لیکن اسلام کا مذہب کیا تھا، اسلام کی تعلیم کیا تھی؟ ـــــ (یہاں ایک بہت باریک نکتہ ہے جسے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں) صرف یہی کہ محض اخلاقِ حسنہ پیدا کرنا ہی اصل مذہب ہے، اور کسی مذہب کی پابندی صرف اس خیال سے کہ محض اس کی پابندی نجات و فلاح کے لئے کافی ہے بالکل بے اصل چیز ہے ـــــ یہی وہ راز تھا جس کو غالب نے یوں بیان کیا ہے کہ ؎

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یعنی اصل ایمان نام ہے مذہب "ترکِ مذہب" کا، محض درستی اخلاق کا اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اب اسلام کے ظہور کے بعد کسی مذہب کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بغیر کسی پابندی رسم و رواج یا شعائرِ ظاہری کے صحتِ اخلاق کو مطمحِ نظر قرار دیا جائے۔

پھر اگر حقیقت یہ نہیں ہے تو بتائیے کہ اسلام کا فطری مذہب ہونا کیا معنی رکھتا ہے، رسول اللہ کا رحمۃ للعالمین ہونا کیا مفہوم رکھ سکتا ہے اور مسلمان کیونکر اخوتِ عامہ کے عالمگیر رشتہ سے شرق و غرب کے تمام انسانوں کو باہمدگر وابستہ کر سکتے ہیں۔

میں نے کبھی نہیں کہا کہ نماز روزہ بُری چیز ہے بلکہ ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ اگر اُن سے درستی اخلاق مقصود ہو تو ان کا اختیار کرنا ضروری ہے لیکن میں اس کا قائل کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہوں کہ محض نماز پڑھ لینا یا ایک مہینے کے روزے رکھ لینا ہی اصل ایمان ہے یہ سب ذرائع و وسائل ہیں مقصودِ حقیقی تک پہنچنے کے اس لئے اگر یہ منزل تک پہنچانے والے ثابت نہ ہوں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ہماری تمام عبادات جسدِ بے روح ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبادات اسلام بجائے خود ضروری نہ ہوں

اور محض اخلاق حسنہ ہی پر انحصار ہو نجات کا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ غیر مسلم افراد بھی جو پاکیزہ اخلاق رکھتے ہیں ناجی نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی خصوصیت پھر کوئی باقی نہیں رہتی ——
میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بیشک یہی ہونا چاہیئے کیونکہ میں نجات کا مفہوم وہ لیتا ہوں جو اسی دُنیا کی فلاح و ترقی سے متعلق ہے اور وہ یوم آخرت یوم میثاق وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں، جن کا میں قائل نہیں ہوں اور نہ کوئی عقلی دلیل اُن کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے بالخصوص اس وقت جب کہ خود کلام مجید سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

آپ اگر تعلیمات اسلام کی روح پر غور کریں گے (اور یقیناً آپ نے غور کیا ہوگا) تو آپ کو معلوم ہوگی کہ اس سے زیادہ سادہ چیز کسی مذہب نے پیش نہیں کی —— رہا اُس کا روما کو پیدا کرنا سو اس کے لئے بے شک عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ایک خاص لٹریچر پیدا کرنا پڑا اور اس طرح آخرت، معاد، عذاب، ثواب، دوزخ، جنت، قرب الٰہی وغیرہ کی سیکڑوں اصطلاحات جاری ہوگئیں —— ورنہ

حسنک واحد و عباراتنا شتّٰی

اس میں کلام نہیں کہ میں بھی وسعت خیال کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر ہوں اور مولوی بھی اپنی تنگی خیال میں جواب نہیں رکھتا، لیکن یہ "بین بین" کیا چیز ہے۔ اگر مذہب نام اسی چیز کا ہے جو مولوی بتاتا ہے سو اس کو آج نہیں تو کل مٹ جانا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی بقا کی صورت صرف وہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ پھر اب یہ آپ کی خوشی ہے کہ جو چیز کل مٹنے والی ہے اُسے آج ہی ترک کر دیں یا کل پر اٹھا رکھیں۔

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ایں بکن یا آں بکن

دُشمنِ اِسلام کون ہے؟

مذہب یا دین اگر کوئی ایسی حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت کبھی بدل سکتی ہے اور کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ حقیقت تک پہونچنے میں وہ موانع حائل کرتا رہے۔

آپ کسی پابند مذہب شخص سے سوال کیجئے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ مذہب یقیناً خدا کی ظاہر کی ہوئی حقیقت ہے اور وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان کو حقیقت تک پہونچنے سے بعض رکھا جائے۔

اچھا اب آپ مختلف مذاہب والوں سے علٰحدہ علٰحدہ پوچھئے کہ جب مذہب خدائی حقیقت ٹھہرا تو اس میں تنوع کی کیا ضرورت تھی اور اس نے مختلف مذاہب پیدا کرکے انسان کو کیوں اُلجھن میں ڈال دیا ——— اس کا جواب ایک آتش پرست یہ دے گا کہ حقیقت تو ایک بار زردشت کے ذریعہ ظاہر کی جا چکی ہے ——— ایک یہودی کہے گا کہ حقیقت تو صرف موسوی تعلیم کا نام ہے' ایک عیسائی دعویٰ کرے گا کہ صداقت کی تبلیغ تو صرف عیسیٰ نے کی' اسی طرح بودھ مت والا بودھ کی تعلیمات کو' ایک ہندو کرشن

کی ہدایت کو اور ایک مسلمان محمدؐ کے بتائے ہوئے معتقدات کو حقیقت و صداقت سے تعبیر کرے گا اور باقی تمام مذاہب کو حقیقت سے دور ظاہر کر کے لغو و باطل قرار دے گا۔

اب غور کیجئے کہ ایک شخص جو مذہب کے خیال سے بالکل خالی الذہن ہے یہ سن کر کیا اثر قبول کرے گا۔ وہ اگر زیادہ آزادی سے کام لے کر سب کو لغو نہ کہہ دے گا تو وہ تحقیق و جستجو ضرور کرے گا تا کہ خود کوئی فیصلہ کر کے کسی ایسے نتیجہ پر پہونچے جو اس کے لئے قابل قبول ہو۔

اچھا آیئے ہم آپ بھی بالکل خالی الذہن ہو کر جستجو کریں کہ صداقت کس مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اور مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مذہب کو خدا کی بتائی ہوئی حقیقت و صداقت کہنا کیا معنی رکھتا ہے اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ خدا براہ راست اپنے خدائی الفاظ اور اپنی الہامی زبان میں اس کی تلقین فرمائے یا اپنے کسی خاص بندے میں غور و تامل کی غیر معمولی کیفیت پیدا کر کے اصول مذہب وضع کرنے کی طرف مائل کرے، بہرحال جو صورت بھی ہو، اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کی صداقت کا تعلق ماحول و زمانہ سے ہوا کرتا ہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ہونا ضروری ہے کیونکہ مذہب نام ہے اُن اصولوں کا جو اصلاح اخلاق و معاشرت کے کام آئیں اور چونکہ اخلاق و معاشرت کے معیار کا امتداد زمانہ کے ساتھ بدل جانا ضروری ہے اس لئے وقتاً فوقتاً اصول مذہب کا تغیر بھی لازم ہے۔

انھیں اصول زندگی پر لوگوں کو مستحکم کرنے کے لئے بعض معتقدات دینی وجود میں آئے جو لوگوں کو معاشرتی قانون کی پابندی پر مجبور کرنے کے لئے ذریعہ و وسیلہ کا کام دیتے تھے، مثلاً یہ کہ جو قانون پیش کیا جاتا ہے وہ خدا کا نازل کیا ہوا ہے، جس شخص کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور معجزات کا مالک ہے یا یہ کہ جو شخص اس

کی پابندی کرے گا اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کے نعائم و لذائذ حاصل ہوں گے اور جو پابندی نہ کرے گا وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو صرف ان معتقدات کا ماننے والا ہو اور ان سے آگے بڑھ کر اپنے اخلاق کو متاثر نہیں ہونے دیتا، بہ لحاظ نتیجہ اس کے یہ دینی عقائد بالکل بیکار ہیں، کیونکہ مقصود تو شارع کا جسے آپ نبی، رسول، مرشد، رشی، اوتار وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں، پورا ہی نہیں ہوا اور عقائد محض عقائد ہونے کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

الغرض اصل مقصود صرف اصلاح اخلاق و معاشرت ہے اور اس کے حصول کے لئے بعض غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگوں نے دین یا شریعت کو رائج کرکے بعض مخصوص عقائد پیدا کئے تاکہ لوگوں کو ترغیب و تخویف سے حقیقی مدعا کی طرف لا سکیں۔

اس جگہ یہ سوال اٹھانا کہ اگر عقائد دینی کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو کیا انبیا نے ان کو حقیقت ظاہر کرکے غلط بیانی سے کام لیا، درست نہیں، کیونکہ اوّل تو اس امر کا امکان ہے کہ اُن میں سے اکثر نے ان عقائد کو واقعی حقیقت باور کرکے پیش کیا ہو اور دوسرے یہ کہ اگر بعض نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسروں کی اصلاح کے لئے ایسا کرنا قرین مصلحت جانا ہوگا اور مصلحت کے لحاظ سے کوئی بات ایسی کہہ دینا جو واقعہ کے خلاف ہو کبھی مورد الزام نہیں ہو سکتا۔

وہ عقائد دینی جو آج معرض بحث میں ہیں، زیادہ تر مابعد الطبیعات سے متعلق ہیں یا خدا کے مفہوم سے یعنی اہل مذاہب ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور وہاں وہاں عذاب و ثواب، دوزخ و جنت وغیرہ کے معاملات پیش ہوں گے اور دوسری یہ کہ خدا نام ہے ایک ہستی کا جس نے تمام عالم کو اس طرح پیدا کیا جس طرح ایک صناع اپنے قائم کئے ہوئے

ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو تیار کرتا ہے اور وہ خدا قادر ہے جس وقت جو چاہے تغیر و تبدل کرکے کائنات کے نظام کو بدل دے۔

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ عقائد معہ تمام جزئیات کے کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں ہیں ——————

بلکہ کم و بیش ہر اُس قوم یا ملک میں پائے جاتے ہیں، جہاں کوئی مذہب پایا جاتا ہے اس لئے یہ امر غور طلب ہے کہ مہملات عقائد دنیا کی تمام مذہبی قوموں میں کیوں تقریباً ایک ہی سے پائے جاتے ہیں اور وہ کون تھا جس نے اوّل اوّل اُن کو حقائق جان کر پیش کیا ہر چند امر ثانی کی تعین دشوار ہے لیکن امر اوّل کی نسبت یہ کہنے میں قطعاً تامل نہیں ہو سکتا کہ ہر جدید مذہب نے ماسبق مذہب کے معتقدات سے فائدہ اٹھایا اور یہ سلسلہ عہد قدیم تک پہونچ کر اس زمانۂ وحشت تک پہونچ جاتا ہے جب انسان کے تجربات دنیا میں بہت تھوڑے تھے اور اس کا علم حد درجہ ناقص و نامکمل تھا۔

مثلاً آپ جنت اور حور و غلمان کو لیجئے۔ کیا کوئی مسلمان دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام سے قبل یہ خیال یا عقیدہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا۔

اگر آپ قدیم ایرانی اور آرین لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً یہی عقیدہ اس زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں ایک لفظ پری ہے جو قدیم ایرانی زبان میں "پیرک" تھا اور پیروان زردشت کا عقیدہ تھا کہ یہ آسمانی دیویاں ہیں جو ہواؤں میں رہتی ہیں اور اس قدر جمیل ہیں کہ ان کے دیکھتے ہی انسان فریفتہ ہو جاتا ہے، چنانچہ خود عربی کا لفظ فردوس، ایرانی لفظ ہے۔

لفظ حور کے متعلق ہمارے علماء کا خیال ہے کہ وہ خالص عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میں سفیدی و پاکیزگی کا مفہوم غالب ہے، درآنحالیکہ اس کا ماخذ اوستا کا لفظ "ہورہ" ہے جسے پہلوی زبان میں ہورا اور موجودہ فارسی میں خور کہتے ہیں جس کے معنی

نور روشنی اور مجازاً آفتاب کے ہیں۔ حور و غلمان کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے لئے "اپسرا" اور "گندھرپ" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

کسی غزوہ میں مارے جانے پر شہید ہونے اور جنت میں جانے کا خیال بھی آریہ خیال ہے، چنانچہ دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ "جنگ میں جو لوگ بہادری سے لڑتے ہیں اور پیٹھ نہیں دکھاتے وہ بہشت میں جاتے ہیں" اسی طرح اندر راجہ نل سے جس وقت خطاب کرتا ہے تو بہشت کا ذکر کرتا ہے۔

اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں تمام روحیں پیدا ہو چکی تھیں اور انھوں نے "قالو بلیٰ" کہا تھا ——— پارسیوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اوستا میں اس کے لئے لفظ "فردشی" پایا جاتا تھا، اور پہلوی زبان میں اس کو "فیروہر" کہتے ہیں۔ الغرض یہ عقیدہ کہ روحیں پہلے سے موجود ہیں، مجوس کے یہاں پایا جاتا تھا۔

اسی طرح ملک الموت کا خیال بھی مجوس کا خیال ہے اور ان کے یہاں بھی ایک فرشتہ "استو ویدھوتوس" کے نام سے پایا جاتا تھا جو روح کو جسم سے جدا کرتا تھا۔

عزرائیل کے متعلق مسلمانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بہت کچھ قدیم ایرانی روایات سے ملتی جلتی ہیں اور آدم و ابلیس، سانپ اور طاؤس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ بھی مجوسی روایات میں نظر آتا ہے، اسی طرح، میزان، صراط، نور محمدی، حشر و نشر، حساب و کتاب، دوزخ و جنت، وغیرہ کے متعلق جو اعتقادی مسائل اسلام میں پائے جاتے ہیں وہ قبل اسلام بھی بعض مذاہب میں پائے جاتے تھے اور اگر تمام مذاہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک وقت نامعلوم سے یہ خیالات نوع انسانی میں پرورش پاتے چلے آرہے ہیں اور انسان کی بالکل ابتدائی ذہنی نشو و نما کی یادگار ہیں۔

ابتدائے عہد انسانی میں جب کوئی شخص غیر معمولی عقل و ذہانت رکھنے کی وجہ سے اپنے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا تو اس پر دو فرض عائد ہوا کرتے تھے، ایک یہ کہ وہ قبیلہ کے تمدنی و معاشرتی نظام کو قائم رکھے، اور دوسرے یہ کہ وہ افراد قبیلہ کے دل میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو دور کرے۔

لوگ رات کو خواب دیکھتے تھے اور اس سے آکر پوچھتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ کوئی مر جاتا تھا تو اس سے دریافت کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں گیا، کسی کو کوئی مرض لاحق ہوتا تھا تو اس سے استصواب کیا جاتا تھا، الغرض ان کی ہر خواہش و جستجو کا مرکز سردار قبیلہ ہوا کرتا تھا اور اسے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواب دینا پڑتا تھا ——— کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی قائدانہ حیثیت ختم ہو جاتی اور قبائلی نظم و نسق میں وہ کامیاب نہ ہو سکتا۔

پھر چونکہ مرنے والوں کے ساتھ زندگی میں محبت و رفاقت کا جذبہ متعلق ہوتا تھا اور ان کی جدائی سے لوگوں کو تکلیف پہنچا کرتی تھی، اس لئے بقائے روح کے خیال سے ان کو تسکین دی گئی اور روح کو عذاب و ثواب کا محل قرار دے کر ترغیب و تخویف کی وہ صورتیں اختیار کی گئیں، جو اصلاح قبائل اور اصول معاشرت کے قیام کے لئے ضروری تھیں۔

اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ جتنے مذہبی معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور چونکہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے اس لئے حیات مابعد الموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں کیں جو دنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں۔

خدا کا وہی قہرمانی تصور جو دنیاوی بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے، اس کا وہی مختار کل ہونا جو ایک مستبد حکمران انسان کی خصوصیت ہے۔ بہشت میں انہیں لذائذ و نعائم کا ذکر کرنا

جن کی خواہش دنیا میں ہوا کرتی ہے اور دوزخ کے وہی دل ہلا دینے والے مناظر بیان کرنا جن سے عالم آب و گل میں ایک انسان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے یہ سب اسی قیاس کی بنا پر تھے جو تجربات دُنیا کے سلسلہ میں قائم کیے گئے اور جس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

مثلاً آپ اسلام ہی کو لیجئے کہ جس سرزمین میں اس کا ظہور ہوا وہاں کے باشندوں کی کیا حالت تھی دنیاوی لذائذ دلغائم میں عورت، شراب، دودھ، شہد اور فواکہ، ان کا انتہائی نقطۂ نظر تھا اور ان کی قساوت و سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ گرم پتھروں پر لٹا لٹا کر ایک آدمی کو مار ڈالنا ان کا روز کا مشغلہ تھا، جہل و لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے علمی و بے خبری پر فخر کیا کرتے تھے اور باہمدگر معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک کشت و خون جاری رہنا وہاں کا معمولی منظر تھا، با جود ایک ہی سرزمین میں سانس لینے کے ہر قبیلہ کا معبود جُدا تھا اور افتراق کی وہ تمام مکروہ صورتیں جو بھائی کو بھائی سے اور گوشت کو ناخن سے جُدا کر دیا کرتی ہیں اُن میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھیں۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ایک مصلح یا رفارمر کا اولین فرض یہی ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ان کو ایک مرکز پر لائے اور سب کو ایک خیال مشترک سے وابستہ کر دے چنانچہ سب سے پہلے ان کو خدا کی توحید کی طرف دعوت دی گئی ہر چند اللہ اور اللہ کی توحید کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اہل عرب واقف نہ رہے ہوں لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اس چیز کو بالکل بھلا چکے تھے اور اسی لیے ان کا شیرازہ درہم و برہم ہو چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ محض خدا کو ایک کہنا تو سود مند نہ ہو سکتا تھا اس لئے اصلاح معاشرت کے لئے اور وہ صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں اور عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے وہ تمام عقائد علیٰ حالہا قائم رکھے گئے جن کے بغیر اصلاح ناممکن تھی، اگر جاہل عربوں کے سامنے اظہار حقیقت کے طور پر بہشت و دوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر

نہ ہوتا کیونکہ اس مفہوم سے وہ آشنا ہی نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس کی بلندی کو سمجھ سکتے۔

لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ نعائم فردوس میں وہی تمام لذتیں شامل ہیں جن کے لئے وہ بے چین رہتے ہیں اور عذاب دوزخ اس قسم کی سخت گیریوں کی انتہائی صورت ہے، جن سے انھیں یہاں واسطہ پڑتا ہے تو ان کی سمجھ میں مذہب کی اہمیت بھی آئی اور وہ ان اصول کے بھی پابند ہو سکے جن کی تبلیغ ایک مصلح کا حقیقی مقصد ہوا کرتا ہے۔

اس لئے مذہبی معتقدات کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ حقیقتاً لغو و باطل تھے ان معتقدات کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا کیونکہ ان سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہو کر رہا اور اگر آج ان معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعہ اصلاح اعمال و اخلاق کا اختیار کیا جا سکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں۔ اور یہ ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانیٔ اسلام نے ظاہر کیا۔

جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے، ایک مذہب والا ہمیشہ دوسرے مذہب والے کو گمراہ کہنے کا عادی ہے لیکن قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے اور اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے جو اس قوم کی خصوصیات اور زمانہ کی ضروریات کا لحاظ رکھکر تمدن و معاشرت کے اصول قائم کرتا ہے اور لوگوں کو امن و سکون کی طرف بلاتا ہے۔ آنحضرت نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں تم لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں لایا۔ آپ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپ سے مافوق الفطرت معجزات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ آپ مذہب کے باب میں کبھی جبر و استبداد کو پسند نہیں کیا اور آپ نے اگر بہشت و دوزخ کا وہ عام مفہوم پیش کیا جو جاہلوں کے لئے قابل قبول تھا تو دوسری طرف اہل علم و فضل کے لئے یہ بھی کہدیا کہ یہ سب تشبیہات و استعارات ہیں اور حقیقت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔

پھر آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ ڈھونڈھ ڈالئے اور بتائیے کہ کیا محمد کے سوا کوئی اور نبی یا مصلح ایسا ہوا ہے جس نے انسان کی فطری سطح پر آکر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی ہو، جس نے اپنے آپ کو "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو جو معجزات اور خرق عادات پیش کرنے سے انکار کرتا ہو، جس نے مذہب کے لئے تلوار اٹھانا حرام قرار دیا ہو، جو تمام دوسرے مذاہب کی عزت کرتا ہو، جو واہمہ پرستی ولایعنی مراسم عبودیت کا مخالف ہو اور جو مذہب کا مفہوم صرف اخلاق کی پاکیزگی اور ذہنی ترقی و آزادی قرار دے۔

اگر انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ محمد کی ذات اس باب میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور اس لئے مذہب ہونے کے لحاظ سے تکمیل کا دعویٰ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ اصلی خط وخال اسلام اور اس کی تعلیمات کے، جو ہر شخص کو غائر مطالعہ کے بعد نظر آ سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ آج اگر میں ان کو ایک مسلمان کے سامنے بیان کروں تو وہ بھی ان کو صحیح باور نہ کرے گا چہ جائیکہ غیر مسلم، کیونکہ آج خود ہمارے علمائے کرام اور واعظانِ ذی احترام کے نزدیک رسول اللہ انسان نہ تھے بلکہ ایک دیوتا تھے جن کے جسم کا سایہ نہ تھا، جن کی پشت پر مہر نبوت ثبت کرکے خدا نے بھیجا تھا جن کے ہاتھ میں سنگریزے بولنے لگتے تھے۔ جن کی رسالت کا اقرار درخت بھی ایک انسان کی طرح کیا کرتے تھے۔ جب وہ جنگ کرتے تھے تو مدد کے لئے آسمانوں سے فرشتے اُتر آیا کرتے تھے اور جب آپ کسی مجمع میں ہوتے تو ہمیشہ آپ سب سے بلند نظر آتے، خواہ اُن سے زیادہ لانبے قد کے آدمی کتنے ہی وہاں موجود ہوں، وہ ایک بُراق پر سوار ہو کر ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرش اعظم تک پہونچے اور ذات خداوندی سے ہمکلام ہوئے۔ جبرئیل نے آپ کا سینہ چیر کر دل سے خون کی پھٹکی نکال لی تاکہ معاصی کی اہلیت باقی نہ رہے۔ اور آپ ایک اشارہ سے پہاڑ کے پہاڑ سونے چاندی میں تبدیل کر سکتے تھے غرض یہ واہمہ پرستی یہیں تک

پہونچ کر ختم نہیں ہوگئی بلکہ صوفیائے کرام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ احمد اور احد میں تو میم کا پردہ مصلحتاً رکھا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمد اور خدا میں کوئی فرق نہیں اور اس طرح صنمیات کا پورا لٹریچر اسلام میں داخل ہوگیا۔

آپ کسی مجلس میلاد میں جاکر شریک ہوں تو آپ کے لئے اس قسم کے معجزات و خوارق عادت سُننا ناگزیر ہوگا اور پوری صحبت میں مشکل ہی سے دوچار واقعات اخلاق محمدی کے سُننے میں آئیں گے ——— اس لئے موجودہ زمانہ میں جبکہ مذہب کے خلاف ایک عام تحریک دنیا میں پیدا ہو رہی ہے۔ اسلام کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ اغیار کے حملے سے کیونکر محفوظ رہے بلکہ سوال یہ ہے کہ خود اسی کے حامی و علمبردار جو دشمنی اس کے ساتھ کر رہے ہیں اس کو کیونکر دفع کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ترکی و ایران کی طرح حکومت اپنی ہو اور بزور شمشیر مولویانہ ذہنیت کو ختم کر دیا جائے۔ یا خود عوام میں علم کی اشاعت اتنی ہو کہ وہ نقد و قسیہ میں تمیز کر سکیں لیکن چونکہ ہندوستان میں اول الذکر صورت کا امکان نہیں اس لئے صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے، جو دیر طلب تو یقیناً ہے لیکن کسی نہ کسی دن بہر حال اسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

میرے مذہبی خیالات

جناب سید عبدالحکیم صاحب گجرات کے جواب میں

آپ کا یہ خیال یا نتیجۂ مطالعہ بالکل صحیح ہے کہ میرے مذہبی خیالات میں رفتہ رفتہ تغیر پیدا ہوا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اب اس تغیر نے ایسی مستقل صورت اختیار کر لی ہے کہ بعض حضرات اس کو کفر و ارتداد سے تعبیر کرنے لگے ہیں لیکن آپ اجازت دیں تو عرض کر دوں کہ ابتداءِ اجرائے نگار سے تا ایں دم کبھی ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گذرا کہ میں نے اپنے خیال کے مطابق حق و صداقت سے دیدہ و دانستہ اعراض کیا ہو یا میری نیت خدمت اسلام کے علاوہ کچھ اور رہی ہو —— البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے میں اسلام کے مفہوم کو زیادہ محدود سمجھتا تھا اور قدرے متعصب تھا، لیکن اب اس کو زیادہ وسیع سمجھتا ہوں اور کیش و مسلک کے امتیاز سے گذر گیا ہوں۔

(۱)

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگِ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

اس میں شک نہیں کہ میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا اور نہایت سخت مذہبی ماحول میں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی زمانہ اسی تقشف و تعصب میں بسر ہوا، لیکن اب اس کو عقل و ضمیر کی رہنمائی کہیے یا طاغوتی کافرمائی کہ مذاہب عالم کی تاریخ، حکومتوں کی داستانِ فتح و ظفر، اور اسی کے ساتھ طبیعیات و فلکیات کے مطالعہ نے ایک عجیب انقلاب ذہن میں پیدا کر دیا اور سب سے پہلا حجاب دور ہونے کے بعد جو منزل سامنے آئی وہ مَا عَرَفنَاکَ حقّ معرفتک کی تھی۔

پہلے میں یقین رکھتا تھا کہ خدا ایک مستبد و جبّار ہستی ہے جو سوائے مسلمانوں کے کسی اور کو نجات دینے والی نہیں۔ وہ ہمارے دنیاوی سلاطین ہی کی طرح ایک قہرمانی قوت ہے جو سزا و عطا کے لحاظ سے مسئول نہیں ہو سکتی اور جو ہماری عبادت سے (بشرطیکہ اسلامی طریقہ سے ادا کی جائے) خوش ہوتی ہے اور ترک عبادت سے برہم ——— لیکن جوں جوں کائنات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا اور علم و عقل کی نارسائیاں واضح ہونے لگیں تو مسلمانوں کی اس تنگ ذہنیت کو رفتہ رفتہ خدا کی توہین سمجھنے لگا یقیناً دیگر مذاہب بھی اسی عصبیت میں مبتلا ہیں لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم اسلام کو میں اس داغ سے پاک دیکھنا چاہتا تھا اور آخر کار اس احساس کی شدت نے میرے ضمیر اور میرے علم و یقین کو جس اقدام کی طرف مجبور کیا وہ یہ تھا کہ

بیا کہ روئے بمحراب گاہ نور نہیم — بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم

حطیم کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت   بتازہ طرح یکے قصر بے قصور نہیم

پھر یہ "کعبۂ دیگر نہ کیا تھا یہ" قصر بے قصور "کیا ہو سکتا تھا؟ یہی تنگ نظری کی زنجیروں کو توڑنا، تفریقات شعائر و رسوم کی خلیج کو پُر کر دینا اور ایک ایسی بلند چوٹی پر اسلام کا جھنڈا نصب کرنا جس سے زیادہ رفعت اور کسی مذہب کے پرچم کو میسر نہ آسکے ——— پھر چونکہ میں اسلام کو حقیقت کے لحاظ سے اخلاق کی دنیا میں آخری آواز سمجھتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ اسلام نام مخصوص وضع و شکل بنانے کا نہیں ہے، چند متعین حرکات کی پابندی کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسمیٰ ہے ارتفاع نوع انسانی کا، عروج فضل و کمال کا اور اخلاق کی انتہائی رفعت کا، اس لئے میں مجبور تھا کہ موجودہ مزعومات مذہبی و مفروضات دینی کی تنگ و تاریک فضا سے بلند ہو کر کوئی نصب العین ڈھونڈھتا۔ اور شکر ہے کہ میری عقل نے اس باب میں رہبری کی اور جوں جوں حجابات دور ہوتے گئے۔ میری آواز میں بلندی۔ میرے عزائم میں سختی اور میرے مسلک میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ آج خدا میرے نزدیک نام ہے ایک ایسی قوت غیر متاثرہ کا جو کافر و مسلمان کی بے معنی اصطلاحوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی، جو مسجد و کلیسہ، کاشی و کعبہ، اذان و ناقوس، طواف اور پیکرماں سب سے بے نیاز ہے اور وہ انعام و انتقام جزا و سزا کے لئے یہ نہیں دیکھتا کہ فلاں اسے اللہ کے نام سے پکارتا ہے اور فلاں رام کے نام سے، یا وہ مندر میں گھنٹہ بجا کر اس کی یاد تازہ کرتا ہے یا یہ کان میں انگلی دے کر اذان کی آواز سے اُسے پکارتا ہے۔ اگر وہ خدا ہے تو سب کا خدا ہے اور اس نے ہر شخص کی جزا و سزا، ہر قوم کی دوزخ و جنت خود اسی شخص یا قوم کے اندر پنہاں رکھ دی ہے خواہ وہ اسے اختیار کرے یا اُسے،

پھر جو شخص تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر لانا چاہتا ہو اور جو صرف صحتِ اخلاق کو غرض مشترک قرار دے کر دنیا سے عصبیت کو مٹا دینا پسند کرتا ہو اس کے خیالات و عقائد میں اگر آپ یہ تغیر محسوس کریں تو جائے عجب نہیں اور پھر یہ منزل تو ابھی صرف قیل وقال اور حجت و استدلال کی ہے۔ کسے خبر ہے کہ کل اگر میں اس منزل سے گزر کر صرف عمل کی منزل میں آگیا تو میرے منہ سے کیا نکلے گا، اور آج جو صرف کافر و مرتد کہہ کر مجھ سے نفرت کرتے ہیں کل مجھے دیوانہ و مجنون جان کر پتھر نہ ماریں گے

اجد الملامۃ فی ھواک لذیذۃ
حبا لذکرک فلیلمنی اللوم

◎

گزشتہ و آئندہ

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

آفتاب کا طلوع و غروب، روز و شب کا تسلسل، اور اسی طرح کے تمام فطری مناظر زمانہ نا معلوم سے یکساں طور پر رونما ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اور اگر کائنات نام صرف انھیں نقوش کا ہو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کسی انقلاب و تغیر کو قبول نہیں کرتی لیکن حقیقت امر شاید اس کے خلاف ہے کیونکہ اہل علم پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "عالم حادث ہے، متغیر ہے"

پھر کیا اس حدوث و تغیر کا علم ہم کو بغیر کسی غور و فکر کے الہامی طور پر حاصل ہوا ہے۔ غالباً نہیں۔ پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہو کہ اہم ترین تغیر عقل انسانی کا تغیر ہے جو ہر آن و ہر لحظہ حجابات دور کرتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کس نقطہ پر پہونچکر اس کو اپنی تگ و دو ختم کرنا ہے۔

انسان فطرت کی طرف سے اپنے اندر وہ حس لے کر آیا ہے جسے "حسِ اجتماعی"

(HERD INSTINCT) کہتے ہیں اور اسی احساس کا نتیجہ نظامِ تمدن ہے جس کا آغاز "عہدِ حجری" سے ہوا اور اب "عہدِ برق و شعاع" کہلاتا ہے، یعنی جس کی ابتدا زمین کے جمادات سے ہوئی تھی وہ اب آسمان سے باتیں کر رہا ہے ——— الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ذہنِ انسانی برابر ترقی کرتا جا رہا ہے اور کل کے بوڑھے آج صرف بچوں کی صف میں جگہ پا سکتے ہیں ——— جس طرح آج کے بوڑھوں کا شمار کل کے بچوں میں ہونے والا ہے؛

پھر کیا یہ انسان کی توہین ہے کہ اب سے ہزار سال قبل جو تحقیق و جستجو اس نے کی تھی وہ آج غلط ثابت کی جا رہی ہے۔ اگر ہمارے اسلاف کے علمی، اخلاقی و تمدنی نظریے آج کے مشاہدہ و ضروریات کے لحاظ سے ناقص و نامکمل نظر آتے ہیں تو کیا اس کا اظہار ان کی تنقیص ہے؟

نظامِ بطلیموس کا ماننے والا آج کوئی نہیں لیکن بطلیموس کی عزت و عظمت اسی طرح قائم ہے۔ نیوٹن کا نظریۂ کشش ممکن ہے" آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے سامنے غلط ثابت ہو جائے۔ لیکن نیوٹن کا نام "تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زرّیں حروف میں نظر آئے گا۔

جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں انسانی ذہن و دماغ نے اپنے حاسۂ اجتماعی کے اقتضا پر اور بہت سی باتیں دریافت کیں، اسی طرح اس نے مذہب کی بنیاد ڈالی اور ——— اس میں شک نہیں کہ اس سے اس کا مقصود نوعِ انسان کی خدمت اور تشکیلِ تمدن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پھر اگر ضروریاتِ زمانہ اور انسان کی عقلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علمی نظریے تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی عقائد میں تغیر نہ پیدا ہو

لیکن اس تغیر کا مطالبہ واحساس یقیناً "کسی پیغمبر کی توہین نہیں، کیونکہ جس عہد وزمانہ میں جو مذہب پیدا ہو وہ اس وقت کے لحاظ سے واقعی آخری لفظ کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن پاک میں بھی ارتقائے خیال کے لحاظ سے اصول مذاہب کی تبدیلی کی ضرورت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا۔

جب حقیقت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ عقائد مذہبی میں تغیر و تبدل کی خواہش پر لوگ کیوں چراغ پا ہوتے ہیں خصوصیت کے ساتھ مسلمان کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہوئی ہے کہ "خذ ما صفا" پر عمل کیا جائے اور زمانہ کا ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کی جائے۔

مذاہب عالم کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز تو وہ تھی جسے ہم پیغمبرانہ روح (PROPHET C[I]SOUL) کہتے ہیں اور دوسری جو اس کے بعد پیدا ہوئی وہ "نفس مولویانہ" (PRIESTMIND) تھا یعنی ایک تو وہ نفوس پاکیزہ تھے جن کے ذہن خلاق نے انسانی سوسائٹی کی فلاح کے لئے کچھ اصول وضع کئے اور دوسرے وہ تھے جو ان کا نفاذ کرنے والے تھے، اور پھر ان میں اکثر وہی تھے جنھوں نے اس پیغمبرانہ روح کے حقیقی منشاء سے ناآشنا رہ کر محض الفاظ کو لے کر ان کی پرستش شروع کردی اور کمتر ایسے تھے جن کے دماغوں نے ہادیٔ اول کی عقل سلیم کے متوازی چل کر اس کی تعلیم کی حقیقت کو دریافت کیا۔ ——— یہی رونا پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اور اسی لئے اس سے قبل بھی عقل ومذہب میں جنگ جاری رہی اور اب بھی جاری ہے فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ پہلے ذہن وعقل کی اس آزادی کو بزور شمشیر فنا کرکے اسے زیادہ ابھرنے

کا موقع نہیں دیا جاتا تھا اور آج یہ مجبوری اٹھ جانے سے عقل انسانی زیادہ سنگین محاذ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اب آئیے اس جنگ پر ذرا اور وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالیں:

اہل سائنس کہتے ہیں کہ سائنس ہمیں صرف اُن باتوں کا یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے جن کو ہم صحیح ثابت کر سکتے ہیں، برخلاف اس کے مذہب مشتمل ہے چند مزعومات پر جن کا کوئی علمی یا استقرائی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اہلِ مذاہب سے سوال کیا جاتا ہے کہ اُن کی باتوں پر ایمان لانے کے کیا اسباب ہیں تو وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے اسلاف ایسا ہی یقین کرتے تھے دوسرے یہ کہ ہمارے اسلاف جو دلائل پیش کر چکے ہیں وہ کافی ہیں اور تیسرے یہ کہ اصول مذہب پر گفتگو کرنا ناجائز و ممنوع ہے ——— کیا یہ دلائل واقعی کوئی وزن رکھتے ہیں؟

اگر دو ہزار قبل مسیح کے اکتشافات علمیہ کو عقل انسانی نے آج بالکل بدل کر رکھ دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس وقت کا مذہب جوں کا توں باقی رہے اور اس کے اصول اب بھی مفید و کارآمد ثابت ہوں۔ پھر اگر تمام دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہوتا تو بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کبھی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوا لیکن جب دنیا میں سیکڑوں مذاہب قائم ہوئے اور ہر ایک نے اپنے سوا تمام دیگر مذاہب کو جھٹلایا تو ایک طلبگارِ حق کے لئے چارۂ کار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سب کو عقل کی کسوٹی پر کسے اور کسی ایک کی صحت پر ایمان لائے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا تعلق عقل سے نہیں، کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ سائنس اس وقت تک کسی ایسی حقیقت راسخہ تک نہیں

پہونچ سکی جس سے آگے بڑھنے کی گنجائش باقی نہ رہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جوں جوں دن گذرتا ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کے باب میں اصول ارتقا کو نظر انداز کر دیا جائے۔

سائنس واقعات کی جستجو کر کے حقیقت تک پہونچنا چاہتی ہے اور مذہب چند باتوں کو پہلے ہی حقیقت باور کر کے واقعات کو ان پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے —— اگر ہم کسی مذہب کے پیرو ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے آباء و اجداد اس مذہب کے ماننے والے تھے لیکن سائنس کے یہاں باپ دادا کوئی چیز نہیں، وہ ہر انسان سے انفرادی طور پر عقل و تمیز کے صرف کا مطالبہ کرتی ہے۔

عقل انسانی نے عقائد مذہب میں جس جس تغیر کو قبول کیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ ابتدائی حالت میں جب انسان وحشی و جاہل تھا وہ خدا کو ایک ایسی ہی خود مختار فرمانروا ہستی سمجھتا تھا جیسی کسی دنیاوی صاحب و جبروت بادشاہ کی ہوتی ہے یعنی نہ وہ کسی قانون کا پابند ہے نہ کسی اصول پر کاربند جو وہ جس طرح چاہتا ہے بناتا بگاڑتا ہے —— اس کے بعد جب سترھویں صدی میں ڈیکارٹ، کیپلر، گلیلو اور نیوٹن پیدا ہوئے اور انھوں نے کائنات کو ایک بڑی مشین کی طرح نظم و اصول کے ساتھ چلتے ہوئے تسلیم کیا تو خدا کے اس قدیم عقیدہ میں بھی کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگوں نے باور کیا کہ دنیا کا کاروبار بیشک خدا چلاتا ہے لیکن مخصوص مشینری کے ذریعے جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ مدعا یہ کہ خدا کی خدائی کسی قانون و اصول کی پابند قرار دی۔ جب یہ دور بھی ختم ہوا اور اٹھارہویں صدی آئی تو اس مشینری میں کسی خارجی قوت کی مداخلت کو بھی تسلیم نہ کیا گیا۔ مدعا یہ کہ خدا حکمراں تو ہے لیکن نظم و نسق سے اسے کوئی واسطہ نہیں

زمانۂ حال کی جو کیفیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے کہ سرے سے خدا کا وجود ہی معرضِ خطر میں پڑ گیا ہے —— بہرحال یہ واقعہ ہے کہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ مذہبی نظریات میں بھی غیر معمولی تغیر پیدا ہوا اور وہ وقت آنے والا ہے جب اس کی انتہا یہ ہو گی، یعنی —— مذہب کا نام لینا ہی گناہ سمجھا جائے گا۔ اور جس طرح کسی وقت دین نے بیدینی کا استیصال تیغ و خنجر سے کیا تھا۔ بالکل اسی طرح بیدینی دین کو محو کر دینے کی کوشش کرے گی —— کیونکہ اس وقت مذہبی اہمیت صرف سیاسیات کے رجحان پر قائم ہے اور اس کی حیثیت سرمایہ دارانہ پروپگنڈا سے زیادہ کچھ نہیں۔

جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے مذہب جس میں ظاہری مراسم و شعائر کی پابندی ضروری ہے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مادی نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں کہ آج تک وہ قوی کے مقابلے میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا۔ نفسیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات علمی و تمدنی ترقی کے لئے بہت حارج ہوئیں۔ رہی وجدانی و مابعد الطبیعیاتی تسکین سو یہ علمِ اخلاق کی وساطت سے حاصل ہو سکتی ہے جو عام "اخوتِ انسانی" کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی ہے ——

الغرض اس وقت —— مغرب کی علمی دنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔

پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے۔ ترکی اپنی قومی ترقی و اصلاح کے لئے اسلام کو پس پشت ڈال چکا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۷ء میں مصطفیٰ کمال نے اپنی تقریر کے دوران میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار کہ ترکی، اسلامی حکومت ہے

ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولین مناسب فرصت میں کالعدم ہو جانا چاہیئے"

——— یہی حال تقریباً ایران و مصر کا ہے۔ چین و ہندوستان میں بھی اس انقلاب کے آثار پوری طرح نمایاں ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے سامنے اہم ترین مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسان گناہوں سے کس طرح باز رہے، بلکہ یہ ہے کہ تمدنی و معاشرتی نظام میں کون سی ایسی تبدیلی پیدا کی جائے کہ انسان بھوکا نہ مرے اور چونکہ مذاہب عالم کا موجودہ نظام انسانیت کے اس دکھ درد کا علاج اب تک نہیں کر سکا، اس لئے لامحالہ یا تو اس کو پس پشت ڈالنا پڑے گا یا اس میں کوئی ایسا تغیر پیدا کیا جائے گا جو اس گتھی کو سلجھا سکے۔ بہرحال اس دور انقلاب میں مذاہب کو ضرور صدمہ پہونچے گا اور اگر حامیان مذہب نے اپنے اصول کار میں اقتضاء زمانہ کے لحاظ سے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو ان کا منصب شریعت سے ہٹ جانا ناگزیر ہے۔

اگر شخص ثالث کی حیثیت سے فیصلہ کیا جائے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب موجودہ انقلاب میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی اصل روح کو پیش کیا جائے اور ظاہری شعائر و مراسم کی پابندی پر زور نہ دیا جائے۔

اس وقت اصولاً تقریباً تمام ممالک نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت و سلطنت کی بہترین صورت جمہوریت ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے جو مصائب دنیا پر توڑ رکھے ہیں ان کا علاج سوا اشتراکی اصول کے اور کوئی نہیں ہو سکتا پھر کیا سوا اسلام کے دوسرا مذہب کوئی اور ہے جو اس بات کا حامی ہو۔ سوال نہ بنو عباس کا ہے نہ بنو امیہ کا نہ دولت فاطمیہ کا نہ ہندوستان کے دور مغلیہ کا، بلکہ غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے۔ اگر عہد رسالت کے بعد اس پر عمل نہ کر کے لوگوں نے

بجائے جمہوریت کے مستبدانہ حکومتوں کی جنیاد ڈالی ہو تو اسلام مورد الزام نہیں ٹھہرتا۔ اور اگر آج بھی اس تعلیم کو پیش نہیں کیا جاتا تو اس میں قصور بہلے قائدین مذہب کا ہے نہ کہ اسلام کا،

تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جو جذبہ عملاً کوئی خدمت کر سکتا ہے وہ "اخوت عامہ" کا جذبہ ہے۔ اور اگر اس کے خلاف کوئی تعلیم پیش کی جاتی ہے (خواہ وہ اصول سے تعلق رکھتی ہو یا فروع سے، شعائر سے وابستہ ہو یا عقاید سے، کبھی صحیح اسلامی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

اس وقت اسلام کے اصطلاحی معنی خواہ کچھ ہی کیوں نہ قرار دیئے لئے گئے ہوں، لیکن حقیقتاً وہ ایک بسیط مفہوم رکھتا ہے اور اس کو ہم کسی طرح محدود کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اسلام نام ہے صرف استعلاء کا، عروج و ترقی کا، جد و جہد کا، کردار و عمل کا، ایک ایسی "لا مذہبیت" کا جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اہلیت رکھتی ہے اور شعائر و مراسم سے بے نیاز ہو کر صرف پاکیزگی اخلاق اور تکمیل تمدن کی حامی ہو

پھر چونکہ اس نکتہ کو مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم کو انسان کی خود غرضانہ ذہنیت خراب کر چکی ہے اس لئے عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں تعلیم مذہب کی ہیں اور اسی بنا پر تمام اسلامی ممالک میں وہ ردِ عمل ظاہر ہو رہا ہے جس کا دوسرا نام کفر و ارتداد رکھا گیا ہے لیکن باور کیجئے کہ یہ حالت عرصہ تک قائم نہ رہے گی اور اس انقلاب کا نتیجہ استیصال مذہب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اس کے اصلی خط و خال پیش نہ کئے گئے۔

ممکن ہے جو مفہوم میں نے اسلام کا پیش کیا ہے وہ اس وقت تعجب و

نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے ، لیکن وہ وقت آنے والا ہے جب ایک ایک شخص وہی کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں اور اسلام تمام دنیا پر حاوی ہو کر رہے گا۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اس کی صورت دوسری ہو۔ اس کا نام کچھ اور ہو۔ لیکن اس کا مفہوم وہی ہوگا جو آج میں کہہ رہا ہوں اور اس کے خد و خال وہی ہوں گے جنھیں آج میرا قلم پیش کر رہا ہے ؛

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے؟

یہ سوال خالص مذہبی ہے۔ یعنی یہ جستجو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قائل ہے اور ایشور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے۔ لیکن جو منکر خدا ہے وہ کون، اور کس لئے کی گفتگو نہیں کرتا بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیونکر ظہور میں آیا، اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے؟

ایک پابند مذہب انسان چونکہ خدا کو بالکل اسی طرح کا صناع و خلاق مانتا ہے جس طرح ایک کمہار یا بڑھئی کو کہ جو برتن اس کے جی میں آیا بنا دیا جس طرح کی چوکی چاہی اس نے تیار کر دی۔ اس لئے اصولاً اس کے سامنے کیونکر کا سوال نہیں آسکتا کیونکہ ایک قادر مطلق اور مختار کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادے سے ہژدہ ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں

آئے آناً فاناً محو کر دے لیکن ایک منکر چونکہ دنیا کی پیدائش کو کسی ہستی کے ارادہ کی متعلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقاء کا قائل ہے اس لئے لامحالہ اُسے غور کرنا چاہیئے کہ اصول آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے تحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے،

بہرحال اس بات میں ایک مذہبی انسان کا نقطۂ نظر، منکر کے نقطۂ نظر سے بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر مندرجۂ بالاعنوان سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں۔ ایک مذہبی شخص جو پیدائش عالم کے لئے کسی علت و سبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ و غایت پر غور کرنے کا مستحق کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے یعنی جب اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ خدا قادر مطلق ہے وہ جو چاہے پیدا کر دے اور جب چاہے فنا کر دے تو پھر کیوں کا سوال کیسا، یہ "چون و چرا" تو اسباب و علل سے متعلق ہوا کرتی ہے اور جب دونوں سے کسی اسی کا انکار کیا جاتا ہے تو استفسار کیوں؟ البتہ ایک منکر کے متعلق خیال ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہوگا۔ لیکن اگر انصاف سے پوچھئے تو کہنا پڑے گا "کیوں" کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے نہ انکار کرنیوالا۔ کیونکہ جس طرح مذہب آج تک غایت آفرینش کو نہیں سمجھ سکا، اسی طرح سائنس بھی اس معمہ کو حل نہیں کر سکی یعنی اگر ایک پابند مذہب شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصد ہے تو بڑے سے بڑا سائنس داں بھی نہیں کہہ سکتا کہ مادّہ و قوت کے اس ہیجان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی

کوشش کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے درآنحالیکہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل بھی اس دعوے کے لئے موجود نہیں ہے۔ اہل مذاہب میں ایک جماعت تو علماء ظاہر کی ہے جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو مذاہب کو صرف ان کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو اُن کے اسلاف لکھ گئے ہیں اور جن کی بناء پر سوسائٹی کا نظام مقرر کیا گیا تھا۔ دوسری جماعت اہل تصوف کی ہے جنھوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے اور جو تمام مسائل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں، ——— مسلمانوں میں اوّل الذکر جماعت کے پاس اس سوال کا کھُلا ہوا جواب موجود ہے اور اُن کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن نے کھُلے ہوئے الفاظ میں اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ ———

"مَا خَلَقۡتُ الۡاِنۡسَ وَالۡجِنَّ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ" یعنی ہم نے انسان وجنات کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اس لئے اگر آج عبادت کی کیفیت وہیئت متعین ہو جائے تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں ———

عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام دیگر مذاہب میں یہی ہے جسے پوجا یا پرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے لیکن چونکہ دنیا میں کوئی فعل ارادہ و نتیجہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ہر شخص کا خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو، فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر غور کرے یعنی یہ کہ وہ کس ارادہ و نیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض وغایت اس نے سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے۔ مذہبی اقوام میں بلا استثناء کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس ارادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہوگا اور وہ ہماری مشکلات کو دور کرے گا

پھر اگر واقعی کبھی کسی کے مصائب دُور ہو جاتے ہیں تو وہ اس کو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قائم کرتا ہے کہ جو حق عبادت کرنے کا تھا وہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی ——— اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے جذبات و تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے لیکن جب جذبات کی دنیا سے علیحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا جو کسی معلول کا وجود بغیر علت کے ماننے کے لئے تیار نہیں تو لامحالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے اور خدا کی خوشی یا رضامندی کا ہمارے دنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے ——— اس سلسلہ میں سب سے پہلے علم حقیقت خدا کا مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے۔ اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں ———

خدا کے متعلق انسان کا اوّلین تصوّر بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ و حکمراں کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تملق سے خوش ہونا۔ تحائف و نذرانہ قبول کر کے نظرِ التفات صرف کرنا اور سرتابی و نافرمانی سے غضب آلود ہو کر سزائیں دینا۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفس خدا کی ماہیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں۔ لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے خدا کی ہستی اب بھی وہی خوش یا ناخوش ہو جانے والی بتائی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دلچسپی اس کو باقی ہے۔

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکاں سے علیحدہ، احساس و تاثر سے بیگانہ، اور بے نیاز مطلق ہے، اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوشنودی کا محل ہے اور انعام و انتقام کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی وقت میں خدا کو دو متضاد صفات کے ساتھ متصف کرنا کیونکر ممکن ہے اور اسکی خوشنودی یا برہمی کیا معنی رکھ سکتی ہے جبکہ وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اسے پوجا یا پرستش کی ضرورت ہے ——— بعض اہل مذہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود عبادت کرنے والا اس سے فائدہ اٹھائے یعنی خدا کی پرستش کا مفہوم خود اپنی اصلاح ہے، بالکل درست، لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اسی کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ کسی صورت میں ہو بے کار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی، اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ اسے ترک نہ کر بیٹھیں ——— بظاہر یہ بیان بہت قرین عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب یہی ہے ——— چونکہ اہل مذاہب نے ہمیشہ یہی لوگوں کو سمجھایا کہ خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے اس لئے یہ بات کبھی اُن کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور اگر ہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بے کار ہے ———

اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا صرف چند مخصوص حرکات و مراسم کا اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ خراب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے اور اخوت و ہمدردی کا جذبہ جو نظام تمدن کی جان ہے، ان کے اندر ضعیف ہونے لگا۔

اگر ابتداء ہی سے اس امر پر زور دیا جاتا کہ خدا تمہاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمہاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شاید دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی ——— ہر چند بعض مذاہب نے عبادات کی ماہیت و غایت بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے، لیکن چونکہ عبادت و پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے اس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور چونکہ اس کے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے اس لئے دو روزہ زندگی کی اصلاح میں کیا سر کھپایا جائے۔ ——— میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دنیا فانی ہے انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح یا شام منتشر ہو جانا ہے ——— پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہوگی تو باہم کیا ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون ساجذبہ کام کر سکتا ہے ——— مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے لیکن

چونکہ وہاں بھی وہی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ہی ساتھ آتا ہے، اس لئے مسلمان اگر کبھی جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال اُن کے سامنے نہیں ہوتا ———— چنانچہ آپ کسی بڑی سے بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسری کے دُکھ درد کی خبر نہیں ہے۔ ———— اگر مسجدوں کا یہ اجتماع بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہوا در سجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش، ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی، مفلسوں اور ناداروں کی امداد، جماعتی تنظیم، اقتصادی مشکلات اور سیاسی مسائل پر گفتگو کر کے لائحہ عمل بھی تیار کرتے رہیں تو کتنا فائدہ عظیم مترتب ہو سکتا ہے ————

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دارالاجتماع تھے، جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی لیکن آج مولوی کہتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو یعنی صرف اس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمہیں تو نہیں ہے لیکن اس مولوی کو فرور ہے جو خدا کے "خلوتیانِ راز" میں سے ہے اور جس کے اختیار میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈالدے یا فردوسِ بریں میں بھیجدے ———— علماءِ ظواہر کے مفہومِ عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کر لی ہے اس کا حال تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا۔ اب رہ گئے اہلِ دل جو بجائے شریعت کے طریقت پر کاربند ہیں تو اس میں شک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق ہے وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے "عقیدۂ ہمہ اوست" سے خدا کی تعبیر بڑی حد تک قابلِ قبول صورت میں پیش کی، لیکن عبادت کے مسئلہ کو وہ بھی نہ حل کر سکے

اور چونکہ معاد و آخرت کی زندگی اُن کے یہاں بھی اصل چیز تھی۔ اس لئے باوجود لگنے بجلنے کا شوق رکھنے کے وہ عبادت کے مسئلہ میں علماء ظواہر کی پابندیوں سے علیحدہ نہ ہوسکا۔ اور شریعت کے مقابلے میں ان کی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جداگانہ قائم نہ کرسکی ———

الغرض مسلمانوں کی طرف سے اس سوال کا جواب دینا کہ خدا نے انس جن کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں عام متبادر معنیٰ کے لحاظ سے انسانی دنیا کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا

——— دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو طرح کے ہیں، ایک وہ جنھوں نے زندگی یا مذہب کا کوئی فلسفہ پیش کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کے مرتب کرنے پر اکتفا کی۔ ہرچند اوّل الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصود وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا لیکن جس طرح براہ راست عملی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعد الموت کے قائل ہوکر مراسم و شعائر میں الجھ کر رہ گئے۔ اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہوکر ایسے دُور ازکار قیاسات میں مبتلا ہوگئے کہ سوسائٹی کا مفاد بالکل نظرانداز ہوگیا اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں مادی حقیقتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی لائحہ عمل بنی نوع انسان کے سامنے پیش نہ کرسکیں ———

اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج و ارتقاء سے نہیں ہے جس کے لئے تیغ و تفنگ کا جارحانہ یا مدافعانہ استعمال ضروری ہو بلکہ صرف فلسفۂ حیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموز زندگی حل کرنے سے ہے، تو بتلایئے کہ ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت۔ نروان۔ اہنسا اور مکتی نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا۔ یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لیکر دنیاوی جاہ و حشم کو اپنے لئے مخصوص کر لینے سے دنیا کو نقصان پہونچا تو بودھ کی طرح کاسۂ گدائی لے کر در در کی بھیک مانگنے سے نوع انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی ———

اگر کسی قوم نے اسے تلوار سے مجروح کیا تو دوسری نے اُسے اپاہج بنایا۔ اگر ایک نے نفس پرستی و خودغرضی کو رواج دیا تو دوسری نے نفس مدعا و غرض مشترک کو محو کر کے انسانی عزائم کو سرد کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا ——— الغرض نوع انسانی کو نہ ان مذاہب سے کوئی فائدہ پہونچا جو یکسر عمل ہونے کے مدعی ہیں اور نہ اُن مذاہب سے جو صرف عقائد پیش کرنا منتہائے نظر سمجھتے ہیں ——— غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلہ "روحانیت یا مابعد الطبیعیات" ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ سمجھا۔ اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی لیکن بلا استثناء تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اس کو ناقابل اعتنا سمجھا۔ اس لئے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلان نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کر دی اور دنیا کو دنیا کے اصول سے سمجھنے اور کاربند ہونے پر مجبور کر دیا۔

پھر ہرچند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادئین نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا ان کے مقرر کئے ہوئے اصول دنیا کے امن و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصود بالکل برمحل ہے اور "قضیۂ زمین برسر زمین" کے اصول پر کاربند ہوتے ہوئے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس نے قادر مطلق اور فعال لما یرید ہونے کی حیثیت سے انسان کو دنیا میں عضو بیکار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت

اس مسئلہ پر غور کرنے میں ضیاع کرتے ہیں کہ دنیا کیوں پیدا کی گئی ——— ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا پیدا ہو چکی ہے اور اس میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لئے ہم کو ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں اُن پر چل کر دنیا کو اپنے لئے جنت بنا لینا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے اور اس سے خودغرضی کا جذبہ قوی ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کرنا مستبعد نہیں لیکن اگر صرف اس دلیل پر اس تحریک کو رد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے جبکہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لے کر تلوار اٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابل غور ہے وہ یہ کہ مادئین کا مذہب ہنوز ارتقاء کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آئندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خونریزی سے باز رہنے پر مجبور ہو جائے ——— بہ حالت موجودہ نظام تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قائم ہے، وسیع ہو کر ایسی عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں، تمام جماعتیں، بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے چلے جا رہے ہیں یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جا رہی ہے پھر کیا یہ امر خلاف عقل ہے کہ ایک ایسا وقت آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہو جائیں اور تمام نوع انسانی ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایک قوم، ایک جماعت ایک حیثیت اور ایک سوسائٹی بن جائیں اور باہم جنگ و خونریزی کا امکان باقی نہ رہے

اس وقت جس چیز نے دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے، یعنی دنیا اب اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بنا پر قائم ہو کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے، دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفروضہ قوت ہے جس سے اس وقت تک کام لیا جا سکتا ہے جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہو جائے اور دولت انسانیت کو پامال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہیئے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یورپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ استبداد و استعمار پر قائم تھیں ایک ایک کر کے اشتراکی اصول پر کاربند ہونے کے لئے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر ساری دنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولتمندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسر پیکار ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں تہی دست لیکن اگر یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آ جائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور اس امن و سکون کو حاصل کر سکتی ہے جسے مذاہب عالم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے۔

اس لئے بہ حالات موجودہ [illegible] قومیں پیدا کیا۔ محض تضیع اوقات ہے، سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آ گئے ہیں تو ہم کو زندگی کیونکر بسر کرنا چاہیئے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہیئے،

خدا کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اس تعلق کی بنا پر ہم کیا کر سکتے ہیں، اور کیا نہیں، یہ سب ایسے دوراز کار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک

ان کا کوئی شافی جواب دیا جا چکا ہے اور نہ آئندہ ممکن ہے۔ انسان واقعات و حوادث کا بندہ ہے۔ اسباب و علل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اُسے انھیں باتوں پر غور کرنا چاہئے جس سے اس کی زندگی متعلق ہے ——— اگر خدا دنیا میں آکر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں۔ اگر اُس نے 'کُن' کہہ کر دفعتاً عالم کو پیدا کر دیا تو کیا اور تدریجی ارتقاء کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا ——— انسانی درد و دکھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں ——— پھانس اگر چبھی ہے تو اس کی تکلیف نکالنے ہی سے دور ہو سکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر گوشت کے اندر پہونچ گئی۔

گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بجھانے کی فکر ہوتی ہے۔

اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوع انسانی کے خیرخواہ ہیں۔ ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دنیا کو کیوں پیدا کیا بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں۔

مذاہب تو اس تجربہ میں ناکام رہے اس لئے لامحالہ ہمیں اُن سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور ———
پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رخ کیا ہے۔ سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تب ہی تک ہم کو نجات حاصل ہو سکتی ہے ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کا یوم النبی

مسلمانوں میں ۱۲ ربیع الاوّل کو (حالانکہ ولادت نبوی کی صحیح تاریخ ۹ ربیع الاوّل ہے) وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوؤں کے یہاں جنم اشٹمی کو۔ یعنی جس طرح اُن کے یہاں کرشن جی کی ولادت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جماعت، ولادت نبوی پر جذبات مسرت ظاہر کرتی ہے۔

لیکن ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ جنم اشٹمی کے منائے جانے پر ہندوؤں کے اکابر کی طرف سے نہ کوئی تحریک کی جاتی ہے۔ نہ اخباروں میں نشر و اعلان ہوتا ہے اور یوم النبی کے لئے علماء اسلام کو کافی پروپاگنڈا کرنا پڑتا ہے تاکہ مسلمان اس تقریب کی پذیرائی میں زیادہ جوش و ولولے سے کام لیں۔

یوم النبی کی تحریک مسلمانوں میں کوئی قدیم تحریک نہیں کیونکہ اس کا پتہ قرون اولیٰ میں کہیں نہیں چلتا۔ خاص کر لفظ "یوم النبی" تو بالکل مغربی تتبع میں اختیار کیا گیا ہے جو ترجمہ ہے (PROPHET DAY) کا ورنہ اب سے کچھ زمانہ قبل اس کو ذکر میلاد "میلاد النبی" اور عوام میں "مولود شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ——————

لیکن یہ تحریک قدیم ہو یا جدید، اس کا نام "یوم النبیؐ" قرار دیا جائے یا کچھ اور، اس کے مفید ہونے سے بہرحال انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی اس سے ہماری عملی زندگی میں کوئی تغیر پیدا ہو۔ لیکن سوال یہی ہے کہ کیا کبھی اس سے کوئی فائدہ اس قسم کا مترتب ہوا ہے اور کیا آئندہ کوئی توقع اس کی کی جاتی ہے۔ مجھے اس باب میں سخت مایوسی ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر مسلمان بجائے سالانہ احتفال و اجتماع کے ہر مہینے اور ہر ہفتہ یوم النبی منائیں تو بھی کوئی فائدہ ان کو نہیں پہونچ سکتا اور جس اسلوب سے اس تقریب میں اظہارِ جذبات کیا جاتا ہے وہ بجائے مفید ہونے کے اور نقصان رساں ہے۔

کسی مذہب میں تہواروں یا خاص تقریبوں کا پیدا ہو جانا حقیقتاً اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دورِ انحطاط سے گذر رہا ہے اور اب اس کے پاس سرمایۂ عمل صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف یا اپنی گزشتہ تاریخ عروج کے بعض واقعات کبھی کبھی یاد کر لیا کرے۔ آپ کسی مذہب و قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ابتدائی زمانہ عروج میں نہ کوئی خاص تہوار تھا نہ کسی واقعہ کی یاد میں کوئی تقریب منائی جاتی تھی، لیکن جوں جوں اس میں انحطاط پیدا ہوا اس قسم کے مراسم بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مجموعۂ روایات سے زیادہ کوئی چیز نہ رہ گیا اور صرف انھیں روایات کا زبانی تحفظ اصل مذہب قرار پایا —— جب کوئی قوم اوّل اوّل کسی مقصد کو لے کر پورے جوش کے ساتھ اٹھتی ہے تو اس کے سامنے سوا اقدام و عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی فتوحات انتہا کو پہونچ گئیں یا یہ کہ منزلِ مقصود اس کو حاصل ہو گئی تو اس کے قوا میں اضمحلال، عزائم میں کمزوری اور عملی زندگی میں ضعف پیدا ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ چند دن تک وہ اسی سطح پر قائم رہنے کے بعد پھر نیچے کی طرف گرنے لگتی

ہے۔ اور تن آسانیوں کی عادت اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ وہ کس طرح تیزی سے مائل بہ انحطاط ہے ——— کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لئے زوال ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس حالت کو کمال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً کمال ہے بھی یا نہیں ——— دنیا میں ترقی و عروج کی انتہا نہیں۔ تکمیل و ترقی کی راہیں غیر محدود ہیں۔ اس لئے کمال کی تعیین محال ہے اور زوال کمال کے لئے لازم نہیں ہے بلکہ وہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے کمال حاصل کر لیا یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انحطاط نام ہے تعیین منزل کا، ——— اور اس منزل تک پہونچکر یہ سمجھنے کا کہ اب آگے ہم کو بڑھنا نہیں لیکن اگر کوئی مقصود متعین نہ کیا جائے یا یہ کہ ہر مدعا کی تکمیل کے بعد دوسرا مدعا پیش نظر رکھا جائے تو کبھی زوال ہو ہی نہیں سکتا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں خیر عہد رسالت کو تو چھوڑ دیجئے کہ وہ تو بالکل ابتداء کی بات تھی اور اصولاً اس وقت نہ تعیین منزل کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ نہ تکمیل مدعا کا، لیکن اس کے بعد جب فتوحات وسیع ہوئیں سلطنت کی حدود میں وسعت پیدا ہوئی تو کیا ہوا؟ ——— عہد عباسیہ کو عربوں کی فتوحات کا دور زریں کہا جاتا ہے لیکن کیا اس دور زریں کے معنے یہ تھے کہ جو کچھ ان کو کرنا تھا کر چکے اور کیا اس احساس میں ان کا زوال پنہاں نہ تھا۔

اسی طرح ترکوں کو لیجئے کہ ان کا انتہائی نقطۂ نظر قسطنطنیہ فتح کر لینا تھا اور جب محمد خاں ثانی اس میں کامیاب ہو گیا تو ان کی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب اسی جگہ رک گیا اور اسی دن سے ان کا زوال شروع ہو گیا ورنہ اگر وہ کسی منزل کی تعیین نہ کرتے اور اپنے اقدامات کو برابر اسی طرح جاری رکھتے تو آج سارا یورپ مسلمان ہوتا اور سرزمین مغرب

کا کوئی حصہ ایسا نہ رہ جاتا جہاں ہلالی پرچم نہ لہراتا۔

الغرض قومیں جب آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ ٹھہر جاتی ہیں اس وقت سے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ انحطاط کے اس دور میں پہونچ جاتی ہیں کہ خود ان میں کوئی قوت عمل باقی نہیں رہ جاتی اور نکبت و ذلت کا احساس شروع ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو فخریہ بیان کرنے لگتے ہیں اور اسی کو ذریعہ ترقی سمجھتے ہیں۔

یہ ہے حقیقت قوموں کے تہواروں اور تقریبوں کی اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت مسلمانوں میں بھی بہ سلسلہ "یوم النبی" اظہار مسرت کیا جاتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ کی ذات گرامی جن صفات کی حامل تھی وہ کبھی فراموش کئے جانے کے قابل نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آج تمام مسلمان دنیا سے محو ہو جائیں تو بھی ان کا ذکر کیا جائے گا۔ اور تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے لبریز نظر آئیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ جس اصول و انداز پر ان کے یوم ولادت کی یاد ہر سال تازہ کی جاتی ہے وہ واقعی ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچا ہے۔

یہ تقریب آج نہیں بلکہ صدہا سال قبل اس وقت سے منائی جارہی ہے جب مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن کیا ذکر "میلاد النبی" کے جلسے اس قوم کو انحطاط سے روک سکے اور اب جبکہ زوال کی انتہا ہو چکی ہے کیا پھر اسے ابھارنے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

تمام عالم اسلامی کے علمائے کرام کی طرف سے اعلان شائع ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو "یوم النبی" صد درجہ جوش و اہتمام سے منانا چاہیئے۔ چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں اونچے اونچے دروازے نصب کئے جاتے ہیں۔ رنگین جھنڈیوں سے در و دیوار کی آرائش ہوتی ہے

بجلی کے قمقمے لٹکائے جاتے ہیں۔ شیرینی کا انتظام ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے گروہ ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے۔ سینے پر ریشمی کپڑوں کے بیج لگائے اللہ اکبر کے پُرزور نعرے مارتے ہوئے نکلتے ہیں، اور رات کو جب واعظ اپنا وعظ ختم کر چکتا ہے تو شیرینی لے کر لوگ اپنے گھر واپس آتے ہیں۔ اس حال میں کہ رات بھر وہ اس جنّت کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کا ذکر واعظ نے کیا تھا اور صبح کو جب بیدار ہوتے ہیں تو کاہلی و بیکاری کا وہی جمود ان پر طاری ہوتا ہے جو اس سے قبل طاری تھا اور کسی قسم کا کوئی اضافہ اپنی ہمّت و جرأت میں نہیں پاتے۔

اسلاف پرستی یقیناً اچھی چیز ہے۔ اور قوموں کو ابھارنے کے لئے یہ ذریعہ بلاشک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلاف پرستی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سکندر کے مرنے کے بعد محض اس کی یاد سلطنت روما کو تباہی سے بچا سکی، کیا سلطان محمد ثانی اور سلیمان اعظم کے کارناموں کا ذکر سلطنت ترکی کو زوال سے بچا سکا۔ کیا عبدالرحمان کی جرأت و ہمّت کی داستانیں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کو زوال سے روک سکیں ——— اکاسرۂ عجم کی شوکت و جبروت کا ذکر ہر ایرانی کے لب پر تھا لیکن ایران تباہ ہو کر رہا۔ رام و کرشن کے ولولہ و عزم کی کہانیاں ہمیشہ سے ہندوؤں کو یاد تھیں لیکن مسلمانوں نے ان کو مغلوب کر کے چھوڑا سطوت مغلیہ کے آوازہ سے فضا گونج رہی تھی کہ انگریزوں نے آکر ان کا تختہ الٹ دیا۔ پھر یاد رکھو کہ تم ہر سال کیا معنی اگر ہر مہینے "یوم النبی" منا کر رسول اللہ کی ولادت پر اظہار مسرت کرتے رہو گے تو بھی مٹنے سے نہیں بچ سکتے کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کا ہمیشہ ایک فلسفہ رہا ہے اور جب تک کوئی نپولین ذہنی بال پیدا نہ ہو جائے محض ان کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی ——— پھر یہ وقت رستم و سہراب کی داستانیں دہرانے کا نہیں بلکہ رضا شاہ کے پیدا کرنے کا ہے۔ باب عالی

کی گزشتہ سطوت وجبروت بیان کرنے کا نہیں، بلکہ مصطفےٰ کمال کے وجود میں لانے کا ہی اور اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی روح پھونکنے کی ضرورت ہے تو اس نے کسی کسی خالد وعمر، حسین وعلی کا ظہور میں آنا ضروری ہے اور یہ نہ کسی احتفال اجتماع سے پیدا ہو سکتے ہیں نہ وعظ وتبلیغ سے، بلکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے سے، آگ کے اندر کود جانے سے اور ہتھیلی پر سر لے کر باہر نکل آنے سے۔

رسول کی ولادت وسیرت کا ذکر کیا جاتا ہے ———— اس رسول کا، جس کی زندگی یکسر عمل۔ سراپا ایثار وقربانی تھی۔ اس ہستی کا جس میں سوائے صداقت وخلوص کے نمود ونمائش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس ذات گرامی کا جو صرف ہمدردی ومحبت کے لئے وضع ہوئی تھی لیکن حال یہ ہے کہ سوا قول کے عمل کا کہیں نام نہیں بجز نمود ونمایش کے صداقت کا کوسوں پتہ نہیں سوا خود غرضی وطمع نفس کے ایثار وقربانی سے کوئی نسبت نہیں پھر خدارا کوئی بتلائے کہ یہ کیا تماشہ ہے۔ یہ کس قسم کی یادگار ہے؟ یہ کس انداز کا اجتماع ہے اور ہمارے قائدین عظام اس سے کس فائدہ کی توقع رکھتے ہیں۔

اگر اسوۂ رسول کی عظمت کو ہم صرف رنگین جھنڈیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ اگر اس کی پاکیزہ سیرت کے اظہار میں صرف بجلی کے قمقموں کا روشن کرنا کافی ہے۔ اگر اس کی مقدس تعلیم کا نشر واعلان محض شیرینی تقسیم کرنے سے پورا ہو سکتا ہے اور اگر ہم اس کے باطنی و اخلاقی علو کو جھنڈیاں لے لے کر سڑکوں پر گشت لگانے سے ثابت کر سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی صداقت عمل کی تبلیغ میں ظاہری نمود ونمائش کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تو بے شک یہ سب کچھ درست ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ لہو ولعب کا مظاہرہ نامناسب نہیں لیکن اگر خود رسول نے کبھی وہ نہیں کیا جو ہم کر رہے ہیں اور کبھی اس کی اجازت نہیں دی جو ہماری طرف سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر اس کو "یوم النبی" کی یادگار کہنا یقیناً رسول اللہ

کی توہین ہے۔ اسلام کی تذلیل ہے، اور مسلمانوں کے اندر اک ایسے جذبہ کی پرورش کرنا ہے جو بت پرستی کی طرف تو منجر ہو سکتا ہے لیکن خدا پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

یہ تو ہوئی عملی پہلو کی کمزوری یا اس کا نقصان جو یوم النبی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے، اب رہ گئی تاریخی یا مذہبی حیثیت جس کو سامنے رکھ کر ہمارے علمائے کرام ذکر میلاد فرماتے ہیں۔ سو اس کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ان کا مقصود رسول اللہ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرنا کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ایک مافوق الفطرت ہستی کی صورت سے پیش کرنا ہوتا ہے ——— وہ ابھی پیدا نہیں ہوئے کہ ان کا نور لاکھوں سال قبل سے خدا جانے کہاں کہاں چکر کھاتا پھرتا ہے۔ وہ جس وقت پیدا ہوتے ہیں تو اکاسرہ کے محل اور صنم کدوں کے بت سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی عالم طفلی میں ہوتے ہیں کہ فرشتہ ان کا سینہ چاک کر کے آلائش سے پاک کر دیتا ہے وہ دعوائے نبوت کرتے ہیں تو سنگریزے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جب آپ چلتے ہیں تو جسم کا سایہ نظر نہیں آتا۔ اور کبھی جوش نبوت میں انگلی کا اشارہ کر دیتے ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر میں حیران ہوں کہ جب ذکر میلاد کے سلسلہ میں قولاً و عملاً کوئی بات بھی کام کی نہیں ہوتی تو کیوں اس پر ہزاروں روپیہ ضائع کیا جاتا ہے اور کیوں اس طرح کے ظاہری مراسم و شعائر کی طرف متوجہ کر کے ان کے قوائے عمل کو اور ضعیف بنایا جاتا ہے

اس وقت سب سے ضروری امر جس کی طرف اکابر اسلام کو توجہ کرنا ہے وہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے جو نہ نمازیں پڑھنے سے دور ہو سکتی ہے نہ یوم النبی منانے سے بلکہ صرف ایک ایسی تنظیم سے جو اُن کی معاشرت و معیشت کو اجتماعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور نہایت آسانی سے ممکن ہے اگر ہمارے یہاں کے علماء و اکابر صرف زکوٰۃ کے

مسئلہ پر توجہ کرکے ایک قومی بیت المال قائم کر سکیں. لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تن آسانیاں اور خود غرضیاں کبھی اس کی اجازت نہ دیں گی اور وہ 'یوم النبی' کی تقریب میں مقالاً مزخرافات کا ایک طومار اور عملاً لہو ولعب کا دلچسپ پروگرام ضرور پیش کر سکیں گے لیکن کام کی کوئی بات کبھی نہ کریں گے.

اس وقت مسلمانوں کی کروڑوں آبادی میں سے اگر ایک کروڑ مسلمان بھی اوسطاً ایک روپیہ سالانہ دینے والے مل جائیں اور یہ رقم ایک جگہ جمع ہو کر قومی اداروں میں صرف ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ربع صدی کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور فقر و فاقہ و بیکاری جس میں مسلمانوں کی اکثر تعداد مبتلا نظر آتی ہے. کتنی آسانی سے دور ہو سکتی ہے

یوم النبی کی تقریب ہندوستان کے ہر گاؤں۔ ہر قصبہ اور شہر کے ہر محلہ میں منائی جاتی ہے اور اس لئے اس سے بہتر کوئی موقعہ عام تنظیم کے لئے نہیں ہو سکتا. ہر محلہ میں ایک ایک کمیٹی چند آدمیوں کی بنا دی جائے جو ماہوار وصولی زکوٰۃ کے ذمہ دار ہوں اور ان کمیٹیوں کا تعلق شہر کی صدر کمیٹی سے ہو. اسی طرح شہروں کی کمیٹیاں صوبہ کی مرکزی کمیٹی سے متعلق ہوں اور صوبائی کمیٹیاں بیت المال عمومی سے وابستہ ہوں جو سارے ملک کا ایک ہو۔ اس کا سالانہ جلسہ ہر جگہ یوم النبی کی تقریب میں منعقد کیا جائے اور رپورٹ پیش کی جائے کہ سب کمیٹیوں نے سال بھر میں کیا کام کیا اور یہ تمام رپورٹیں بیت المال عمومی کے صدر کے پاس جائیں گی. جو ایک بورڈ کے مشورہ سے ہدایات جاری کرے گا۔ ہر محلہ کے مستحقین امداد کی فہرست باقاعدہ مرتب کی جائے اور ایک خاص حد تک شہر کی کمیٹی کو خرچ و امداد کے اختیارات دیئے جائیں۔

الغرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی صورتیں اس سلسلہ میں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں

جو مسلمانوں کے بہت سے نادار طلبہ کو تعلیم دلانے میں مدد دے سکتی ہیں اور خدا جانے کتنے صنعتی مدارس اور تجارتی ادارے قائم کر کے لاکھوں بے کار مسلمانوں کو کام میں لگایا جا سکتا ہے مگر ہمارے اکابر کو کیا غرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور ہمارے علمائے کرام کو کیا پڑی ہے کہ وہ یہ دردِ سر مول لیں۔

عالمگیر مذہب

تاریخ تمدن انسانی پر جس وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طلوع آفتاب کے ساتھ انسان کا قدم ترقی کی طرف اٹھ رہا ہے اور عقائد مذہبی کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب ترقی کے منافی ہے۔ کیا اس کے اصول انسان کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور کیا مذہبی تعلیم دماغی نشوونما اور ذہنی ارتقاء کا ساتھ دینے سے عاری ہے۔

اس کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ مذاہب عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ یقیناً مذہب انسان کی ترقی میں حائل ہے اور اسے حائل ہونا چاہیئے تھا کیونکہ مذاہب عالم کی پیداوار نتیجہ تھی صرف مقامی و نسلی اقتضاء کا اور اس کے ذہن میں تمام نوع انسانی کی فلاح و ترقی کا سوال آ ہی نہ سکتا تھا اگر کوئی مذہب ایشیا کے مغرب میں پیدا ہوا تو اسے مشرق کے باشندوں کا حال معلوم نہ تھا اور اگر مشرق میں اس کا نشوونما ہوا تو وہ اہل مغرب کی طرف سے خالی الذہن تھا۔ صرف ایک مخصوص جماعت [illegible]

محدود ملک کی اصلاح کا مقصد اُن کے سامنے تھا اور اس لئے قدرتاً وہ ایسے اصول بنا ہی نہ سکتے تھے جو کرۂ ارض کے تمام باشندوں کے لئے اُن کے ماحول۔ ان کی معاشرت اور ان کی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہوں۔ میری مُراد مذہب سے یہاں صرف وہ چند معتقدات ہیں، جن کا تعلق نہ صرف خدا کی ہستی یا مابعد الطبیعیات سے ہے بلکہ اس شریعت یا اصول اخلاق و معاشرت سے بھی ہے جو ایک مذہب کے تحت کسی قوم میں رائج ہو جاتے ہیں اور جن کا اختلاف اصولی اختلاف قرار دیا جا کر باہمدگر کشت و خون کا باعث ہوا کرتا ہے۔

دنیا میں سب سے آخری قابل ذکر مذہب اسلام ہوا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے معتقدات دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لئے قابل قبول ہے اور نہ شریعت کے اعتبار سے اُسے مکمل کہا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء ظاہر ہوئے اُن سب نے یہی کہا کہ وہ نوع انسانی کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے ہیں لیکن عملاً وہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہوئے کہ ایک محدود جماعت و مخصوص ملک میں کچھ زمانہ تک تو بیداری ضرور پیدا ہوئی لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ فنا بھی ہو گئی۔ اس کا سبب صرف یہی تھا کہ زمانہ کی ترقی کا ساتھ کوئی مذہب نہ دے سکا اور انسان کے ذہن و عقل میں جو نشو و نما پیدا ہو رہا ہے اس کے اقتضاء کو وہ پورا نہ کر سکا۔

مذہب نام نہ صرف خالص اصلاح اخلاق کا ہے اور نہ ترقی تمدن و معاشرت کا بلکہ اس میں وہ اعتقادات بھی شامل ہیں جو خدا کی ہستی۔ اس کی عبادت اور حیات بعد الموت

سے متعلق ہیں اور اس لئے ایک مذہب صرف ہمارے اصول معاشرت و اخلاق منضبط کرنے کا مدعی نہیں ہے بلکہ وہ انسان کو اس بات پر بھی مجبور کرتا ہے کہ خدا اور اس کی ہستی کی نسبت بعض متعین و مخصوص عقائد کو تسلیم کرے یعنی وہ عقل انسانی پر بھی حکمرانی کرنے کا دعویدار ہے، درآنحالیکہ عقول انسانی میں جو تدریجی ارتقاء پیدا ہو رہا ہے اس کا ساتھ دینے کی اہلیت اس میں نہیں ہے اور غالباً یہی وہ کمی ہے جس کو یوں کہہ کر پورا کیا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ایک طرف ہم کو تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے، یعنی عقل انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے مذہب کے اصول و عقاید متزلزل نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استعمال عقل کے اُن باتوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے کا جن کو ہمارے اکابر و اسلاف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور ان دونوں میں جو تضاد و تباین پایا جاتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ مذہب بالکل مقامی و وقتی چیز ہے۔ یعنی ایک مخصوص قوم و ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر وضع کیا جاتا ہے اور اس کا قوی ترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مذہب سوا اپنے دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے متبعین میں دوسری اقوام یا دیگر مذہب والوں سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں عالم کا امن و سکون اس سے کسی طرح وابستہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس وہ باہمی اختلاف و تصادم پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

ہر چند مذہب کی اس حقیقت کا انکشاف کوئی جدید انکشاف نہیں ہے اس سے قبل بھی اس تلخی کا علم لوگوں کو تھا۔ لیکن چونکہ ترقی تمدن اس حد تک نہ ہوئی تھی کہ تمام

کرۂ ارض کے امن سکون اور جملہ نوع انسانی کی مرکزیت کی طرف خیال منجر ہوتا اس لئے چنداں پروا بھی نہ کی جاتی تھی۔ لیکن اب کہ علمی انکشافات وذرائع نقل وحمل اور تجارتی واقتصادی وسعت نے دنیا کے ہر ملک کو دوسرے ملک کا محتاج بنا دیا ہے۔ سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ دُنیا کا امن وسکون کیونکر قائم رکھا جائے اور باہمی جذبات مخالفت ومنافرت کو دُور کرکے کسی طرح تمام نوع انسانی کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر دیا جائے۔

یقیناً مذہب اس مقصد کو پورا کر سکتا تھا اگر اس کے عقائد وقانون میں اتنی لچک ہوتی کہ وہ ذہن انسانی کی ترقی کا ساتھ دے سکتا لیکن چونکہ مذہب نام ہے صرف قدامت پرستی کا اور انھیں اصول پر کاربند ہونے کا جو صدیوں اور ہزاروں سال قبل وضع کئے گئے تھے اس لئے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہو سکتا اور ایک مذہب پر کیا موقوف ہے اس وقت کوئی نظام عمل جو ذہن انسانی کی تشویش کو دور کرنے اور دنیا میں عام امن و سکون پیدا کرنے کے ناقابل ہے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب اسی کے ساتھ ایک سوال اور بھی غور طلب ہے۔ یعنی یہ کہ اگر آج دنیا سے مذہبیت یکسر فنا ہو جائے اور مذہبی عصبیت بالکل محو کر دی جائے تو کیا مدعا حاصل ہو جائیگا اور کیا کرۂ ارض کے تمام باشندے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بن کر رہنے لگیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً مدعا اس وقت بھی حاصل نہ ہوگا کیونکہ مذہبیت کے علاوہ دو بلائیں اور نوع انسانی پر نازل ہوئی ہیں۔ ایک امتیاز رنگ ونسل کی اور دوسری جذبۂ سرمایہ داری کی یعنی جس طرح مذہب لوگوں میں جذبۂ منافرت کی پرورش کر رہا ہے بالکل اسی طرح گورے کالے کے امتیاز اور فراہمی دولت کی حرص نے انسانیت کو پامال کر رکھا ہے چنانچہ امریکہ میں جو سلوک حبشیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور سرمایہ

داروں کی طرف سے مزدوروں کی محنت و عرق ریزی کا جو صلہ ملتا ہے وہ بھی دنیا کو معلوم ہے وہ اہل نظر جن کی نگاہ ان تمام مسائل پر ہے ان میں سے بعض کا خیال یہ ہے کہ رنگ و نسل کا امتیاز بھی مذہب ہی نے پیدا کیا ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی نتیجہ ہو مذہبیت کا جس نے اخلاق کی آڑ میں سلطنت حکومت کی بنیادیں قائم کیں۔ اس لئے مذہبیت کے ساتھ ان کو بھی ختم ہو جانا ہے۔ مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں اور ان کو جداگانہ امراض تصور کرتا ہوں جن کا علاج بھی بالکل جداگانہ ہونا چاہیئے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ جب تک کلیتہً تمام امراض کے دُور کرنے کی صورتیں پیدا نہ ہو جائیں کسی ایک مرض کا بھی مداوا نہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کا اندفاع دوسری بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ہم میں پیدا کر دے اور اس لئے اگر دنیا سب سے پہلے مذہبیت ہی کو دور کرنا چاہتی ہے تو بیجا نہیں جبکہ حقیقتاً سب سے زیادہ سخت و سنگین مرض یہی ہے۔

اس کے متعلق دنیا میں فی الحال دو قسم کے خیال رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو موجودہ مذاہب میں اصلاح کرکے کسی ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو سرے سے مذہب کے خیال ہی کو محو کر دینا پسند کرتے ہیں۔

ان میں اوّل الذکر صورت یقیناً بہتر ہے لیکن تقریباً ناممکن العمل، دوسری صورت البتہ زیادہ آسان ہے۔ اور لوگوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ چند صدی کے بعد مذہب تو یقیناً ختم ہی ہو جائے گا۔ گو سرمایہ و محنت کی جنگ اور رنگ و نسل کا امتیاز علیٰ حالہ قائم رہے۔

پھر جب آثار یہ ہیں اور حالات کی نزاکت اس حد تک پہونچ گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان جو اختلاف مذہب کے لحاظ سے دنیا کا حد درجہ بدنصیب ملک

ہے، کیا کرنا چاہتا ہے اور اس کے اندر بسنے والوں نے اپنے وطن کو غلامی و ذلت پستی و نکبت سے نکالنے کی کیا تدبیریں سوچی ہیں ——— اس سے یقیناً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک ملک کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا حق جو اس کے فرزندوں پر عائد ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ اس کو کسی اور کی غلامی میں نہ رہنے دیں۔ یعنی ایک ملک و قوم کا تنہا طرۂ فخر و امتیاز صرف یہ ہے کہ اس کی گردن جھکی ہوئی نہیں ہے اور اس کی دولت پر دوسروں کا قبضہ نہیں ہے لیکن یہ ایسی قوت ممکن ہے جب اسکے تمام افراد کسی ایک غرض مشترک سے وابستہ ہوں، ایک مرکز پر مجتمع ہو کر صرف ایک ہی نصب العین کی طرف متفقہ قدم اٹھتے ہوں، پھر کس قدر بدنصیب ہے وہ ملک جس کے فرزند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ صرف اس لئے کہ ان میں سے ایک مسجد میں جا کر عبادت کرتا ہے اور دوسرا مندر میں؛ ایک کے ہاتھ میں تسبیح ہے اور دوسرے کے گلے میں زنار

دنیا میں اور بہت سے ملک ہیں لیکن اس باب میں ہندوستان سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں اور مذہب و مذہبیت کا استعمال جس بری طرح یہاں کے لوگوں نے کیا ہے اس کی مثال اس وقت روئے زمین کے کسی حصے میں نہیں مل سکتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرف توجہ کون کرے، آیا پنڈتوں اور مولویوں کی وہ جماعت جس کے وجود نے یہاں کی فضا کو اس قدر گندہ کر رکھا ہے؟ یا ہماری موجودہ نسل کے وہ نوجوان جو مغربی علوم سیکھنے کے بعد اپنے آپ کو روشن خیال اور آزاد طبع کہلانا پسند کرتے ہیں؟

اصلاح خواص سے شروع ہوتی ہے یا عوام سے۔ یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جب تک عوام میں بیداری پیدا نہ ہو اور پبلک کی اصلاح نہ ہو ہیئت اجتماعی کی تشکیل دشوار ہے۔ پھر غور کیجئے کہ عوام کا کیا حال ہے اور ان پر کس کا اثر غالب ہے؛ اگر ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبہ جدید تہذیب و ترقی کے

تمام نظریوں سے آراستہ ہو کر اصلاح ملک کے لئے آمادہ ہو جائیں تو بھی مولوی کے ایک افسوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے جو وہ ملک کی جاہل آبادی پر کسی واقعہ معجزہ و کرامت کی صورت میں پڑھ کر پھونک دیگا۔ عوام کی اس کورانہ ذہنیت کا بدل دینا جو صدیوں سے نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہے آسان کام نہیں۔ اس کے لئے یا تو اپنی حکومت ہونی چاہیئے جو بزور شمشیر اس تمام فاسد مواد کو دور کر دے جیسا کہ ترکی میں مصطفےٰ کمال، یا ایران میں رضا شاہ پہلوی نے کیا۔ یا پھر تعلیم اتنی عام اور صحیح ہونی چاہیئے کہ پبلک خود دوست دشمن میں تمیز کر سکے جو یقیناً صدیوں کا کام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصلاح کے سلسلہ میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو سامنے آتے ہیں اور عام طور پر تعمیری پروگرام بنانا ہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے حالانکہ اصولاً سب سے پہلے تخریبی فرائض سے سبکدوش ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی عمارت اس حد تک شکستہ و خراب ہو جائے کہ معمولی مرمت اس کے لئے کافی نہ ہو تو اس کا گرا دینا ضروری ہے اور جب تک اس کو پہلے زمین کے برابر نہ کر دیا جائے اس پر دوسری عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی تنظیمی حالت کا بھی بالکل یہی حال ہے کہ اس کے اصلاح کے لئے فی الحال تعمیری پروگرام پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب تک پہلے اس سبب کو نہ محو کر دیا جائے جس نے اس کی بنیاد کو متزلزل کر رکھا ہے اور یہ سب مذہبیت کا وہ غلط مفہوم ہے جسے مولویوں اور پنڈتوں نے پیدا کیا اور جو ان کے فنا ہونے کے بعد ہی دور ہو سکتا ہے۔

دنیا میں جسمانی غلامی کو بہت برا سمجھا جاتا ہے درانحالیکہ جسمانی غلامی نتیجہ ہے ذہنی غلامی کا۔ اس لئے ضرورت تو سب سے پہلے ذہنی غلامی کو دور کرنے کی ہے اور غالباً

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مذہبی عصبیت سے زیادہ ذہنی غلامی پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں۔

اس وقت زمانہ میں علم و عقل کا ایک طوفان برپا ہے۔ مادی ترقی کا سیلاب موجیں مارتا چلا آرہا ہے اور اس لئے اب اگر کوئی بات منہ سے نکلنے کی ہے تو صرف یہ کہ
"مرغابی شو کہ کار با طوفان است"

پھر اگر دنیا کا کوئی مذہب ایسا ہے جو ہماری نجات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے تو سامنے آئے اور ہمیں اپنی دوش پر بٹھا کر ساحل تک پہونچا دے اور نہ خس و خاشاک کی طرح اس کا بہہ جانا بھی یقینی ہے، خواہ وہ آج ہو یا کل۔

حیات و ماورائے حیات

اس دور کے علمائے طبیعیات میں سر آلیور لاج بڑے مرتبہ کا شخص سمجھا جاتا ہے اور اس نے حیات بعد الموت کے متعلق جو عملی تحقیقات کی ہے، وہ خواہ کتنی ہی ناقص و نامکمل کیوں نہ ہو لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ "خیال و قیاس" کا اتنا عظیم ذخیرہ اپنے بعد چھوڑ گیا ہے کہ اس کو ٹھکرا کر آگے گزر جانا آسان نہیں۔ وہ نہ صرف اس بات کا قائل تھا کہ مرنے کے بعد روح قائم رہتی ہے، بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ روح کا تعلق دنیا اور اہل دنیا سے باقی رہتا ہے اور وہ اپنے تاثرات سے بھی مطلع کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنے مرنے والے بیٹے کی روح سے گفتگو کی۔

بہرحال اس نے کسی روح سے واقعی گفتگو کی ہو یا خود اس کا استہوا[1] ذاتی

---

[1] عمل مقناطیسی یا مسمریزم میں ایک عمل کا نام (SUGGESTION) ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

(AUTO — SUGGESTION) ہو اس کے نظریوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے اعتقاد و یقین کی کوئی ایسی علمی توجیہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کی گنجائش نہ چھوڑے، اور اس نے جو کچھ کہا اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے کہا جس کا دوسرا نام (COMMON SENSE) ہے اس لئے بحث و نقد کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ دوسرے کے ذوق کا مطالعہ اپنے ذوق کے لحاظ سے کیا جائے۔

وہ بھی دوسرے مفکرین کی طرح روح کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے کائنات کے معمہ کو حل کرنا چاہتا ہے اور جس وقت وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ نوع انسانی نظام کائنات میں ایسے مختصر سیارہ کی رہنے والی ہے جس کو دوسرے اجرام سماوی کے مقابلہ میں کسی قسم کی کوئی اہمیت حاصل نہیں تو دفعتاً اس کا خیال کائنات کی عظمت کے ساتھ ہی ساتھ انسانی عظمت کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور اس کا دل قبول کرنا نہیں چاہتا کہ جس قوت نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ اسے یوں دفعتاً فنا کر دے

اس رنگ کے سوچنے والوں کی رفتارِ خیال یہ ہوتی ہے۔

۱۔ انسان باوجود اس قدر ترقی کر جانے کے، ہنوز انتہائی مدارج ارتقاء تک

(صفحہ ۲۶۳ کا بقایا حاشیہ) جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو قوت ارادی سے اس حد تک متاثر کیا جائے کہ وہ عامل ہی کی خواہش کا پابند ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی ترجمہ عربی میں عام طور پر استہوا کیا جاتا ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے پوری طرح اس لفظ کے مفہوم پر حاوی ہے AUTO SUGGESTION سے مراد خود اپنے ہی خیال سے متاثر ہو جانا ہے اس لئے اس کا ترجمہ استہوائے ذاتی کیا گیا۔

نہیں پہونچا لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ یقیناً اس کو منزل حقیقی تک پہونچنا ہے، کیونکہ اگر تسلیم نہ کیا جائے تو پھر غایت آفرینش کوئی نہ رہے گی اور یہ سب کچھ فعل عبث قرار پائے گا۔

۲۔ اگر انسان کی دنیاوی زندگی کو دیکھا جائے تو وہ ستر، اسی سال سے زیادہ نہیں ہے جو ادقیانوس زمانہ کو دیکھتے ہوئے ایک قطرہ کے لاکھویں حصہ سے بھی کم ہے، پھر کیا انسان کو یہ عقل و فراست صرف اس لئے دی گئی ہے کہ وہ چند سال تک زندہ رہ کر فنا ہو جائے اور مرنے کے بعد اس کا کوئی مستقبل متعین نہ ہو۔

۳۔ زندگی آتی ہے کہاں سے؟ کسی کو معلوم نہیں۔ چلی جاتی ہے کہاں؟ اس کی بھی خبر نہیں، پھر کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کسی شخص کا وجود عبارت ہے، صرف اس مختصر مدت سے جو اس آنے جانے کے درمیان بسر ہوتی ہے یقیناً نہیں، بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیاوی حیات کوئی ایسا سلسلہ ہے جو دو چیزوں کو ملاتا ہے جن میں سے ایک ازل اور دوسری ابد ہے۔

۴۔ عالم طبیعی کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی - صرف اس کی صورتیں یا حالتیں بدلتی رہتی ہیں جن کو ہم اپنے حواس سے محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے وجود کی حیثیت بدل جاتی ہے جنھیں حواس ظاہری کے علاوہ کسی اور حس سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور جب تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح سے مخاطبت ممکن ہے تو پھر یہ مسئلہ ظن و تخمین کا نہیں رہتا بلکہ واقعہ

حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

۵۔ ہم ایتھر کے قائل ہیں۔ مادہ و قوت کے باہمی تفاعل کو مانتے ہیں۔ درآنحالیکہ ہم کو نہ ایتھر نظر آتا ہے اور نہ کیفیت تفاعل محسوس ہوتی ہے۔

آج حرارت و نور، برق و کہربا وغیرہ تمام طبیعی کیفیات حقائق مسلمہ میں داخل ہیں لیکن کیا کوئی شخص ان کی حقیقت کی علمی توجیہہ (تعلیل) کر سکتا ہے۔ ؟

بعض علمائے حیات کا دعویٰ ہے کہ عقل و زندگی دونوں، دماغ کے وظائف میں سے ہیں۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد اس کی زندگی کی نوعیت بدل جائے جو اس وقت ہماری سمجھ سے باہر ہے ؟

●

الغرض وہ لوگ جو معاد کے قایل ہیں۔ اُن کی طرف سے اسی قسم کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سب کا عنصر مشترک اعتراف "جہل و لاعلمی" کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ ان کے دلائل کی بنیاد صرف اس خیال پر قائم ہے کہ جس طرح ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس وقت یہ سب کچھ کیونکر ہو رہا ہے اسی طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ جو کچھ ہوگا۔ کیونکر ہوگا۔ یعنی اگر انسان اس دنیا میں اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ رہتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جسم فنا ہونے کے بعد بھی اس کی زندگی کسی اور صورت سے قائم رہے۔

وہ سر آلیور لاج ہوں یا کینن ڈایل یا کوئی اور شخص، علمی دنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور دلیل معاد کے ثبوت میں پیش ہی نہیں کی جا سکتی اور چونکہ اس نوع کے دلائل جن میں صرف امکان سے بحث ہوتی ہے، مخاطب کے لئے باعث تسکین نہیں ہوا کرتے

اس لئے انھوں نے عملی طور پر بھی وجودِ روح کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس حد تک دعوے کر بیٹھے کہ وہ روحوں سے گفتگو کرتے ہیں، روحیں ان سے گفتگو کرتی ہیں اور حیات بعد الموت کا بھی تقریباً وہی نظام ہے جو اس دنیا کے عالمِ حیات کا ہے، یعنی جسم سے جدا ہونے کے بعد روحیں محبت کرتی ہیں۔ نفرت کرتی ہیں۔ کھاتی ہیں، پیتی ہیں چلتی پھرتی ہیں اور جو تصویریں ارواح کی شائع ہوئی ہیں۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریشمی کپڑے بھی پسند کرتی ہیں۔ ٹیڑھی مانگ بھی نکالتی ہیں اور اونچی ایڑی کا جوتا بھی پہنتی ہیں۔

اس لئے جب معاملہ عقلی نظریوں سے گزر کر اس حد تک حواسِ ظاہری کے تحت آجائے تو پھر سوا تسلیم کر لینے کے کیا چارہ ہے مگر سوال یہی ہے کہ کیا روحوں سے گفتگو کرنے اور ان کے ظاہر ہونے کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ واقعی صحیح ہیں؟ کیا حقیقتاً جو صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں یا جو آوازیں کان میں آتی ہیں وہ روحوں کی ہیں؟

اس باب میں کافی تحقیق ہو چکی ہے اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ستّو میں اسّی دعویٰ کرنے والے تو بالکل جھوٹے ہیں۔ باقی بیس میں دس ایسے ہیں جو قوتِ مقناطیسی سے کام لے کر دوسروں کو فریبِ نظر میں مبتلا کر دیتے ہیں اور دس وہ ہیں جو خود اپنے اعتقاد و یقین سے مسحور ہو گئے ہیں۔

پھر اگر آلیور لاج وغیرہ کی انتہائی رعایت کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کا شمار اسی آخر الذکر جماعت میں کیا جائے اور ان کو "سودا زدہ" سمجھ کر معاف کر دیا جائے۔

اگر روحوں کو جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی انھیں تمام منازلِ حیات سے گزرنا ہے جو تعلقِ جسم کی حالت میں ان کو پیش آتے تھے تو پھر اس تغیر و تبدل کے معنی کیا

ہوئے۔ اس دنیا میں اس جسم کے ساتھ انھیں کیوں نہ باقی رہنے دیا گیا اور قدرت نے کیوں فضول اتنی زحمت گوارا کی۔

البتہ عقلی توجیہ کے سلسلہ میں جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ جب مادی دنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ روح کو فانی کہا جائے۔ مگر گفتگو سب سے پہلے اس باب میں ہونی چاہیئے کہ جس کا نام ہم نے روح رکھا ہے وہ بجائے خود کوئی جوہر ہے یا صرف عرض یعنی اس کا کوئی وجود علیحدہ پایا جاتا ہے یا اک کیفیت کا نام ہے جو عناصر کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے، مثلاً یوں سمجھئے کہ ہم جس وقت پانی میں شکر حل کر دیتے ہیں، تو پانی میں ایک کیفیت حلاوت و شیرینی کی پیدا ہو جاتی ہے لیکن شیرینی کوئی علیحدہ مستقل چیز تو نہیں۔ اگر ہم پانی سے شکر کو پھر علیحدہ کر دیں تو یہ کیفیت جاتی رہے گی، پھر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس حالت میں شیرینی کہاں چلی گئی تو اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پانی اور شکر کے جدا جدا کر دیئے جانے سے فنا ہو گئی۔

بالکل یہی صورت روح کی ہے کہ بعض مادی اجزا کے باہمی تفاعل یا عناصر کے امتزاج سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا نام زندگی یا روح ہے اور جب وہ امتزاج باقی نہیں رہتا تو وہ کیفیت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس میں کون سا استحالۂ عقلی ہے اور ایسی معمولی بات کے سمجھنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ اگر انسان کی آفرینش کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ چند دن کی عارضی زندگی بسر کر کے فنا ہو جائے تو اس کے پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ سو یہ سوال بجائے خود اتنا لغو و مہمل ہے کہ ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد اس کی لغویت کو سمجھ سکتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کائنات کی بنانے والی کوئی ایسی قادر مطلق ہستی ہے جسے خدا کہتے ہیں تو اس کی حقیقت و عظمت کو سامنے رکھ کر یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہو سکتا کہ اس کے نزدیک ایک کیڑا جو فراست و تعقل سے بالکل بے بہرہ ہے اور ایک انسان جو فہم و عقل کا پتلا ہے دونوں برابر ہیں اور اگر روح کو فانی تسلیم کرنے کی حالت میں خدا پر یہ الزام عائد ہو سکتا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا ہی کیوں کیا تو ایک کیڑے کی طرف سے بھی یہ احتجاج ہو سکتا ہے کہ اگر اسے عقل و فہم سے بیگانہ رکھنا تھا تو کیوں وجود سے عدم میں لایا گیا اس قسم کے دلائل حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتے کیونکہ ان کا تعلق ان معتقدات و مزعومات سے ہے جو صرف "امکان" کی بنیاد پر قائم ہیں اور حقائق کی جستجو کرنے والوں کے نزدیک محض "ممکن ہونا" کوئی چیز نہیں کیونکہ امکان میں جتنی گنجائش اثبات کی ہے اتنی ہی نفی کی بھی ہے۔

اب رہ گیا بحث کا یہ پہلو کہ جب مادی دنیا کی کوئی چیز فنا نہیں ہوتی تو روح کو کیوں فانی مانا جائے۔ اس میں بھی سخت مغالطۂ منطقی پایا جاتا ہے کیونکہ جب روح بجائے خود کوئی مستقل مادی چیز نہیں ہے تو پھر اس کا دوسری مادی اشیاء کے ساتھ کیوں ذکر کیا جائے۔ وہ صرف ایک کیفیت کا نام ہے اور کیفیات کا فنا ہو جانا ہر شخص کے نزدیک مسلّم ہے۔

انسان میں مادی چیز اس کا جسم ہے سو اس کے اجزاء بیشک فنا ہونے والے نہیں۔ وہ ضرور کسی نہ کسی حالت و کیفیت میں بدلتے جائیں گے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس جسم میں ایک کیفیت ایسی پائی جاتی ہے جسے زندگانی یا روح سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ کیفیت باقی نہیں رہتی (خواہ اس کا کچھ سبب ہو) تو اجزاء میں انحلال ہو کر دوسری

صورت قبول کر لیتے ہیں۔

جب جسم زیرِ زمین دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے اجزا کیڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں یعنی اس کا جسم فنا تو نہیں ہوتا لیکن وہ صورت دوسری اختیار کر لیتا ہے پھر ان کیڑوں کو دوسرے بڑے کیڑے کھا لیتے ہیں، ان کیڑوں کو چڑیاں ہضم کر جاتی ہیں، چڑیوں کو دوسرے جانور کھا جاتے ہیں اور اسی طرح ازل سے یہ سلسلہ انحلال و تفاعل کا جاری ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی چیز ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کرتی کہ روح کا وجود علٰحدہ پایا جاتا ہے اور جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے لئے بھی ——— زمان و مکان کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی دوسری مادی اشیاء کے لئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس کی بقا کے لئے مکان و زمان کی ضرورت نہیں تو پھر وجود کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا اور یہ لفظ مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

بقائے روح و معاد کا خیال مذہب کا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ روح باقی رہتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ روح پھر جسم انسانی میں داخل کی جائے گی اور قیامت کے دن وہ سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

آیئے ذرا ماضی کے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

کرۂ زمین پر انسانی آبادی کا وجود پانچ لاکھ سال سے پایا جاتا ہے لیکن اگر اس میں مبالغہ سمجھا جائے تو آیئے ڈھائی لاکھ سال فرض کریں۔

اس وقت آبادی ۰۰۰۰۰۰۰،۴۷،۱ نفوس پر مشتمل ہے اور اموات کی تعداد سالانہ ۴۳۳۲۹۸۱۳ ہوتی ہے اگر گزشتہ ڈھائی لاکھ سال کی اموات کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت عالم برزخ میں کم از کم ۴۲۵۵۳۲۵۰۰۰۰۰۸،۱۰ ارب روحیں

چکر لگا رہی ہیں اگر روح کے لئے کم از کم ½ انچ کے برابر جگہ درکار ہو تو اس وقت تک روحوں نے اتنی جگہ گھیر رکھی ہے کہ اگر اُن کو برابر رکھ کر فیتہ تیار کیا جائے تو ۲۱۳۹۰۷۹ میل ہوگا۔ اور اگر ان روحوں کو جمع کر کے کوئی ستون یا منارہ بنایا جائے تو ½ ۹ میل لمبا تیار بنے گا جس کے چاروں ضلع میں سے ہر ضلع ½ ۹ میل کا ہوگا۔

یہ حساب تو اس وقت تک کی روحوں کا ہوا۔ آئندہ معلوم نہیں کب تک کرۂ ارض قائم رہے گا اور یہ ہجوم ارواح کس حد تک پہنچے گا۔

کہا جاتا ہے کہ بچھڑی ہوئی روحیں وہاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں لیکن کیا یہ کہنا بالکل ایسا ہی نہیں ہے جیسے آپ کسی ریگستان کے تمام ذرّوں کو ہوا میں منتشر کر کے کسی ایک ذرّے سے یہ کہیں کہ جاؤ اور اس ذرّہ کے ساتھ مل جاؤ جس کے پاس سے تم کو اٹھایا گیا تھا۔

اب اسی کے ساتھ اس اعتقاد کو بھی زیرِ تامل کیجئے کہ حشر بالاجساد ہوگا یعنی اس دنیا میں جس جسم کے ساتھ روح متصل تھی وہ جسم پھر پیدا کیا جائے گا تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے لئے کتنی وسیع فضا کی ضرورت ہوگی اور کتنی کروڑ زمینوں کے برابر چٹیل میدان اس کے لئے درکار ہوگا۔

حیرت ہے کہ بقائے روح کو مان کر اس قسم کے مضحک خیالات خدا سے وابستہ کرنے میں تو تامل نہیں ہوتا لیکن سیدھی سی یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ جو خدا ایک بار عدم سے وجود میں لایا ہے وہ پھر وجود سے عدم تک بھی پہونچا سکتا ہے۔

علم و یقین ـــــــ اعتقاد و مذہب

آپ روز سورج کو طلوع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جب ستارہ افق سے بلند ہوتا جاتا ہے اس کی حرارت کو زیادہ محسوس کرتے جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ آپ کے سر سے گزرتا ہوا دوسری سمت کی طرف ڈھل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ ـــــــ آپ اسے واقعہ کہتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ آپ کا مشاہدہ ہے۔ آپ اپنے حواس کے ذریعہ ایسا محسوس کرتے ہیں اور متواتر و پے در پے اتنی بار محسوس کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے آکر یہ کہے کہ آج آفتاب نے طلوع نہیں کیا۔ یا یہ کہ طلوع کرنے کے بعد غروب نہیں ہوا تو آپ اسے جھوٹا کہہ دیں گے، اور آپ باہر نکل کر اس کی تصدیق بھی نہیں کریں گے ـــــــ

انسان کی اس کیفیت کا نام یقین ہے اور یقین بھی ایسا جس کے لئے کسی برہان و دلیل کی حاجت نہیں۔

○

انسان کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک سلسلہ ہے بیشمار لمحات احساس کا یہاں تک کہ اگر آپ اس کو "احساس مسلسل" کہدیں تو بے جا نہ ہوگا لیکن لمحات محض بیکار ہے اگر دنیا میں محسوسات کا وجود نہ ہو۔ اس لئے انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ اپنے "ذوقِ احساس" کو پورا کرنے کے لئے محسوسات کا مطالعہ کرے۔ انسان فطرتاً سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور سکون نام ہے صرف "یقین" کا۔ ریب و شک، ایک بے چینی ہے، ایک اضطراب ہے اور انسان اس الجھن کے دور کرنے پر قدرت کی طرف سے مجبور ہے اس لئے اگر اس کے "احساسات" مطمئن نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "سکون یقین" کی منزل سے ناآشنا ہے۔ اور "احساس" کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے تو صرف محسوسات کی جستجو کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے سے۔

○

عام طور پر محسوسات کی دو قسمیں بتلائی جاتی ہیں۔ ایک محسوسات خارجی دوسری محسوسات ذہنی۔ یعنی ایک وہ جو خارج میں موجود ہیں جیسے درخت، پتھر، پانی وغیرہ اور دوسرے جن کا بظاہر وجود نہیں پایا جاتا، لیکن ہم انھیں محسوس کرتے ہیں جیسے گرمی، سردی وغیرہ مگر میرے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں کیونکہ محسوسات جتنی بھی ہیں تمامتر خارجی ہیں اور جن کو "ذہنی" کہا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی واسطے سے محسوسات خارجی ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یقیناً گرمی یا سردی کوئی مادی محسوس چیز نہیں لیکن جن اسباب کے تحت گرمی یا سردی محسوس کی جاتی ہے وہ "خارجی" محسوسات سے باہر نہیں بے شک محبت و نفرت کا احساس بالکل ذہن سے متعلق ہے لیکن کیا وہ چیز جن سے یہ جذبات متعلق ہیں خارج میں موجود نہیں؟ مادہ اور اعراض دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں بتائی جاتی ہیں، دراں حالیکہ عرض کا وجود مادہ سے کہیں علٰحدہ نہیں،

پھول ہے تو رنگ بھی ہے، بُو بھی ہے، وہ نہیں تو یہ بھی نہیں،

○

یقین کے کئی مراتب و مدارج ہیں۔ ہم دور سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں آگ کا وجود ہے۔ لیکن آگ کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی خبر نہیں ہوتی ہم چل کر وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کسی نے خس و خاشاک جمع کر کے اس میں آگ لگا دی ہے —— ہم وہاں سے واپس آتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ آگ کیسی ہے؟ ہم بتا دیتے ہیں وہ سُن کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن کیا ان کا یہ اطمینان اس درجۂ یقین کو پہونچ سکتا ہے جو ہمیں حاصل ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم کہہ دیتے کہ کسی نے لکڑی جلائی ہے اور وہ یقین کر لیتے۔

ہمیں ایک گھڑا مٹی کا نظر آتا ہے۔ اس کی تازگی دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں پانی ہے، قریب جا کر پانی کو دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے۔ لیکن جب گلاس میں پانی لے کر پی لیتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم،

غور کیجئے کہ یقین کے ان تمام مدارج میں "مطالعۂ محسوسات" کو کتنا دخل ہے اگر خود اپنی سعی و کوشش سے کام لے کر خود اپنی عقل و احساس کو ذریعہ بنا کر کوئی علم حاصل ہو تو وہ ایک "یقین ذاتی" ہے جسے کوئی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر ہم نے صرف دوسروں کی زبانی سن کر کسی بات کو باور کر لیا ہے تو وہ محض "یقین روایتی" ہے جس میں ریب و تزلزل کا زیادہ امکان ہے اور تصدیق قلب کا بہت کم،

○

تصدیق کی یہ منزل اور سکون نفس کا یہ مرتبہ از خود حاصل ہونے والی چیز نہیں

بلکہ پیدا ہوتا ہے محسوسات و موجودات کے مطالعے سے، پھر یہ مطالعہ جتنا غائر ہوگا اتنا ہی بلند ہوگا اور یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اور انسان کے اقتدار کو تمام روئے گیتی پر قائم کرکے اسے خلافت الٰہی کی منزل سے روشناس کیا۔

آئیے ذرا معراجِ خلافت پر بھی غور کرلیں۔

میں ایک وزنی گیند ہوا میں اُچھالتا ہوں۔ وہ فوراً نیچے آجاتی ہے۔ بار بار پھینکتا ہوں وہ بار بار زمین پر آکر گرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ بھاری چیز کبھی اوپر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوسرا شخص اس پر زیادہ غور کرتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ وزن خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نام ہے صرف کشش زمین کا۔ تیسرا ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور سوچتا ہے کہ زمین کی کشش کا مقابلہ کیونکر ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ وہ غبارہ اور ہوائی جہاز بناکر اس مقاومت میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ آج دنیا کا تمام ہنگامۂ ترقی اسی مطالعہ پر قائم ہے اور اسی یقین کی سرزمین سے ارتقاء کے چشمے پھوٹے ہیں، ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان کو خود اپنے ملک کی بھی خبر نہ تھی آج وہ نہ صرف کرۂ ارض بلکہ فضا میں تیرنے والے کروروں اور اربوں میل دور کے کُرّوں کا حال معلوم کرچکا ہے۔ یہ سب کرشمے ہیں یقین کے، جو نتیجہ ہے علم کا،

ایک شخص سوال کرتا ہے کہ اس تمام جدوجہد سے فائدہ؟ جبکہ انسان کو بہرحال فنا ہونا ہے۔ سوال ممکن ہے صحیح ہو، لیکن استدلال غلط ہے۔ انسان انفرادی حیثیت سے فانی ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقائے دوام حاصل ہے۔ انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے۔ اس کے عادات و اطوار میں تغیر ہوسکتا ہے۔ اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے لیکن انسان بہرحال باقی رہے گا۔ کرۂ ارض پر نہ سہی کسی اور کرہ میں،

انسان فطرت کی تخلیق کا مظہر اتم ہے اور اگر آفرینش کو فنا ہے تو انسان کو بھی، ورنہ نہیں، اس لئے انفرادی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنا مقتضائے فطرت کے خلاف ہے۔ قدرت کی مرضی کے منافی ہے۔

آپ سمندر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک نا متناہی سلسلہ ہے موجوں کا دراً نحالیکہ ہر موج اپنی جگہ اٹھ کر فنا ہو جاتی ہے۔ پھر کیا سمندر کا وجود ان موجوں کے فنا ہونے سے ختم ہو جاتا ہے۔ جو موج اس لحہ میں نمودار ہو کر فنا ہوئی ہے۔ اُسے پھر نہیں اُبھرنا لیکن کیا اس سے سمندر کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، بالکل یہی عالم انسان کا ہے کہ اس کے افراد مٹتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ علیٰ حالہٖ اپنی جگہ قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔

○

دنیائے مذہب کے اصول گو کچھ اور ہیں وہاں علم و یقین کا نام اعتقاد ہے اور اس کی تعلیم "کل شئی حادث" (ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے مذہب کے نزدیک انسان نہایت حقیر، عدد رجہ بے بس و بے کس اور مجبور و لاچار مخلوق ہے۔ اس کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی خیال اس کے اختیار میں نہیں۔ جو چاہتا ہے خدا کرتا ہے اور جو چاہے گا کرے گا۔ انسان کا کام صرف سر عجز جھکا دینا ہے اور آنکھ بند کر کے، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر دوسری دنیا کے اس عمیق و تاریک غار کی طرف چلا جانا ہے جس کا علم صرف اس قدر حاصل ہے کہ کچھ معلوم نہیں۔

مذہب کہتا ہے کہ انسان دنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور خدا کی پرستش میں رات دن مصروف رہے۔ لیکن اس سے پوچھئے کہ خدا کیا، اور اس کی پرستش کیوں؟ تو وہ کہتا ہے کہ خدا کی حقیقت پوشیدہ ہے کسی کی قدرت نہیں کہ اس کو

سمجھ سکے اور عبادت اس لئے کہ اس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس نے جس کا حال معلوم نہیں۔ الغرض مذہب کے تمام عقائد کا عنصر عظیم "عدم علم" ہے اور جسے نہ سمجھ سکنے، نہ جان سکنے کا نام وہاں یقین رکھا جاتا ہے۔

○

پھر اگر یہ "عدم علم" کوئی مستقل تعلیم ہوتی تو بھی ایک بات تھی لیکن چوں کہ انسان کی فطرت جستجو پسند ہے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کی یہ خلش دور نہ ہو، اس لئے مذہب اس پر بھی قائم نہ رہ سکا اور باوجود اس کے کہ وہ خود خدا کو نہیں سمجھ سکا تھا لیکن لوگوں کو اس نے سمجھایا۔ باوصف اس کے کہ وہ دوسری دنیا سے بے خبر تھا لیکن دوسروں کو اس سے آگاہ کیا اور اس شان سے اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہ سب کچھ گویا حقائق ثابتہ میں شامل ہے اور محسوسات ظاہری سے متعلق۔

چنانچہ وہی جس کی حقیقت کو وہ نہیں پا سکتا تھا دفعتہً خفا سے ظہور میں آجاتا ہے اور اس انداز سے کہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ چاروں طرف اس کے خدام (ملائکہ مقربین) حضوری میں حاضر ہیں۔ وہ اپنے خاص خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے جس سے خوش ہوتا ہے اس کو باغوں میں بھیج دیتا ہے جس سے برہم ہوتا ہے اس کو آگ میں جھونک دیتا ہے وہ سنتا ہے لیکن کان نہیں رکھتا۔ وہ دیکھتا ہے مگر آنکھوں سے نہیں، وہ بولتا ہے مگر زبان سے نہیں۔ الغرض وہ دنیا ہی کے بادشاہوں کی طرح ایک جلیل القدر بادشاہ ہے اور اس پر کوئی اور حکمراں نہیں۔

وہ بے نیاز مطلق ہے لیکن ہماری عبادتوں کی پروا ضرور کرتا ہے وہ احتیاج سے بلند و ارفع ہے لیکن ہمارے عجز و نیاز کی اس کو ضرورت یقیناً ہے وہ کسی چیز سے متاثر نہیں

ہوتا لیکن نافرمانی سے اس کو غصہ یقیناً آتا ہے۔ وہ بے انتہا رحم و کرم والا ہے، مگر گناہ گار کو بغیر آگ میں جھونکے نہیں مانتا۔

وہ موجود ہے لیکن زمان و مکان سے بے نیاز، وہ ہر لمحہ میں قدیم ہے لیکن لمحہ فنا ہو جاتا ہے اور وہ نہیں۔ وہ عادل ہے لیکن عدل کا پابند نہیں جس کو چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے۔ علم کہتا ہے کہ یہ اجتماع اضداد کیسا، مذہب کہتا ہے کہ خدا کی مرضی۔ علم کہتا ہے کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوئیں، مذہب کہتا ہے خدا کے برگزیدہ بندوں کے کہنے سے، علم کہتا ہے کہ اس کی برگزیدگی کا علم کیونکر ہوا جواب ملتا ہے کہ انھیں کے قول سے ——— علم سوال کرتا ہے کہ کیا انسان بغیر تحقیق کئے ہوئے محض دوسروں کے کہنے پر اپنے نفس کو مطمئن کر سکتا ہے۔ جواب دیا جاتا ہے کیوں نہیں۔ علم پوچھتا ہے کہ کیا یقین اسی کا نام ہے مذہب کہتا ہے بے شک۔

○

مذہب کی تعلیم ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے یعنی محسوسات کی یہ ٹھوس دنیا بالکل عارضی چیز ہے اور محض ایک پرتو ہے اس دوسری دنیا کا جو ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے ——— مگر وہ دوسری دنیا کیسی ہے؟ اس میں بہشت ہے، دوزخ ہے، دیدار خداوندی ہے یا اس سے مہجوری۔ باغ و راغ ہیں حور و قصور ہیں، فواکہ و اثمار ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں ہیں، کوئی فکر نہیں ہر وقت آزادی سے کھاؤ پیو اور وہ سب کچھ کرو جس سے اس دنیا میں باز رکھا جاتا ہے۔ یا پھر دہکتی ہوئی آگ کے غار ہیں، اژدہے ہیں، بچھو ہیں۔ خون و پیپ ہے، چیخ ہے، کراہ ہے۔ پوچھئے۔ کیا وہاں رقص و سرود بھی ہے ——— کیوں نہیں درختوں پر چڑیاں چہچہاتی ہوں گی

کیا وہاں موٹر، ہوائی جہاز، ریل بھی ہے ——— بے شک ہے،
انسان نے کسی جگہ پہنچنے کا خیال کیا اور فوراً پہونچ گیا۔ یعنی،
"آنکھ کی بند ہوا کوچۂ جاناں پیدا"
کیا وہاں "زہرۂ صبح و جام بلور" بھی میسر ہے ——— اس کا کیا ذکر
کیونکہ وہاں تو ہر وقت صبح صادق ہی رہے گی اور جام بلور کیا معنی، وہاں تو دنیا کے قیمتی سے قیمتی جواہر سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آئیں گے ——— بالکل درست لیکن پوچھیے کیا انسان کو کسی شے کے حصول کے لئے جد و جہد کرنا پڑے گی۔ کیا یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ ممکن ہے فلاں چیز ہم کو نہ ملے، یا ملنے کے بعد ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کا جواب بالکل نفی میں ملے گا۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانی تو بدستور اس دنیا میں بھی یہی رہے گی لیکن لذت والم کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ گویا ان کا وجود احساسِ انسانی اور اس کی فطرت سے علیحدہ قائم ہے،

○

اب ذرا گہرائی کی طرف چلیے اور غور کیجئے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک زمانۂ غیر معلوم تک عالم برزخ میں رہنا اور پھر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز "پُل صراط" پر چل کر دوزخ یا جنت تک پہنچ جانا کیا غایت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مصلحت خداوندی ہر جگہ اور ہر بات میں کارفرما ہے۔ لیکن موت کے بعد انسان کا تمام سخت و صعب مراحل سے گزر کر عذاب یا ثواب کی دائمی زندگی بسر کرنا کس نتیجہ کے لئے ہے۔ بہشت و دوزخ سے کسی کو لوٹ کر پھر دنیا میں جانا نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حالات معلوم کر کے تخویف یا ترغیب ہو، پھر خدا کی اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے

کہ وہ انسان کو زندگی دوام عطا کر کے بقسلوں اپنا شریک تو بنا لیتا ہے لیکن دنیا داروں کے لئے مایۂ عبرت و بصیرت بنانے کے لئے تیار نہیں،

○

صدیاں گزر گئیں کہ مذہب کی تعلیمات بدستور اسی طرح اپنے لغوی معنیٰ کے لحاظ سے دنیا میں کارفرما ہیں یہاں تک کہ علم نے بڑھ کر اس کو چیلنج دیا، ظاہر ہے کہ مشاہدات کا جواب قیاسات سے اور "یقینیات" کا مقابلہ "ممکنات" سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے عقاید مذہب کے ظاہری معنیٰ سے عدول کر کے ایک باطنی مفہوم پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف تشبیہات و استعارات ہیں لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے خطیبانہ انداز بیان ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ مراسم و شعائر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکا، اور اس جواب کی حقیقت جان چھڑانے سے زیادہ اور کچھ نہ رہی۔ علم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا، سیلاب کی طرح اٹھا اور درمیان کی تمام چٹانوں کو کاٹتا ہوا چلا گیا۔ جن چیزوں کو ساتھ دینا تھا وہ ساتھ چلی گئیں جن کو یہ منظور نہ تھا وہ اپنے منتشر اجزا لئے ہوئے پیچھے رہ گئیں اور مذاہب عالم کا یہی حشر ہوا۔

○

مگر دنیا کے تمام مذاہب میں ایک مذہب ایسا تھا جو اس طوفان کا ساتھ دے سکتا تھا علم کے اس سیلاب کا شناور بن سکتا تھا۔ لیکن اس کو دنیا فراموش کر چکی ہے خود اس کے ماننے والے اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اگر انھیں کوئی یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے تو اسے باغی سمجھ کر نکال دیتے ہیں ——— اس مذہب نے کبھی اس بات کی تلقین نہیں کی کہ تم بغیر سمجھے ہوئے لغو اعتقادات کا اتباع کرو بلکہ

اس نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ اپنی فکر و کوشش سے کام لو، غور و تدبر کرو۔ کائنات کا مطالعہ کر کے حقائق اشیاء کا علم حاصل کرو۔ دنیا میں ہمیشہ آگے قدم بڑھاؤ اور ترقی کی اس چوٹی تک پہنچ جاؤ جہاں سے نیابت خداوندی کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ نیابت خداوندی کیا ہے؟ وہ انسان کی انتہائی کامیاب تمناؤں کی بہشت ہے، استقلال و ترقی کی سکون بخش جنت ہے، کامرانیوں کی سلسبیل ہے، مسرتوں کی جوئبار ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر انسان نے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی تو ذلت و نکبت کی آگ ہے، پستی و خسران کے دل جلا دینے والے شعلے ہیں اور پامالی کی وہ تکلیفیں ہیں کہ سانپوں کی پھنکار اور بچھو کے نیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

O

مگر ہے کوئی آج جو صرف اس تعلیم کو اساس مذہب بتلائے اور ہے کسی میں ہمت جو پوست کو علیحدہ کر کے مغز پیش کرے۔ علم اپنے یقین کا پرچم لئے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا ہے، کائنات کو مسخر کر کے بہشتوں اور جنتوں کو اپنے لئے مخصوص کرتا جا رہا ہے نعائم ولذائذ کو سمیٹ سمیٹ کر دامن مراد بھر رہا ہے ——— لیکن مذہب بدستور اپنی محکمات کے اوہام میں مبتلا ہے۔ قیاسات کی دلدل میں گرفتار ہے۔ اس نے منہ پشت کی طرف کر لیا ہے اور کہہ رہا ہے منزل ادھر ہے۔ وہ سکون کا طلبگار ہے۔ وہ سکون جس میں موت کی سی غفلت ہو۔ پتھروں کا ساجمود ہو وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی پامالی دوسری دنیا کا عروج ہے یہاں کی ذلت وہاں کی عزت ہے حالانکہ بتلانے والے نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ھل یھلک الا القوم الفاسقون سے اسی دنیا کی ہلاکت مراد ہے اور فاسق وہی ہے جس نے اسی آب و گل کی دنیا میں جد و جہد ترک کر دی۔

انسانی زندگی کا معیار اور ہمارے علماء کرام

عہد حاضر میں علوم ریاضیہ کی ترقی نے ذہن انسانی میں عجیب قسم کی جستجو پیدا کر دی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز کی ناپ تول کر سکے۔ اس کے عرض و طول، بلندی و عمق کا اندازہ کر سکے اور جب اس سے سوال ہو کہ فلاں امر کی حقیقت کیا ہے تو وہ بتا سکے کہ اس کی حدود یہ ہیں۔ اس کے ابعاد ثلثہ کی پیمائش یہ ہے اور اعداد و شمار کے لحاظ سے اس کو یوں بیان کر سکتے ہیں۔ پھر یہ ذوق انھیں چیزوں تک محدود نہیں جو مادی ہیں مرئی ہیں۔ جامد ہیں۔ بلکہ کیفیات و جدانیات کی تحقیق بھی انھیں خطوط پر کی جاتی ہے اور بالکل ریل کی رفتار کی طرح اخلاق انسانی اور تخیل دماغی کا بھی ایک مقیاس ہو سکتا ہے ——— لیکن سوال یہ ہے کہ حیات انسانی کا مقیاس کیا ہے اور عام طور پر جو نظریہ اس کی پیمائش کا قائم کیا جاتا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔

ایک شخص کی زندگی پر جب گفتگو کی جاتی ہے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ

وہ اتنی مدت تک زندہ رہا اتنے سال اور اتنے مہینے جیا جوان مر گیا بوڑھا ہو کر مرا، لیکن کیا یہ معیار درست ہے؟ غالباً نہیں کیونکہ یہ معیار انسان کی زندگی کا نہیں بلکہ اس کے جسم کی زندگی کا ہے۔

سکندر صرف ۳۲ سال تک اس دنیا میں زندہ رہا حالانکہ وہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح سے اس وقت تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مسیح صرف ۳۳ سال زندہ رہے لیکن اپنی زندگی کے آخری تین سال میں وہ اس طرح جیے کہ اپنے آپ کو خلعت دوام بخش گئے۔ اسی طرح دنیا کے اور بڑے بڑے مفکرین اور تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں کو لیجئے کہ وہ آج موجود نہیں ہیں لیکن ان کے کام ہنوز باقی ہیں اور روزانہ ہزاروں لاکھوں زبان پر ان کا نام آجاتا ہے۔

ممکن ہے بعض کا خیال ہو کہ حیات انسانی کا معیار لذت و عیش، جاہ و ثروت ہے یعنی زندگی نام ہے لطف و نشاط کے ساتھ عمر بسر کر دینے کا۔ جاہ و ثروت کے حصول کا۔ لیکن محض ذاتی لذت اور زر و دولت کا انبار اپنے بعد کوئی نقش چھوڑ جانے والا نہیں اور اس لئے اجتماع بشری کی تاریخ ایسے لوگوں کی زندگی سے اعتنا نہیں کرتی۔

———— بنا بر آں اگر صحیح معنیٰ میں حیات انسانی کا کوئی معیار و مقیاس ہو سکتا ہے تو وہ مقیاس اجتماعی ہے یعنی یہ کہ ایک شخص نے قوم کی کیا خدمت انجام دی۔ ملک و ملت کی اصلاح و فلاح کے لئے کیا کیا قربانیاں کیں اور دوسروں کو اپنے ذہنی یا مادی اکتسابات سے کیا فائدہ پہونچایا۔

دنیا کے جدید اجتماعی نظریئے زر و دولت کے مسئلہ کو صرف اسی حد تک اہمیت دیتے ہیں کہ وہ نوع انسانی کو فائدہ پہونچانے والے ہیں کیونکہ دولت کا انبار بجائے

خود بالکل مہمل چیز ہے۔ اگر اس کی اعتباری قوت کار برآری کو نظرانداز کر دیا جائے اور یہیں سے اختلاف کی دو راہیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ایک کا نام سرمایہ داری اور دوسری کا مطالبۂ محنت و عمل ہے پھر جس رفتار کے ساتھ یہ احساس قوی ہوتا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر یہ حکم لگانا دشوار نہیں کہ وہ وقت قریب ہے جب ایک تاجر کی تجارت، ایک سائنس داں کی ایجادات، ایک صناع کی صنعت گری سب کا مدعا صرف مفاد جمہور کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا اور اکتساب زر یا فراہمی دولت کا کوئی سوال دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ پھر آئیے اس سلسلہ میں غور کریں کہ مذہب اس امر میں کس حد تک نوع انسانی کا ساتھ دینے والا ہے؟

جس حد تک مقصود یا غایت کا تعلق ہے ہم کو ماننا پڑے گا کہ مذہب کی تعلیمات یکسر مفاد جمہور پر مبنی ہیں اور تمدنی نقطۂ نظر سے وہ امن و سکون ہی کا خواہشمند ہے لیکن تاریخ مذہب بالکل اس کے برعکس ہم کو یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدامنی و خونریزی مذہب ہی کی بدولت ہوئی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ہم کو اصول مذہب کی جستجو تاریخ سے ہٹ کر صرف اس کی تعلیمات میں کرنی چاہیئے اور اگر ایک بار یہ بات اصولاً متعین ہو جائے کہ دنیا کا امن و سکون یا نوع بشری کی فلاح صرف مذہب ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ کہ مذہب سے زیادہ اس کا کوئی حامی نہیں۔ تو پھر اس کا فیصلہ چنداں دشوار نہیں کہ مذہب اپنے عمل یا تعلیمات زندگی کے لحاظ سے کسی ایک جگہ ٹھہر جانے والی چیز ہے۔ یا ترقی تمدن کی سطح کے ساتھ ابھرنے اور بلند ہو جانے والی۔

اس باب میں سب سے بڑی غلطی علمبرداران مذہب نے یہ کی ہے کہ انھوں نے

عقیدہ، عمل اور مقصود کے باہمی ربط و تناسب کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور بجائے اس کے کہ مقصود کی اہمیت کو سامنے رکھ کر عمل و عقیدہ کو اس کا تابع یا ذریعہ قرار دیں، صرف نوع کو اصل چیز سمجھ لیا اور مقصود کو اس کی تابعیت میں دے کر مذہب کو نیست و نابود کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مذہب سے اس کے عقائد کو علیحدہ کر دیں تو اس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور وہ کوئی مرکز ایسا نہ پیدا کر سکے گا جس پر کسی جماعت کے افراد کا اجتماع ہو سکے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "عقائد" ہی اصل چیز ہیں بڑی کم فہمی کی بات ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ مذہب کے عقیدہ کا اصل الاصول ایک خدائے قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کرنا ہے لیکن صرف ذہن میں ایسا سمجھ لینا یا زبان سے اس کا اقرار کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر اس عقیدہ کے تحت ہم اپنے اعمال و افعال میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں اور یہ اعمال و افعال بھی بے کار ہیں، اگر ان سے ہمارے نظام تمدن یا ہماری اجتماعی زندگی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے ——— یہی حال صوم و صلوٰۃ کا ہے کہ محض قیام و قعود یا صبح سے شام تک بے آب و نان بسر کر دینا فی نفسہ لایعنی حرکت ہے۔ اگر اس سے کوئی اخلاقی نتیجہ نہ برآمد ہو اور اخلاق کا تعلق چونکہ صرف انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے اس لئے اعمال مذہبی اور اوراد و وظائف اور دعا و توبہ کے رد و قبول کا معیار صرف یہ ہونا چاہیئے کہ سب سے زیادہ پابند صوم و صلوٰۃ نے سب سے زیادہ خدمت خلق کی انجام دی ہے یا نہیں اور وہ شخص جس نے تین لاکھ مرتبہ سورۂ مزمل پڑھ کر اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے اس نے سوسائٹی کے لئے کس قدر ایثار سے کام لیا ——— دنیا کے تمام مذاہب کا مقصود عبادت

دنیا ایش یہ رہا ہو یا کچھ اور مجھے اس سے بحث نہیں لیکن اسلام کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اس کا نصب العین صرف یہی تھا اور اس نے عبادت کو محض عبادت کے لحاظ سے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اس نے نماز کی تعلیم دی۔ صرف اس لئے کہ باہمی اتحاد و تعاون پیدا ہو۔ اس نے روزہ فرض کیا محض اس غرض سے کہ ہم میں ابنا جنس کی اقتصادی مشکلات کا احساس پیدا ہو۔ اس نے حج کی ہدایت کی صرف اس مقصد کے ساتھ کہ اسلام کو بین الاقوامی چیز بنایا جائے۔ اس نے ادائے زکوٰۃ کو لازم قرار دیا فقط اس غرض کے ساتھ کہ قوم کا ایک مرکزی بیت المال قائم رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ عہد رسالت قوم کے اس عظیم الشان تعمیری پروگرام کو پورا کرنے کے لئے بہت مختصر ثابت ہوا اور عہد خلفاء میں بھی بعض سیاسی اختلافات کی وجہ سے اس کی بنیاد مضبوط نہ ہو سکی، ———

یہاں تک کہ آخرکار بنو امیہ کا دور ملوکیت شروع ہو گیا اور اسلام کی روح اجتماعیت انسان پرستی، ہوس ملک گیری اور تکمیل استبداد و سرمایہ داری میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اسلام نے زعامت دینی و دنیوی Temporal & Spiritual power کی تفریق اسی لئے گوارا نہیں کی کہ ملوکانہ استعمار و استحصال کی خواہش لوگوں میں پیدا نہ ہو اور ایک قاید و رہنما یا سلطان و فرمانروا کی خصوصیت یہ نہ قرار پائے کہ وہ ملک کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے بلکہ اس کے لئے وجہ امتیاز یہ ہو کہ وہ ملک و قوم کا سب سے زیادہ جفاکش خادم ہے اور تقسیم دولت میں وہ اسی سطح پر نظر آتا ہے جہاں دوسرے افراد قوم پائے جاتے ہیں ——— پھر تاریخ شاہد ہے کہ اس لحاظ سے رسول اللہ کی زندگی کیا تھی، اور آپ کے بعد خلفاء راشدین نے کس حد تک اس اصول کی پابندی کی ———

لیکن جب عہد امیر معاویہ شروع ہوا تو حکومت اسلام ختم ہو کر حکومت عرب قائم ہوئی اور اسلام کی ظاہری پابندی صرف اس لئے قائم رکھی گئی کہ مصلحت کا اقتضاء یہی تھا[1]۔ الغرض اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس ہوئے دنیا کو مشکل سے ایک چوتھائی صدی کا زمانہ گزرا ہوگا کہ واقعات و حالات نے اسے محو کرنا شروع کیا۔ اور زعامت دنیوی کے ساتھ ساتھ زعامت دینی سلاطین اسلام کی اتنی ضعیف ہوگئی کہ آخر کار پبلک پر اثر قائم رکھنے کے لئے ایک جماعت علمائے مذہب کی علیحدہ ایسی پیدا کی گئی جو حکومت کا ساتھ دینے والی ہو۔ اور جس وساطت سے دنیاوی حکومت کو مضبوط بنایا جائے۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے لبریز ہیں کہ علماء مذہب نے سلاطین و امراء کی اغراض پوری کرنے کے لئے حدیثیں وضع کیں۔ واقعات تاریخ کو مسخ کیا اور شریعت میں بہت سی ایسی تبدیلیاں کیں جو فرمانروائے وقت کے اغراض و مصالح کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں۔ ہر چند علمائے سلف میں بعض ایسے نفوس بھی تھے جنہوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کہنا کبھی گوارا نہیں کیا (مثلاً جناب ابو حنیفہ کہ انہوں نے اموئین و عباسئین دونوں کے کوڑے کھانا محض اس لئے گوارا کئے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف علوئین کو قرار دیتے تھے) لیکن عنصر غالب انہیں علماء کا تھا۔ جن کا علم دین حاکم وقت کی خواہشوں کے مطابق سانچہ میں ڈھل جاتا تھا اور جن کے احکام و فتاویٰ کو شاہان وقت بہ جبر ملک میں رائج کرتے تھے۔

---

[1] امیر معاویہ نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اہل مدینہ سے جن الفاظ میں خطاب کیا تھا ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے امیر معاویہ کو کتنی محبت تھی وہ الفاظ ملاحظہ ہوں و لقد رضیت لکم نفسی علی عمل ابن ابی قحافہ (ابی بکر)، واردتہا علی عمل عمر فنفرت من ذلک نفاراً شدیداً واردتہا علی ثنیات عثمان فابت علی فسلکت بہا طریقاً لی فیہ منفعۃ ولکم فیہ منفعۃ مع مؤاکلۃ حسنۃ ومشاربۃ جمیلۃ فان لم تجدونی خیرکم فانی خیر لکم ولایۃ

چنانچہ فقہ حنفی کا ابو یوسف کے فتاویٰ کے مطابق مدون ہونا اور ان کے استاد ابو حنیفہؒ کا اقوال پر عمل درآمد نہ ہونا اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔

الغرض جب فرمانروائے وقت کی دینی کمزوریوں کے اثرات کو دور کرنے کے لئے علمائے مذہب کی خدمات حاصل کی گئیں تو اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ اسلام کی وہ روح فنا ہو جائے جو شاہ و گدا کے امتیاز کو مٹانے والی تھی جو بنی نوع انسان میں حریت و مساوات کا ذوق پیدا کرنا چاہتی تھی اور جو سرمایہ داری کی اسی لئے مخالف تھی کہ اس سے افرادِ قوم میں بالکل غلط اصول پر تفریق مدارج قائم ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب رفتہ رفتہ حکومت دنیوی ضعیف ہونے لگی اور اسی کے ساتھ علمائے مذہب کا وہ جاہ و جلال بھی مٹنے لگا جو حمایت حکومت کی وجہ سے انھیں حاصل ہوا تھا تو انھیں فکر لاحق ہوئی کہ اس سیادت کو کیونکر قائم رکھا جائے اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے "ادارۂ کہانت" کی بنیاد پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام رفتہ رفتہ مذہب کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہو گئے اور دین اسلام نام رہ گیا صرف اُن باتوں کا جو ہمارے علماء بتائیں اور مذہبی لٹریچر کو شجرِ ممنوع قرار دے کر عوام کو اس کے مطالعہ سے روک دیا گیا۔ تاکہ وہ ہمیشہ علمائے دین کے محتاج رہیں اور خود اُن میں غور و فکر کی صلاحیت کبھی نہ پیدا ہو۔

اس وقت جو حالت ہمارے ہندوستان کے علمائے کرام کی ہے وہ اسی کاہنانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے نہ صرف بلحاظ ذہنیات بلکہ ظاہری وضع و صورت کے اعتبار سے بھی انھوں نے اپنے آپ کو قوم کے دوسرے افراد سے جدا کر لیا ہے اور اس طرح اپنے اور عوام کے درمیان بینہما برزخ لا یبغیان کی ایسی زبردست حد فاصل کھینچ رکھی ہے کہ اس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قوم اور ہر جماعت کے لئے ایک قائد و رہنما کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور عوام کی ذہنیت کو گمراہی سے بچانے کے لئے کسی نہ کسی ایسے دماغ کا پایا جانا لازم ہے جو اُن پر خاص اقتدار رکھتا ہو، اسی کے ساتھ یہ بھی بالکل درست ہے کہ ایک پابند مذہب جماعت کے لئے یہ خدمت بہترین طور پر وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو مذہبی اقتدار رکھتا ہو لیکن سوال یہ ہے کہ مذہبی سیادت کا کیا مفہوم ہے اور ہندوستان کے علمائے اسلام اس سے کیا کام لے رہے ہیں!

یوں تو مذہب بظاہر نام ہے صرف چند مخصوص عقائد کا، لیکن مقصود بالذات محض عقائد نہیں ہیں بلکہ اُن کی وساطت سے ایک غرض مشترک ایک مرکز اجتماع پیدا کرنا ہے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اپنے علمائے کرام کے اعمال و افعال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ انھوں نے اسلام کے مفہوم کو واقعتاً سمجھا بھی ہے یا نہیں ہمارے علماء مختلف مدارج و اقسام کے ہیں۔ ایک تو سب سے ادنیٰ قسم وہ ہے جو قرآن حفظ کرکے اور فقہ کی چند کتابیں پڑھ کر "امامت" کی حد سے آگے نہیں بڑھتی اور مسجد کے حجرہ میں بظاہر راہبانہ زندگی بسر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان علماء کا ہے جو درس تدریس کی چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے ہیں اور تعلیم قدامت پرستی سے قوم کے بچوں کا دماغ خراب کرنے کے لئے ایسا زیادہ معاوضہ بھی نہیں لیتے۔ تیسرا درجہ ان معلمین و اساتذہ کا ہے جو قومی تعلیم گاہوں میں فضیلت کی پگڑی تقسیم کرنے کے ذمہ دار ہیں اور بہ سلسلہ مسائل شرعیہ وہ احکام صادر کیا کرتے ہیں جن کا تعلق صدہا سال قبل کے تمدن سے ہے۔ چوتھا درجہ ان علماء کا ہے جنھوں نے بیعت تو بہ و سلوک کے اڈے قائم کر رکھے ہیں اور جو خود تو "فنا فی اللہ" ہونے کے مدعی ہیں لیکن اپنے مُریدوں کو "فنا فی الشیخ" کے درجے سے آگے بڑھانا خلاف

مصلحت سمجھتے ہیں۔ پانچواں اور غالباً سب سے اعلیٰ درجہ ان علماء کا ہے جو سیاسیات میں حصّہ لینے کے مدعی ہیں اور جنھوں نے اس غرض کے لئے جمعیتیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔

خیر اوّل دو قسم کے مولویوں کو چھوڑیئے کیونکہ ممکن ہے ان کو علماء کے گروہ میں شامل ہی نہ کیا جائے لیکن غایت و نتیجے کے لحاظ سے مؤخر الذکر تین قسم کے علماء بھی ہم کو ویسے ہی نظر آتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس نے مسلمانوں کی تمدنی و معاشرتی اقتصادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح کو اپنے لائحۂ عمل میں شامل کیا ہو اول تو خود ان میں باہمد گر ایسی حریفانہ کشمکش پائی جاتی ہے کہ عوام کے لئے یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کس کے خلوص پر اعتبار کیا جائے جمعیۃ العلماء کانپور کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا جمعیۃ العلماء دہلی کے مشورہ پر لیکن اگر یہ اختلاف و تصادم نہ ہو تو بھی اُن کے وجود کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ اگر شہر کے بہشتی، معمار اور کفش دوز باقی نہ رہیں تو لوگوں کو واقعی بہت تکلیف پہنچے لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہو جائے تو قوم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ نماز روزہ کا رواج کم ہو جائے گا۔ مسجدیں ویران ہو جائیں گی۔ یا بالفاظ دیگر یہ کہ روحانیت مفقود ہو جائیگی لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روحانیت نام اسی نکبت و ذلّت کا ہے جو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں پر طاری ہے اور صوم و صلوٰۃ کا رواج یا مسجدوں کی آبادی و رونق موجودہ علمائے کرام کی سرکردگی میں اسی قسم کی روحانیت پیدا کر سکتی ہے تو عذاب الٰہی کس چیز کا نام رکھا جائے گا اور قہر خداوندی کی اور کیا صورت قرار پائے گی۔

یہ امر غور طلب ہے کہ قرونِ اولیٰ میں بھی جب مسلمانوں کی ترقی سیلاب کی طرح بڑھ رہی تھی بالکل یہی نماز تھی اور یہی قیام و قعود، یہی روزہ تھا اور یہی اسحار وافطار پھر اب کیا

ہوا کہ طاعت و گناہ کسی میں وہ لذت باقی نہ رہی۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ پہلے نمازیں پڑھی جاتی تھیں اصلاح نفس و اعمال کے لئے احیائے قومیت کے لئے احساس اجتماعیت کے لئے اور اب طاعت و عبادت بے روح ہے بے مقصود ہے۔ کوئی منزل سامنے نہیں، کوئی ہدف پیش نظر نہیں۔ پہلے مسلمان نماز پڑھتا تھا تو دنیا ہی میں طرح فردوس ڈالتا تھا۔ اپنے لئے یہیں حور و قصور پیدا کر لیتا تھا اور اب وہ سب کچھ "وعدۂ فردا" کی امید پر کرتا ہے اور اسلام کو اس دنیا سے بالکل علیحدہ کر کے اس آخرت سے متعلق سمجھتا ہے جہاں نہ سوال جد و جہد کا ہے نہ سعی و عمل کا۔ اور یہ وہ ذہنیت ہے جو اسلام کے غلط مفہوم کی تبلیغ سے پیدا ہوئی ہے اور جس کے ذمہ دار یقیناً ہمارے مذہبی علماء ہیں۔

بعض حضرات انسانی ترقی کو دنیاوی فتوحات سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسلام کا مدعا کسی سلطنت کا قیام یا حکومت کی بنیاد ڈالنا نہ تھا لیکن ایسا کہنا نہ صرف واقعات کی تکذیب ہے بلکہ اسلامی تعلیم کی بھی مخالفت کرنا ہے۔ رسول اللہ اور خلفاء کا جنگ کر کے لوگوں کو مسلمان بنانا، مال غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کرنا مفتوحہ ممالک کی آمدنی سے بیت المال قائم کرنا اسی لئے تھا کہ عربوں یا مسلمانوں کی حکومت دنیا میں قائم ہو اور غالباً یہ کوئی گناہ نہ تھا۔ کیونکہ ایک قوم کی ترقی کا کوئی مفہوم متعین ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کا کوئی خاص اقتدار قائم نہ ہو اور یہ اقتدار یقیناً اسی دنیا سے متعلق ہونا چاہیئے ورنہ مرنے کے بعد جب نہ سوال مسابقت کا ہوگا نہ سعی و نتیجہ کا۔ اگر محض عروج روحانی ہوا بھی تو بے کار ہے اور اس کی تعلیم و تلقین اس عالم میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ دنیا کے بعض مذاہب نے صرف روحانی پاکیزگی ہی کو اپنا اصل مقصد قرار دیا تھا اور اس دنیا میں تکلیفیں اٹھا اٹھا کر ختم ہو جانے کو حیات ابدی بتایا؛

لیکن اسلام کی تعلیم یہ نہ تھی، اس نے اپنا مذہبی آئین اسی دنیا سے متعلق رکھا اور تمام وہ تدابیر بتائیں جو ایک قوم کی زندگی کو من حیث القوم کامیاب بنا سکتی ہیں۔ اس نے اگر اخوت و ہمدردی کی تعلیم دی تو دوسری طرف دشمنوں سے جنگ کرنے کا بھی حکم دیا اور اگر اس نے یہ بتایا کہ نجات روحانی کا ذریعہ اخلاق کی پاکیزگی ہے تو اسی کے ساتھ یہ راز بھی ظاہر کر دیا کہ :-

"جس نے اس دنیا میں اندھوں کی طرح زندگی بسر کی وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا"

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے تعلیمات اسلامی میں صرف روزہ و نماز کو تو لے لیا۔ لیکن اس جوش عمل اور اس ولولۂ ترقی کو نظرانداز کر دیا جس کے پیدا کرنے کے لئے طاعت و عبادت کی پابندیاں پیدا کی گئی تھیں۔ انھوں نے دوزخ کے اژدہے اور جنت کی حوریں تو یاد رکھیں لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ جہنم میں جو چیز اژدہا بن کر ڈسنے والی ہے وہ اسی نکبت و ذلت کی دوسری صورت ہے جو اس دنیا میں کسی قوم پر مستولی ہو جاتی ہے اور جس لذت کو حور کہا جاتا ہے وہ اسی عروج و ترقی کا نام ہے جس کے بدولت ایک جماعت اسی دنیا کو جنت بنا لیتی ہے۔

آج ہمارے علمائے کرام ہم سے نمازیں تو پڑھوا لیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتلاتے کہ کس نعمت کے شکریہ میں ان متواتر سجدوں کا خراج ہم سے وصول کیا جاتا ہے روزے تو ہم پر ہر سال مسلط کر دیتے ہیں مگر اس کی کوئی تدبیر نہیں بتلاتے کہ احترام ماہ صیام کے احساس کے لئے گزشتہ گیارہ مہینوں تک شکم سیر ہو کر کھانے کے ذرائع مسلمان کو کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حصول نعمت و رزق کا ذریعہ یہی ہے تو پھر ہم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آج یہ ذریعہ کیوں بیکار ہو کر رہ گیا ہے اور علمائے کرام کو چھوڑ کر وہی لوگ کیوں زیادہ نکبت زدہ نظر آتے ہیں جو زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں حقیقت یہ ہے

کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے اسلام کے فلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اور غالباً وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ اسلام کا مفہوم یکسر سعی و عمل ہے اور اصل عبادت وہی ہے جو ہر وقت ہمارے دماغ و جوارح کو متحرک رکھ کر ہمیں اپنی زندگی کا ثبوت دینے پر مجبور کرتی ہے۔

اسلام نے عاقبت کے بوریئے بیٹھنے کی تعلیم کبھی نہیں دی۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال" —— اس نے زمین کی طنابیں کھینچ کر دنیا پر چھا جانے کا درس دیا۔ اس نے اچھے کام کرکے ہمیں ان سے فائدہ اٹھانے کی ترکیبیں بتائیں اور یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ آخرت کی کھیتی اسی دنیا میں بوئی جاتی ہے اور فردوس کے قصر بلند بام کی بنیادیں بھی اسی عالم آب و گل میں استوار کی جاتی ہیں۔

پھر غور کرو کہ تمہارے علماء تمہیں کیا بتلاتے ہیں اور ان کی تعلیم کیا ہے اگر وہ واقعی تمہارے اندر کوئی قومی احساس پیدا کرکے اس کارزار عالم میں تمہارے ساتھ رہ کر جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں تو بے شک ان کی تقلید کرو اور کورانہ تقلید کرو، لیکن اگر وہ تمہاری دنیا کو مٹا کر صرف تمہارے دین کے رہبر بننا چاہتے ہیں تو باور کرو کہ ان کی رہبری گمراہی ہے اور ان کی قیادت بربادی —— ان کی طرف سے منہ موڑ لو۔ ان کے بتوں کو توڑ ڈالو اور خود سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہارے رسول نے تمہیں کیا بنانا چاہا تھا اور اب تم ان ہادیان غیر ہدایت یافتہ کے زیر اثر بگڑ کر کیا ہو گئے ہو۔

افسانۂ روح و رُوحانیت

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں کہ بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے اور ہر عقیدہ کے لئے وہ کوئی نہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے۔ لیکن اگر اُن دلائل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ کمزور دلیل وہ ہے جو بقائے روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سنیں، یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ بقائے روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں؟

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقا ہے یعنی انسان میں جس چیز کو احساس تشخص، حافظہ اور تاثر سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا۔ دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں وہ بقائے روح کے ساتھ حشر اجساد کے بھی قائل ہیں یعنی ایک دن ایسا آئے گا جب جسموں سے جدا ہو جانے والی روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے۔

میں بھی بے شمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے تحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجود حیات نہیں پایا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیات حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیے سے ملے بغیر ظاہر ہو سکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب در ارب (بلکہ بے شمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کا پیوند ہو کر حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بیکار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر نتیجہ خیز خلایا میں پائی جاتی ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فائدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کی جائے۔

اگر وہ چیز جس کا نام "روح" ہے جسم سے بالکل علیحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیونکر جسم کے اندر آگئی جب انسانی وجود عبارت ہے دو بے روح خلایا کے اتصال سے تو پھر روح ان میں کہاں سے آگئی؟ اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں۔

آپ نے سنا ہو گا کہ ایک جنین جس نے رحم مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑ گئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بیجان پیدا ہوا۔ لیکن بجلی اور دیگر

آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کرآئی اور وہ اپنی طبعی زندگی پوری کر کے مرا۔ اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بے جان ہو گیا لیکن اس میں تنفس دوبارہ پیدا کر دیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علیحدہ کوئی دوسری چیز ہے تو بتایا جائے کہ اس مُردہ جنین اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لئے روح کہاں چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کر رہی تھی جو کہ اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محض حسیات کا وجود وجود روح کے لئے ضروری نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہم جسم انسانی میں حسیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے کیونکہ دیگر ذی حیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور ان میں نہیں۔ ایک درخت میں "حیات" ہے لیکن روح نہیں۔ ایک جانور میں "زندگی" ہے، لیکن روح نہیں۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے اس کی انتہا بھی ہونی چاہئے لیکن انسان کا حافظہ اور ادراک نفس مرنے کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے انسان میں وجود روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذی حیات اشیاء میں بھی ادراک و حافظہ نہ پایا جائے۔ گھوڑے، کتے اور بلی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوت حافظہ بھی پائی جاتی ہے اور

ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ادراک و حافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اُس وقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں جب وہ رحم مادر میں تھا۔ یا جب دنیا میں آنے کے بعد اُس نے گھٹنوں چلنا سیکھا تھا۔ اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ و ادراک بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہو جائے گی۔ نہ پہلے کچھ تھا نہ بعد میں کچھ ہوگا۔

عہد قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کی دوسری مخلوقات کا اسے علم تھا۔ اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علیحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیونکہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ آسمان کے اوپر بہشت ہے۔ جہاں فرشتے اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دوربینوں نے کرۂ ارض سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرام سماوی ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں ہمارے لئے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لا متناہی فضا کی ان بے شمار دنیاؤں میں صرف کرۂ ارض ہی کے باشندوں کو خاص اہمیت حاصل ہو اور انھیں کی روحوں کو بقائے دوام کی اہم خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے پھر اور کروں کو جانے دیجئے خود اسی زمین کی اور تمام مخلوقات کو لیجئے کیا وجہ ہے کہ انسان کی روح کو بقا حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دی جائیں اور اگر اس کا جواب صرف مصلحت خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضائے الٰہی و مصلحت ربانی روح انسانی کو فنا نہیں کر سکتی ایسا

کرنے سے اُسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں رہتی ہے بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالم برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں؟ رُوح کا یہ سفر کس ذریعہ سے ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہونچنے کے بعد وہ کہاں اور کیونکر رہتی ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوگی۔ گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا اجتماع ہوگا اور وہ اسی دنیا کی طرح آپس میں تبادلۂ خیال کر سکیں گے۔ اب اسی اعتقاد کے ساتھ اُن علمی حقائق کو بھی سامنے رکھیے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کر رہی ہے اور چوبیس گھنٹہ میں پوری ایک گردش کر لیتی ہے۔ یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظام شمسی کی ہے جو قطب کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظام قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے نظامہائے شمسی کے ساتھ فضاء کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے ————

پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرۂ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہو کر باہم گر ملنا یا کسی ایک جگہ قرار پانا باور کیا جا سکتا ہے۔

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن مع اپنے جسم کے اٹھایا جائے گا۔ اب سے دو ہزار سال قبل اہل فلسطین جب وہ نہ زمین کی

حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے یقین کرتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دنیا کو بنے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے، اور جلد ہی اس کو پھر تباہ ہو جانا ہے لیکن آج یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ انسان کا وجود کرۂ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے کم از کم تین چار تو صرف برفیلے دور ایسے آچکے ہیں جنھوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبو کر رکھ دیا یا زمین کے اندر دفن کر کے ختم کر دیا۔ خدا جانے کتنی بار نوع انسانی جانوروں کی غذا بن کر ختم ہوئی اور پھر انھیں سے پیدا ہوئی الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گزشتہ انسانوں اور جانوروں کے اجزاء شامل ہیں اس لئے اگر حشر اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کون سا کیمیائی طریقہ ہوگا جو لاکھوں سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزاء کو پھر فراہم کر سکے گا۔ اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں، کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزاء فراہم کر کے میرا اصلی جسم تیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی ہیولی میں نشو و نما، بیماری ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں، بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈال دیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے ایک حصہ اس کا دھواں بن کر غائب ہو جاتا ہے، ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہو کر آپ کے کمرے کو گرم رکھتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بن جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے فطرت ہر وقت جوڑنے، توڑنے ملانے اور منتشر کرنے میں معروف ہے۔ اور قوت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی صورتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا

اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے۔ اس عمل سے بچ جائے گا۔ اگر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے تو ایک چیونٹی بھی یہی دعویٰ کر سکتی ہے، ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ روح ہم میں بھی ہے اور اُن میں بھی۔ اور اگر ہماری روح کو بقا ہے تو اُن کی رُوحوں کو بھی ہونا چاہیئے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے ——— فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قائم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تُلی ہوئی ہے، جب تک ان دونوں میں توازن قائم ہے ہم صحیح و توانا کہلاتے ہیں، لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہو جاتے ہیں اور جب اس کا بالکل تصرف ہو جاتا ہے تو ہم مر جاتے ہیں لیکن ہماری موت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے۔ خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات و حیوانات کی۔ اس لئے اب پھر ہمارے انھیں اجزاء کا فراہم ہو کر یکجا ہونا اور اصل صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقائے روح کا عقیدہ صرف جذبۂ محبت کی بناء پر پیدا ہوا ہے جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہونچانا ہے۔ اول اول جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ جن کے بچے، اس کے بھائی بہن، اس کے سردار اور بزرگ رفتہ رفتہ مر گئے تو اسے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ واقعی ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئے ہیں اس کے بعد جب اس نے انھیں خواب میں بھی دیکھا، خواب میں ان سے باتیں بھی کیں تو اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے

رہی تسلی موت کا رکھتی ہیں۔ پھر یہ عقیدہ برابر اس وقت تک قائم رہا جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انھیں قوموں میں باقی ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کیا فی الحقیقت انھیں اس کا یقین بھی ہے ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں لیکن مجھے اس میں کلام ہے ـــــ اس سے قبل میں عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقائد جن کا تعلق ما بعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات و قیاسات ہیں، حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں کیونکہ علم حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک سے ہے یا ان تجربات سے جو بربنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں ـــــــــ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں'

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجئے، وہ لوگ جو حیات بعد الموت کے قائل ہیں اور حقیقی سکون و آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں، ان سے پوچھئے کہ باوجود اس علم کے کہ دنیاوی زندگی ناپائدار و مکلف ہے اور اُخروی زندگی ابدی راحت، وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں، جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج کرتے ہیں۔ تپ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انھیں موت کا یقین ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی چارۂ علاج فرمایا کرتے ہیں! اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں اُخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے، یقین نہیں۔ اگر انھیں یقین ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہونچنے کی کوشش کرتے جہاں بہشت کی راحتیں ہیں۔ حوروں کی آغوشیں ہیں، بچھڑے ہوئے احباب ہیں، چھوٹے ہوئے اعزہ ہیں، جدا ہو جانے والی اولادیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آ سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جس کو یقین سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ اگر واقعی سزا کا یقین ہو تو قیامت تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا ورنہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقائے روح کے قائل ہیں وہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے اُن روحانیین کے بیان کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں اور ان مدعیان روح و روحانیت نے کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں کا نامہ و پیام کہا جاتا ہے وہ کتنا بڑا مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلہ روح یا حیات بعد الموت منجملہ اُن چند مسائل کے ہے جو صرف انسانی تمنا کی پیداوار ہیں اور اُن عقائد سے متعلق ہیں جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی بلکہ جو سراسر اصول فطرت و نظام عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذاہب عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعد الموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قائم رہ سکیں، کیونکہ جوں جوں مادی علمی ترقی بڑھتی جا رہی ہے انسان میں خود اعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں لیکن اگر مذاہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درس اخلاق سے بھی ہے جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیات تمدن کو پورا کرنے والا ہے تو اُن کے لئے

لازم ہے کہ وہ صرف اسی پر اپنی بنیاد قائم کریں اور ان عقائد پر زور نہ دیں جو اُن کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کی بظاہر کوئی اُمید نہیں ہے اس لئے مذاہب عالم کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ڈماکریسی و مشینری کی ترقی کے ساتھ ایک دن اس کو بالکل ختم ہو جانا ہے، کیونکہ اس وقت تک سب سے زیادہ دشمنی مذہب کے ساتھ انھیں دو چیزوں نے کی ہے اور ان کی ترقی کا کھلا ہوا نتیجہ مذاہب کا زوال ہے۔

خود نمائی خدا شناسی نہیں ہے

ہمارے علماء، ہمارے قائدین ملت، اور ہماری جماعت کے وہ تمام افراد جو محراب و منبر کی بلندی سے صدائے موعظت بلند کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر ان سب کی پند و نصیحت میں کوئی چیز "قدر مشترک" کی حیثیت سے نظر آتی ہے تو صرف یہ تعلیم کہ مسلمان اس وقت تک صحیح مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے نہ ہٹے لیکن یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس سے کیا مقصود ہے

ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تلقین کے سلسلہ میں سب سے پہلے "خیر القرون قرنی" کی تقریر ان کے سامنے آتی ہوگی۔ اس کے بعد صحابہ کا دور پیش نظر ہوتا ہوگا اور پھر تابعین و تبع تابعین کا، لیکن آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ وہ عہد نبوی کو تاریخ انسانی کا کیوں بہترین دور قرار دیتا ہے تو وہ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ بتلا سکے گا کہ اس وقت صدائے توحید بلند ہو رہی تھی، صنم کدے ویران کئے جا رہے تھے، لوگ خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور محض رسول اللہ کا دیدار

ہی نجات کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد وہ دورِ صحابہ کی برکات کا ذکر کرے گا۔ کیونکہ یہ زمانہ عہدِ نبوی سے زیادہ قریب تھا۔ پھر وہ تابعین کے زمانہ کی تعریف کرے گا اور صرف اس بناء پر کہ اس عہد کے لوگوں نے صحابہ کو دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا ذکر کرے گا کیونکہ انھوں نے تابعین سے فیضِ صحبت حاصل کیا تھا۔ الغرض ایک مولوی کے سامنے رفت و زمانہ کی خوبی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ وہ عہدِ رسول اللہ سے قریب تر واقع ہوا اور اس کے بدترین ہونے کی صورت یہ ہے کہ عہدِ نبوی سے اس کا بہت زیادہ بُعد ہو۔ چنانچہ دنیا جتنی آگے بڑھتی جائے گی اتنی ہی خراب ہوتی جائے گی۔ پھر حیرت یہ ہے کہ جب ایک زمانہ کی سعادت و عدمِ سعادت صرف اس پر منحصر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان سے قریب واقع ہے یا دُور، ہم پیچھے ہٹ کر کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جب کہ وہ کسی طرح واپس نہیں آسکتا اور ہم اس کے دیدار سے دوزخ اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتے؛

میرا مقصود اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے جو تدابیر قائدینِ مذہب کی طرف سے بتائی جاتی ہیں وہ مقالاً خواہ کتنی ہی شاندار و امید افزا کیوں نہ ہوں لیکن معناً یکسر لغو و مہمل ہیں۔ ایک واعظ صدائے توحید کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو ایک کہہ دینے سے انسان کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ وہ کفر و بت پرستی کے استیصال کا کارنامہ نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ پتھر کی چند مورتوں کو توڑ دینا کیوں انسانیت کا منتہائے ترقی قرار دیا جائے، وہ نماز و روزہ کی متضرعانہ کیفیت کا فسانہ دہراتا ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ جنبشِ اعضاء کی چند مقررہ صورتیں اور فقر و فاقہ کی تنگی کو کیوں سعادتِ انسانی سمجھا جائے۔ وہ صرف رسول اللہ کے دیدار کو کافی ذریعۂ نجات قرار دیتا ہے درآنحالیکہ رسول کے دیکھنے والے اگر ایک طرف ابوبکر و علی تھے،

تو دوسری طرف جہل و بولہب بھی پائے جاتے تھے۔ گو یہ فرق ضرور تھا کہ جنھوں نے اخروی نجات حاصل کی ان میں شاید جذبۂ شخص پرستی موجود تھا اور جو گمراہ کہلاتے وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بہتر زمانہ کون سا تھا تو میں بھی بلا تامل عہد نبوی کا نام لے دوں گا لیکن اس کا تعلق نہ رسول اللہ کی ذات سے ہوگا نہ ان کے دعاوے بلکہ صرف اس روح سے جو اس انسان کامل نے پیدا کی، اور اس عزم و ارادے سے جس نے ایک پست و جاہل قوم کو دفعتہً قعر ذلت سے نکال کر بام ترقی پر پہونچا دیا۔

یقیناً رسول اللہ نے توحید کا درس دیا لیکن اس سے مراد محض خدا کو ایک کہنا یا سمجھنا نہ تھا کیونکہ صرف یہ عقیدہ انسانی ترقی یا فلاح کو مستلزم نہیں بلکہ اس سے مراد ایک عام جذبۂ اتحاد و اخوت کو پیدا کرنا تھا، تمام نوع انسانی کو ایک رشتۂ اجتماعیت سے وابستہ کرنا تھا اور اس مؤثر برتر و اعلیٰ ہستی ہو کر (جو یقیناً ہر ہر ذرہ میں کارفرما ہے) ایک ایسی جمیل فضا پیدا کر دینا تھا، جہاں خدا سمٹ کر انسان اور انسان پھیل کر خدا بن جاتا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ نے کفر و بت پرستی کے خلاف پوری جد و جہد سے کام لیا لیکن کفر سے مراد خودی کا انکار تھا، انانیت کبریٰ سے اعراض تھا اور بت پرستی نام تھا اس کورانہ تقلید و جاہلانہ سرنگونی کا، جو ایک انسان سے احساس انانیت و برتری چھین لینے والی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ سرکار نبوت سے طاعت و عبادت کی بھی ہدایت کی گئی

لیکن اس کا مطمح نظر صرف اس قوت کو سراہنا تھا جو نظام کائنات کو تکمیل و تجمیل کی طرف لیجا رہی ہے اور اس سے کسب فیضان کر کے خود اس وقت کا دست و بازو بن جانا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سر ٹیک دینے سے نہ خدا کے مرتبہ میں کوئی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس عجز و فروتنی کی اسے ضرورت،

الغرض یہ بالکل صحیح ہے کہ عہد نبوی بہترین زمانہ تھا۔ لیکن اس کا تعلق نہ صرف روزہ نماز سے تھا نہ ظاہری مراسم نمایش و عبودیت سے، نہ زبانی تسبیح و تہلیل سے اسے کوئی واسطہ تھا، نہ مسواک و مصلیٰ سے بلکہ وہ ایک زمانہ تھا جس نے سوتی ہوئی انسانیت کو جگایا جس نے فطرت کے قوائے کا منہ کو انسان کے لئے بے نقاب کیا اور جس نے ذرا میں آلہیہ کو دسترس انسانی سے قریب تر کر کے عالم کی ذہنیت کا رخ بدل دیا۔

پس یقیناً وہ عہد نہایت مبارک عہد تھا جب آفتاب حقیقت نے اول اول اس طرح طلوع کیا اور لاریب وہ زمانہ سراہے جانے کے قابل ہے جب شاہد مقصود سب سے پہلے برافگندہ نقاب سامنے آیا، لیکن اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس ابتداء کو کسی انتہا کی ضرورت نہ تھی۔ یہ آغاز و انجام سے بے نیاز تھا۔ اس آفتاب کا طلوع نصف النہار سے مستغنی تھا تو یقیناً اس کا دعویٰ غلط ہوگا، کیونکہ دنیا کا کوئی تخم دفعتہ بارآور نہیں ہو سکتا۔ کوئی تغیر فوراً استوار نہیں ہوتی اور منزل تک پہونچنے کے لئے قطع سفر ضروری ہے رسول اللہ نے بے شک انسانیت کے دور جدید کی بنیاد قائم کی لیکن اس توقع کے ساتھ کہ آئندہ نوع انسانی اس کو عروج و کمال تک پہونچائے اور خدا کا وہ وعدہ جو "جنات عدن" کی صورت میں کیا گیا تھا پورا ہو کر رہے۔

پھر اب دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ کس قوم نے اس رمز کو سمجھ کر ان مدارج استعلاء

کو حاصل کیا جو ایک سچے مومن و مسلم کو حاصل کرنا چاہیئے۔ اور وہ کون سی قوم ہے جو اس تعلیم کو نظر انداز کر کے ــــــــــ "ہل یہلک الا القوم الفاسقون" کی تعزیر میں مبتلا ہوئی

یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ ہم خدائی فیصلوں اور ربانی اصول میں ملک و ملت، رنگ و نسل، کفر و اسلام کی تفریق کو سامنے رکھ کر خطا و صواب کا معیار قائم کرتے ہیں۔ جو فطرت مشرق میں جلوہ گر ہے وہی مغرب میں ہے۔ قدرت کی جو کارفرمائیاں شمال میں نظر آتی ہیں وہی جنوب میں بھی ہیں۔ شاہراہ صرف ایک ہی ہے جس کا دوسرا نام دین فطرت ہے اور یہ سب کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہے۔ یہود و نصاریٰ کافر و مسلمان کی تفریق صرف ہماری بے بصری کا نتیجہ ہے اور یہ نام وہ ہیں جو خدا کی لوح محفوظ یعنی صحیفۂ قدرت کے اوراق میں کسی جگہ نظر نہیں آتے۔ وہاں ان سب کو صرف ایک ہی نام لفظ "انسان" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لئے صرف ایک ہی پہچان "کل مولود ولد علی فطرۃ الاسلام" بتائی گئی ہے اور یہ فخر صرف بانی اسلام ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس نے اس راز کو ظاہر کیا اور اس طرح اس نے اول اول جملہ افراد نوع انسانی کو ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کی تعلیم دی۔ لیکن ہماری کوتاہ فہمیوں کی یہ داستان کتنی درد ناک ہے کہ جس قوم پر سب سے پہلے اس راز کا افشا کیا گیا اسی نے سب سے زیادہ اس کو ٹھکرایا اور انسانیت کو جس جماعت سے سب سے زیادہ "توقع داد پانے" کی تھی وہی سب سے زیادہ "خستۂ تیغ ستم" نکلی۔

اب سے اربوں سال قبل جس کرۂ ارض کی تخلیق ہوئی تھی، ہر چند وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اس کے شباب و بلوغ کا زمانہ آ رہا ہے اس کی تحسین و تجمیل آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے اور اس شراب کے رسا ہونے میں زیادہ دیر

نہیں ہے، علوم و فنون کے چشمے ہر طرف ابل رہے ہیں۔ کائنات کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے جا رہے ہیں۔ قدرت کی جملہ برکات ہمارے لئے بیسر الحصول ہوتی جاتی ہیں۔ عناصر عالم نے انسان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا ہے۔ "استخلاف فی الارض" کا وہ وعدۂ ربانی جو یوم الست میں کیا گیا تھا بہت جلد پورا ہونے والا ہے اور دنیا ایک زمانۂ دراز تک انتظار کے جہنم میں جھلسنے کے بعد قرب و وصال کی فردوس سے ہم آغوش ہونے والی ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ سعادت و برکت ان کے لئے مقسوم نہیں ہے جنھوں نے دنیا کو "سجن المومن" سمجھ کر اس کو ٹھکرا دیا بلکہ ان خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس قید خانہ کو اپنے لئے رشک فردوس بنا لیا خواہ اس کا نام آپ "جنت الکافر" ہی کیوں نہ قرار دیں۔

انسان اسی دنیا کا ایک جزو ہے۔ اور اسی کو آباد کرنے کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ قدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز، بیکس و مفلس، نادار و ناچار، محتاج و بیمار بن کر زندگی بسر کرے۔ دنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو اس نے پھولنے اور پھلنے کے لئے نصب کیا تھا نہ کہ ویران و برباد ہونے کے لئے۔ پھر جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ موسم بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں، دور خزاں ختم ہو چلا ہے، تازہ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ گلہائے رنگا رنگ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہے ہیں اور بہت جلد خود ذات ربانی اس کثرت نشاط و جمال میں رونما ہونے والی ہے جسے دست انسانی نے اپنے خالق کے لئے تیار کیا ہے۔ خدا غنی ہے اور وہ اس کا مہمان نہیں ہو سکتا جو محتاج و مفلس ہے۔ خدا غالب و قدیر ہے اس لئے وہ مغلوب و مقروح کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ خدا پاکیزہ و طاہر ہے اس لئے وہ

کثیف و بے سلیقہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ خدا اجمل و اکمل ہے اس لئے وہ ناقص و بدصورت سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اسے مکمل دیکھنا چاہتا ہے اسے نقص سے نفرت ہے بدصورتی سے احتراز ہے حزن و ملال سے استکراہ ہے۔ اور اس لئے وہ قومیں جو درماندہ و عاجز ہیں، مغموم و ملول ہیں یقیناً وہی ہیں جن کی طرف سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور جو قومیں غالب فاتح ہیں۔ مسرور و شادکام ہیں بیشک وہی ہیں جن سے خدا خوش ہے اور جن کو وہ دوست رکھتا ہے ؛

اس زمانہ میں ایک متشائم (PESSIMISTIC) قوم کو زندہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوت عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کر کے گدایانہ زندگی بسر کر رہی ہے، وہ یقیناً ہلاک ہو کر رہے گی اور اسے ہلاک ہو جانا چاہیئے۔ دنیا فطرت کا وہ کارنامہ ہے جس میں اس کی انتہائی تمنائے نشاط صرف ہو رہی ہے اور اس لئے ایک حزین و مایوس ہستی کا اس میں گزر نہیں۔ باغ کے وہ تمام پودے جو بیمار ہو کر مضمحل ہونے لگتے ہیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے صحیح و توانا درخت متاثر نہ ہوں۔ بالکل اسی طرح وہ جماعتیں بھی فنا ہو جائیں گی جن کے قوائے مضمحل، جن کے دماغ ضعیف اور جن کی ذہنیتیں بیمار ہیں تاکہ خدا کی یہ کھیتی لہلہا اٹھے، اور اس کی زمین تمام خس و خاشاک سے پاک ہو جائے ؛

کیا مذہب فطری چیز ہے؟

ایک زمانہ انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب مذہب کے انکار تو خیر بڑی چیز ہے اس کی حقیقت پر غور کرنا بھی معصیت خیال کیا جاتا تھا اور اس قسم کی بحث گویا توہین خداوندی کے مترادف تھی چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک اس مذہبی گرفت اور ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ کائنات کو انسان نے خدا اور شیطان کے درمیان تقسیم کر رکھا تھا۔ یعنی تمام اچھی باتیں خدا سے منسوب کی جاتی تھیں اور بری باتیں شیطان سے، گویا انسان ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا جانور تھا جو نہ خود کچھ کر سکتا تھا اور نہ وہ کسی بات کا ذمہ دار قرار پا سکتا تھا۔

لیکن اب کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر کیفیت پر علمی و تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے اور ایک ایک ذرہ سے لے کر پہاڑوں کی سربفلک چٹانوں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو مطالعۂ علم و تحقیق سے باہر ہو۔ مذہب کا بچنا دشوار تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ علم کی دراز دستی سے محفوظ رہ سکتا۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ علم یا سائنس کا تعلق صرف مادی چیزوں

سے ہے اور مذہب چونکہ روحانی چیز ہے اس لئے سائنس کی رسائی وہاں ممکن نہیں، لیکن یہ غلط ہے کیونکہ سائنس کا تعلق جس طرح مادی چیزوں سے ہے اسی طرح غیر مادی اشیاء سے بھی ہے۔ اگر وہ کمیت سے بحث کرتا ہے تو کیفیت بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ چنانچہ نفسیات جس کا تعلق نفس سے ہے وجدانیات یا جمالیات جس کا تعلق حسن و جمال سے ہے اخلاقیات جو انسان کے اخلاق سے متعلق ہے اور اسی طرح کے دیگر علوم سب غیر مادی چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

سائنس فی الحقیقت نام ہے ایک صحیح اور بے لاگ انتقادی مطالعہ کا خواہ اس کا موضوع کوئی مادی چیز ہو یا غیر مادی اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب جو ہزاروں سال سے انسانی رجحانات پر حکمرانی کرتا چلا آرہا ہے۔ محض اس لئے کہ اس کا تعلق روح و روحانیات سے ظاہر کیا جاتا ہے، تحقیق علمی کی حدود سے باہر رکھا جائے چنانچہ آج کی صحبت میں ہم اس موضوع پر خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کر کے دیکھیں گے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور وہ انسانیت کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ آیا مذہب واقعی کوئی الہامی چیز ہے، یعنی کیا خدا کی طرف سے اس کی پابندی انسان پر عائد کی گئی ہے اور اس کے بعد یہ کہ اگر الہامی نہیں ہے تو اس کے وجود کے اسباب کیا تھے۔

اگر ہم اس کو تسلیم کر لیں کہ مذہب کا مقصود نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا نے انسان کی آفرینش کے ساتھ ہی ساتھ مذہب بھی الہام کیا ہوگا ورنہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا نے اول اول تو ہدایت کو ضروری خیال نہ کیا تھا، لیکن بعد کو اس کی ضرورت اس نے محسوس کی جو یقیناً شان خداوندی کے

منافی ہے اگر خدا کا مقصود انسان کی آزمائش سے کوئی بے معنی کھیل نہ تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اولین عہد کے انسان کی پروانہ کرتا اور مابعد کے انسانوں کو قابلِ توجہ سمجھتا جبکہ اصولاً نووارد انسان کو حقیقتاً زیادہ تنبیہ وہدایت کی ضرورت تھی لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ عہد مابعد کے تمام ترقی یافتہ مذاہب جن میں اسلام اور عیسویت کو زیادہ نمایاں درجہ حاصل ہے صرف اپنے ہی کو الہامی مذہب قرار دیتے ہیں اور قرونِ ماضیہ کو عہد تاریک، دورِ جاہلیت، زمانۂ وحشت و بربریت کے ناموں سے یاد کر کے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ بالکل گمراہ تھے اور وہ کسی مذہب کے پابند نہ تھے پھر اس اعتراض کا جواب کہ خدا نے کیوں ایک طویل زمانہ تک انسان کو گمراہ رکھا اور کیوں نہ ان میں کوئی نبی یا پیغمبر بھیج کر صراطِ مستقیم سے آشنا کیا ہم پر عائد نہیں ہوتا ہے بلکہ ان پر جو اپنے آپ کو الہامی مذاہب کا پابند بتاتے ہیں۔

وہ حضرات جو اثریات سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ انسان کے عہدِ حجری کی جو چیزیں (لاکھوں سال قبل کی) اس وقت تک زمین سے برآمد ہوئی ہیں وہ مشتمل ہیں صرف چند مخصوص آلات و اوزار پر اور ان کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ خدا یا مذہب کے وجود کا بھی قائل تھا۔ البتہ اب سے ۲۰ ہزار سال قبل کی چیزوں میں ضرور ہاتھی دانت یا پتھر کے ایسے نقوش یا بُت دریافت ہوئے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مذہبی خیالات کے زیرِ اثر بنائے گئے ہوں! اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے وجود کے ساتھ مذہب کا وجود ظہور میں نہیں آیا اور اس لئے یہ دعویٰ کرنا کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے یا یہ کہ اس کا تعلق الہام خداوندی سے ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

علم جدیدہ کے مسائل میں مذہب کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز نے پہونچایا ہے وہ مسئلہ ارتقاء ہے کیونکہ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ مادہ سے متعلق ہو یا نفس سے ماحول کے زیر اثر تدریجاً آگے بڑھتی ہے اور پھر چونکہ مذہب کا خیال غذا یا لباس کی طرح فطری مجبوری کا نتیجہ نہ تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا وجود بھی اسباب معیشت و ماحول کے زیر اثر ظہور میں آیا ہوگا۔ اور ایک قوم پر جو زمانہ جس حال میں بسر ہوا ہوگا اسی کے تحت اس کے مذہبی خیال میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی تمام مذہب کی بنیاد، وجود خدا کے عقیدہ پر قائم ہے اور خدا کا تصور جس جس طرح مختلف اوقات میں انسان نے کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا خالق کہنا شاید اتنا موزوں نہیں ہے جتنا انسان کو خدا کا خالق کہنا۔

علم الانسان اور تاریخ مذہب کے ماہرین اس باب میں مختلف الخیال ہیں کہ خدا کا وجود ذہن انسانی میں سب سے پہلے کب اور کیونکر آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی ابتداء تو ارفطرت اشیاء کے مطالعہ سے ہوئی ہے یعنی آسمان و زمین میں جو چیز یا جو قوت انسان کو مفید یا عجیب نظر آئی اسی کو وہ پوجنے لگا۔ چنانچہ درخت، پتھر، پہاڑ، ستارے، چاند، سورج وغیرہ مختلف مظاہر فطرت کو ان نے خدا سمجھا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ بعض کے نزدیک اس کا تعلق قبائل کے سرداروں اور اسلاف کی یاد سے ہے یعنی قبائل کے جن لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور آباو اجداد میں سے جو افراد مر گئے، احتراماً ان کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔

قدیم روما و یونان میں بھی ایک جماعت متشککین و قائلین ارتقاء کی پائی

جاتی تھی اور انھوں نے بھی قیاس آرائیوں سے کام لے کر عقیدۂ خدا کے متعلق مختلف نظریئے قائم کئے تھے۔ چنانچہ انھیں میں سے ایک شاعر کہتا ہے کہ "سب سے پہلے جس چیز نے زمین پر خدا کو پیدا کیا وہ انسان کا جذبۂ خوف و ہراس تھا۔ بجلی کی کڑک طوفان کے شور، سمندروں کے تلاطم، آتش فشاں پہاڑوں کے خوفناک مناظر وغیرہ، یہ تمام وہ چیزیں تھیں جن سے ڈر کر انسان کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور قوت بھی موجود ہے۔

ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ یہ ہے کہ "انسان اول اول سمجھتا تھا کہ انسان کا سایہ یا ہمزاد اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتا ہے، اس لئے اگر کوئی سردار مر گیا ہے تو اس کا ہمزاد ضرور باقی ہے اور یہیں سے دیوتا کا وجود اس کے ذہن میں آیا" الغرض خدا یا دیوتاؤں کا وجود خود انسان کا پیدا کیا ہوا ہے جس کو اس نے اپنے جغرافی و معاشرتی ماحول کے لحاظ سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیش کیا چنانچہ اسپنسر کہتا ہے کہ "اگر مثلث کا کوئی خدا ہوتا تو وہ اسے مثلثی شکل کا تصور کرتا" رہا یہ امر کہ خدا کے تصور میں خود انسان کا ذوق کس حد تک کار فرما ہے، سو مختلف قوموں کے دیوتاؤں اور بتوں کے دیکھنے سے اس کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

حبشیوں کے دیوتا کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ناک چپٹی۔ اہل تھریس کا دیوتا نیلگوں آنکھیں رکھتا ہے اور سرخ بال، اور ہومر وہیسیڈ کا خدا تمام وہ معائب رکھتا ہے جو خود اس عہد کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ مغرب میں زیادہ ارتقائی درجہ کا خدا دیکھنا ہو تو عہد عتیق کے خدا (JEHOVAH) کو دیکھئے جس نے دنیا کو چھ دن میں پیدا کیا اور پھر تھک کر آرام کرنے پر مجبور ہوا۔ آدمیوں ہی کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں

ہیں اور انسان ہی کی طرح وہ جذبات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس نے آدم کے لئے جانوروں میں سے رفیقِ زندگی پیدا کیا۔ آدم و حوا کے لئے کھال کا لباس تیار کیا، برج بابل دیکھنے کے لئے وہ خود زمین پر اتر آیا۔ وہ ظالم و خونخوار ہے، رشک و حسد کرتا ہے، انسانی قربانیاں چاہتا ہے اور اپنے کئے پر پچھتاتا بھی ہے۔

الغرض خدا کا مفہوم ہمیشہ انسانی حالات کے تحت بدلتا رہا ہے، استبداد و ملوکیت کے دور میں اگر وہ ایک بادشاہ ہے تو عہدِ جمہوریت میں اس کی حیثیت ایک پریسیڈنٹ سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ ترقی سائنس سے قبل وہ محیر العقول معجزے بھی دکھاتا تھا لیکن اب ترقی علوم کے زمانے میں وہ بالکل قانونِ فطرت کا پابند ہے۔

بعض اسے مہربان، محبت کرنے والے باپ کی طرح سمجھتے ہیں، بعض کے نزدیک وہ ایسا ظالم ہے کہ غیر بپتسمہ شدہ بچوں کو دوزخ میں ڈال دیتا ہے اور منکرین کو خواہ کتنے ہی اچھے اخلاق کے کیوں نہ ہوں ہمیشہ آتشِ جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ پھر اس "خدا تراشی" کے ساتھ ہی جب ہم اس کے نتائج کو دیکھتے ہیں تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کیونکر اتنے عرصہ تک اسے برداشت کر سکی۔ بے زبان جانوروں کی قربانیوں کے علاوہ انسانی بچوں اور عورتوں کا ذبح کیا جانا، سحر و جادو کے الزام میں ہزاروں ضعیف عورتوں کو آگ میں ڈال دینا ... ...

... ... منکرین کو بے دردی سے تہ تیغ کر دینا، یہ تمام وہ مظالم تھے جو مذہب کے پردے میں روا رکھے گئے کیونکہ جن لوگوں نے خدا کے تصور کو دنیا کے سامنے پیش کیا ان کے دل یکسر نفرت و تعصب سے لبریز تھے، اور خدا کا مفہوم ہی وہ اس طرح پیش کرتے تھے کہ اُنھیں ... ...

اپنے جذبات کی تسکین کا موقع ملے حقیقت یہ ہے کہ دیوتاؤں کا وجود خود انسان کی احساس
وضروریات کی ایک مجسم صورت تھی، اور یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ خدا گویا ایک "عکس سایہ"
تھا خود انسان کے خیالات کا۔

اب اسی کے ساتھ اس کے ترقی یافتہ زمانہ کو دیکھئے کہ خدا کا مفہوم متعین کرنے کے
لئے کس قدر عجیب وغریب ذہانت دانشا سے کام لیا گیا ہے:

ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا "عدیم التاثر قادر مطلق" Passionless
Absolute ہے۔ ایمرسن اُسے کائنات کی روح برتر و اعلیٰ
Over soul of the Universe کہتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر
اسے "ازلی وابدی قوت" Infinite and eternal energy
سے تعبیر کرتا ہے۔ ولیم جیمس اسے Divine Force کے الفاظ سے سمجھانا چاہتا ہے
برگساں اسے "محرک جوہری" Vital Impulse کے الفاظ سے ظاہر کرتا ہے
برنارڈ شا نے اسے "قوت حیات" Life Force کہا ہے۔ پرنیسر کرتاب
اسے "ایک غیر مادی حقیقت" Immaterial reality
سمجھتا ہے۔ بوزیں برجز اسے "کائنات کا خیر کل" Totality of good
in the world بتاتا ہے۔ بعض اسے "فضا کوکبی کی روح" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض یہ
دنیا کا انکل سام (Uncle Sam[1]) اور بعض اسے ایسا "روحانی پتھر" سمجھتے
ہیں جو دست زمان کو معمور کئے ہوئے ہے۔

---

[1] انکل سام سے مراد امریکہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام تعبیرات کا واقعی کوئی مفہوم ہے، کیا کوئی شخص ان تعبیرات سے خدا کے مفہوم کو متعین کر سکتا ہے، کیا ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نے خدا کی حقیقت کو سمجھ لیا؟

اس سے قبل جب انسان جاہل تھا اور اس کا ذہن زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اس نے خدا کو مادی و مرئی چیزوں کی صورت میں پیش کیا جو ہرچند قابل قبول نہ تھا لیکن قابل تصور و قیاس تو تھا، مگر اب اس دور علم و ترقی میں تو خدا کو اس قدر مبہم بنا دیا گیا ہے کہ سوائے ذہنی مالیخولیا کے ہم کسی اور چیز سے تعبیر کر ہی نہیں سکتے چنانچہ جو بیانات ابھی پیش کئے گئے ہیں، آپ ان کے سمجھنے کے لئے پوری قوت صرف کر دیجئے، لیکن آپ کسی متعین مفہوم تک پہونچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ صرف الفاظ و تراکیب ہیں جو مفہوم سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان پر غور کرنا سوائے لایعنی ذہنی کش مکش کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ الغرض خدا صرف ذہن انسانی کی پیداوار ہے اور اختلاف ذہن کے ساتھ اس کا مفہوم بھی ہمیشہ بدلا ہے جب انسان کی نگاہ مادی چیزوں سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں جا سکتی تھی تو اس نے درختوں، جانوروں، پہاڑوں، دریاؤں اور انسانی بتوں کی صورت میں خدا کو سمجھنا چاہا اور اب کہ عقول انسانی نے ترقی کر کے خالص کیفیات کی تحلیل شروع کر دی ہے خدا نام ہے صرف ان لغو و مہمل تاویلات کا جو دماغ کو اور زیادہ تشویش میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔

مذہب یا خدا کے وجود کا خیال الہامی چیز ہے، اس کی تردید خود الہامی مذاہب کے بیانات سے ہوتی ہے کیونکہ وہ عہد وحشت کے دیوتاؤں کو گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کی بت پرستی کو خلاف منشاء خداوندی قرار دیتے ہیں۔ اب رہ گیا یہ امر کہ وہ کوئی فطری چیز ہے اور

انسان نے پیدا ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ خدا کا وجود ضروری ہے، سو میرے نزدیک اہل مذاہب اس کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے۔

اس مسئلہ کی چھان بین کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود وحشی اقوام کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ وحشی اقوام کے زمانہ کو ہم "زمانۂ قبل تاریخ" سے موسوم کرتے ہیں اور اس لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے کا نہیں ہے لیکن چونکہ دنیا اس وقت بھی ان قوموں سے خالی نہیں ہے، اس لئے ان کی موجودہ حالت سے ان کے گزشتہ حالات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

اس وقت انتہائی پست درجہ کی قومیں ٹراڈل فگو، برازیل، لنکا، جزائر فیلپائن، جزیرہ نمائے ملایا اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں، ان کی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان میں قبائلی زندگی کا بھی کوئی نظام نہیں پایا جاتا اور دماغی پستی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ گنتی بھی انھیں نہیں آتی اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آگ کیونکر پیدا کی جاتی ہے۔

ٹراڈل فگو کی وحشی قوم یگاں کے متعلق کامل دو سال تک فرانسیسی علماء نے تحقیق کر کے جو رپورٹ شائع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ خدا کے وجود کے قائل ہیں۔ نہ اُن کے نزدیک خیر و شر کا کوئی مفہوم ہے۔ امید و خوف کا بھی کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا اور موت کے بعد وہ کسی اور عالم کے قائل نہیں ہیں۔

وسط برازیل کی وحشی اقوام کے عقائد میں بھی کوئی مذہبی جھلک نظر نہیں آتی، سوا اس کے کہ وہ سورج کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاند کو برا جس کا سبب غالباً صرف یہ ہو سکتا ہے کہ چاند کا تعلق رات سے ہے جب درندے جنگل سے باہر نکل آتے ہیں اور سورج کا دن سے

جب درندوں کا خوف نہیں رہتا، یہ کسی کی پوجا نہیں کرتے اور نہ ان کا کوئی بت ہے۔ لنکا کی قدیم وحشی جماعتوں میں بھی کسی مذہبی پرستش کا وجود نہیں پایا جاتا اور انکی زندگی کے کسی شعبہ سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خدا یا دیوتا کے قائل ہیں۔

تسمانیا کے صحرائی قبائل کے متعلق ڈاکٹر نکسن لکھتا ہے کہ "ان میں کسی مذہبی رسوم کا پتہ نہیں چلتا اور یہ اپنے خیالات کے لحاظ سے بھی اتنے پست ہیں کہ اُن کی زبان زیادہ تر اشارات پر مشتمل ہے، چنانچہ رات کے وقت تو یہ آپس میں باتیں کر ہی نہیں سکتے"۔

جزائر انڈمان کے وحشی قبائل ہرچند دوسری قوموں سے بہت کچھ متاثر ہو چکے ہیں تاہم مذہب یا عقیدۂ خدا کا وجود ان کے ہاں بھی نہیں پایا جاتا۔ جزائر فلپائن میں جن سیاحوں کے جانے کا اتفاق ہوا ہے اُن کو معلوم ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے بھی کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ الغرض تمام وحشی قومیں جو دوسری قوموں کی تہذیب سے متاثر نہیں ہوئی ہیں اب بھی خدا یا مذہب کی قائل نہیں ہیں، اور اگر کسی قوم میں یہ خیال پیدا ہوا ہے تو وہ صرف دوسری قوموں سے ملنے جلنے کے بعد، اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا خیال انسانی فطرت میں داخل ہے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ کس کس رنگ میں یہ عقیدہ ظاہر ہوا ہے سو اس بحث میں ہم کو ہر ملک و قوم کے جغرافی ماحول کو پیش نظر رکھنا ضرور ہوگا اور بنا براں یہ بحث کسی الہامی حقیقت سے متعلق نہ ہوگی بلکہ ماحول و اسباب ظاہری کی تاریخ سے تعلق رکھے گی اور اس صورت میں مذہبی مسئلہ کوئی خدائی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ صرف ترقی تمدن کی تاریخ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔

چونکہ خدا اور مذہب صرف عقل انسانی کی پیداوار ہے اور عقل انسانی مختلف

حالات کے تحت ہمیشہ مختلف رہی ہے اس لئے اگر آج عقائد مذہبی میں تمام افراد نوع انسانی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ البتہ اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ مذہب کا وجود انسانی زندگی کے لئے ضروری نہیں ہے اور ہم خدا کو مانے بغیر بھی اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بے شک یہ ایک ایسے نقطہ کی طرف قدم بڑھانا ہوگا جو عقائد مذہبی کے تمام لغو اختلافات کو دور کر کے مذہبی رنگ اختیار کر سکتا ہے۔

مولوی و مولویت

جب کسی قوم کی اخلاقی حالت پست ہوجاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ دورِ انحطاط سے گزر رہی ہے۔ جب اس کے اخلاق بلند ہوتے ہیں تو ہم حکم لگاتے ہیں کہ وہ عروج پر ہے اور ہماری تنقید زیادہ سے زیادہ اسی حد تک پہونچ کر رہ جاتی ہے، در آنحالیکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی پستی و بلندی کا تعلق کس چیز سے ہے یا بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ ہمارے عروج و زوال کا ذمہ دار کون ہے؟

قوم نہ نام کسی ایک فرد کا ہے نہ بہت سے افراد کا، بلکہ اس جماعت کا جو کسی ایک قانون، ایک ضابطۂ زندگی کی پابند ہو، اور جس کے تمام افراد کسی ایک غرضِ مشترک سے وابستہ ہوں۔ اسی پابندی کا نام ہیئتِ اجتماعی ہے اور یہی ہم آہنگی و یکرنگی سوسائٹی یا سماج کی جان ہے۔

دنیا میں جتنے مذاہب رونما ہوئے ان سب کی غایت سوسائٹی کی اصلاح تھی تاکہ اس کے افراد ایک شیرازہ سے بندھے رہیں اور ان میں انتشار پیدا ہوکر

مقاومت کی قوت فنا نہ ہو جائے ؛

یہاں اس بحث کی ضرورت نہیں کہ مذہب کوئی الہامی چیز ہے یا خود انسان کے دماغ کی پیداوار، اگر وہ خدا کا بنایا ہوا دستور ہے تو اور اگر ذہن انسانی کی اختراع، تو بھی۔ بہرحال اسے زمانہ کے حالات اور تمدن کی تدریجی ترقی کے لحاظ سے مرتب ہونا چاہیئے تھا اور ہوا صنم پرستی سے لے کر صمد پرستی تک جتنے دور مذہب پر گزرے ہیں ان سے اس تدریجی اقتضاء کا حال پوری طرح واضح ہو سکتا ہے۔

ہر چند جس زمانے میں جو مذہب ہوا ہے اس نے بغیر کسی اندیشۂ فردا کے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا کہ وہ ایک مکمل چیز ہے اور اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں لیکن زمانے نے ہمیشہ اس دعوے کو باطل کر کے دکھا دیا کہ دنیا کا کوئی قانون، کوئی شریعت، کوئی مذہب مستقبل کے حالات پر حاوی نہیں ہو سکتا اور انسان مجبور ہے کہ "حال" کے لحاظ سے اپنے اصول زندگی میں تبدیلی کرتا رہے۔

اس سے شاید انکار ممکن نہ ہو کہ سب سے آخر میں مذہب اسلام کا ظہور ہوا، اور گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کے اندر کوئی تحریک اتنی قوی اور ایسی منظم رونما نہیں ہوئی جسے ہم "مذہب" کے لفظ سے موسوم کر سکیں، ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب صرف یہ ہو کہ اس دوران میں مذہب انسانی نے اتنی ترقی کر لی ہو کہ وہ مذہب کے وجود کو ضروری نہ سمجھتی ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی بالکل لغو و مہمل قرار نہیں دیا جا سکتا کہ ان کا مذہب اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اتنی مکمل چیز ہے کہ وہ ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے اور اس میں اتنی اہلیت موجود ہے کہ اگر دنیا چاہے تو اسے ایک عالمگیر سماجی قانون کی حیثیت سے اختیار کر سکتی ہے۔ یہ تو ہوئی وہ بات جس کا یقین دوسرے کو

صرف اسی وقت آسکتا ہے جب خود براہ راست تعلیم اسلام کا مطالعہ کرے اور مذہبی لٹریچر کے اس حشو و زوائد کو نظر انداز کر دے جس نے اسلام کے چہرہ کو تو بر تو نقابات کے اندر چھپا رکھا ہے۔ لیکن یوں بھی ہر شخص تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کر سکتا ہے کہ جتنی جلد اور جس قدر وسعت اسلام نے حاصل کی اتنی کسی اور مذہب کو اتنے تھوڑے زمانے میں نصیب نہ ہوئی۔ پھر اجتماعی ترقی کے تمام نفسیاتی رموز و غوامض کو جانے دیجئے، یوں بھی اس بات کے تسلیم کرنے میں کسی حجت و برہان کی ضرورت نہیں کہ کسی قوم کا یہ استعلاء و استیلا بغیر غیر معمولی جوش عمل اور ہم آہنگی کے ناممکن ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو صحیح اسلام کی عمر ۲۳ھ پر ختم سمجھتے ہیں اور بنو امیہ و بنو عباس کے دور ملوکیت کو مذہبی ترقی سے علیحدہ کوئی اور چیز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر فتوحات ملکی محض اس لئے کہ ان کا تعلق دنیا سے ہے، خلاف مذہب قرار دی جائیں تو خود رسول اللہ اور خلفاء کے زمانہ کی فتوحات کی نسبت کیا کہا جائے گا۔ الغرض میرے نزدیک حکومت و ملک گیری قطعاً روح اسلام کے منافی نہ تھی لیکن رسول اللہ کی رحلت کے بعد ہی ایک اور چیز ضرور نئی پیدا ہوئی جو یقیناً بہت خراب تھی۔ اتنی خراب کہ آخرکار اس نے اسلام اور اہل اسلام کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ چیز کیا تھی؟ ———— مولویت ————

"مولویت" نام جزئیات مذہب سے آگاہی کا نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق مہارت علوم و فنون سے ہے بلکہ وہ عبارت ہے اس مخصوص ذہنیت سے جو سوا اپنے تمام دنیا پر عقل و فہم کا دروازہ بند کر دیتی ہے اور لوگوں کے ذہن و فراست پر قفل ڈال کر مذہبیت کے بہانہ سے اپنے بدترین اغراض نفسانی پورا کرنے میں تامل نہیں کرتی۔

یہ ایک عظیم بلا ہے جس نے ابتداء عہد اسلام سے لے کر تا ایندم بے شمار ہلاکتیں دنیا میں پھیلائیں جن میں سب سے بڑی ہلاکت اجتماع قومی کے شیرازہ کو منتشر کرنا، بھائی بھائی کو لڑانا اور گوشت ناخن سے جدا کرنا ہے۔ چنانچہ حنبلی، مالکی، شافعی، حنفی مسالک کی تفریق، اشاعرہ و معتزلہ کی تقسیم، اہل قرآن و اہل حدیث کا باہمی اختلاف، شیعہ سنی کی جنگ اور اسی طرح کے اور بہت سے فتنے اسی "مولویت" کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اور کتنا زہر اسے پھیلانا ہے۔

اسلام کی وہ خصوصیت جو یقیناً دنیا میں کسی اور مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اور جس کا اعتراف ہر صاحب فکر کرنے کیلئے صرف یہ ہے کہ وہ کوئی خیالی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد صرف فلسفہ کی ہفوات پر قائم ہو بلکہ وہ یکسر حرکت و عمل ہے اور اس قدر سادہ و آسان کہ مسلمان ہونے کے معنی ہی صرف ایک صلح جو متمدن انسان ہونے کے ہیں، لیکن "خانۂ مولویت خراب" اس نے اسلام کی جو راہ متعین کر رکھی ہے وہ اس قدر دشوار گزار ہے کہ ایک ذی عقل و ہوش انسان دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مسلمان کبھی نہیں بن سکتا کیونکہ ان "مفتیان شرع متین" کی مرضی کے مطابق کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ پہلے عقل و فراست کو خیرباد نہ کہدے اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قربانی کے لئے ہر شخص کیونکر تیار ہو سکتا ہے۔

اس جماعت کا سب سے بڑا حربہ "حربۂ تکفیر" ہے جو اس سے قبل (اس لئے کہ لوگ زیادہ جاہل تھے) واقعی کوئی اہمیت رکھتا بھی تھا لیکن اب اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہ گئی ہے جیسے آپ کسی متردد گداگر کے سوال کو پورا نہ کریں اور وہ الٹ کر گالی دے بیٹھے۔ حال ہی میں ایک نہایت دلچسپ "منظر تکفیر" بعض علمائے دیوبند کی طرف سے پیش

کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر ممکن ہے بعض لوگوں کو افسوس ہوا ہو لیکن مجھے بہت مسرت ہوئی، کیونکہ "ادارہ دیوبند" کی قبر اس سے زیادہ گہری کھودی جانی ممکن نہ تھی۔

سرائے میر (اعظم گڈھ) میں تقریباً ربع صدی سے مدرسۃ الاصلاح کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جس کا مقصد زیادہ تر علوم قرآنیہ کی تعلیم اور انھیں کی تحقیق و تفتیش ہے اس کے بانی مولانا حمید الدین اور روح رواں مولانا شبلی تھے۔ چونکہ اس کے کارکن نیک نیت ہیں اس لئے اس نے کافی ترقی حاصل کرلی یہیں سرائے میر میں مولویوں کی ایک دوسری جماعت کو اس مدرسے پوتے "نان و استخوان" آئی اور انھوں نے جواب میں دوسرا مدرسہ قائم کر کے یہ "روٹی کا ٹکڑا" چھین لینا چاہا۔ حالانکہ مدرسۃ الاصلاح کے کارکن اور مدرس جن حالات کے تحت اس درسگاہ کو چلا رہے ہیں وہ فاقہ کشی اور دشت پیمائی سے کم نہیں ہے لیکن فریق ثانی کی "ریزہ چینی فطرت" اس حقیقت کو کیوں سمجھنے لگی تھی اس نے فوراً محاذ جنگ قائم کر دیا اور آخرکار وہی ایک حربۂ تکفیر جس سے غریب مولوی ہمیشہ کام لیا کرتا ہے اس جنگ میں بھی استعمال کیا گیا۔

اسباب تکفیر یہ بتلائے گئے کہ اس مدرسہ میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے خیالات کی اشاعت ہوتی ہے جو کافر تھے۔ مولانا شبلی اس لئے کہ وہ "کلام" اور "علم الکلام" کے مصنف تھے اور مولانا حمید الدین اس لئے کہ وہ قرآن پاک کی شرح و تفسیر میں اکابر سلف کی تقلید سے کہیں کہیں ہٹ جاتے ہیں۔

استفتاء شائع کیا جاتا ہے اور اس پر چالیس سے زیادہ علمائے کرام فتوے دیتے ہیں کہ شبلی و حمید الدین کافر تھے اور وہ لوگ بھی کافر ہیں جو ان کے خیالات کی اشاعت کرتے ہیں۔

ان فتویٰ دینے والوں میں مولوی اشرف علی صاحب ایسے جید عالم سے لے کر محمد علاء الدین ایسے معمولی مولوی تک شامل ہیں،

ٹھیک اسی زمانہ میں جب سرائے میر کے اندر یہ ہنگامہ دار و گیر برپا تھا مولوی حسین احمد صاحب دیوبند سے سرائے میر آئے اور وہ بھی اس فتوے کو دیکھ کر مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں کی طرف سے بدظن ہو گئے لیکن جب ان کے سوالات کے جواب میں مدرسہ والوں نے سب کچھ وہی لکھ دیا جو مولوی حسین احمد صاحب سننا پسند کرتے تھے، تو انھوں نے پھر ان کے مسلمان ہونے پر مہر توثیق ثبت کر دی لیکن مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کی طرف سے اب تک ان مولویوں کے دل صاف نہیں ہوئے اور ہونا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ یہ دونوں بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنی قوت ایمان دکھلانے کے لئے اس سے بہتر موقعہ انھیں اور کیا مل سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی پر جو الزامات الحاد و زندقہ کے لگائے گئے ہیں وہ یکسر بے بنیاد ہیں کیونکہ علم الکلام کی جن عبارتوں کو مورد کفر قرار دیا جاتا ہے ان کا تعلق خود مولانا شبلی کے اعتقادات سے نہیں ہے بلکہ ان متکلمین کے عقائد سے ہے جن کا ذکر مولانا شبلی نے کیا ہے لیکن مخالف جماعت نے حد درجہ دسیسہ کاری و تلبیس سے کام لے کر ان کو مولانا شبلی سے منسوب کر دیا اسی طرح مولانا حمید الدین مرحوم کے جو نوٹ متعلق بہ تفسیر رسالۂ اصلاح میں شائع ہوئے تھے وہ بھی نامکمل و ناتمام ہیں اور ان کی بنیاد پر ان کے عقائد سے بحث کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا لیکن اگر اس روا دارانہ نقطۂ نظر کا خیال نہ رکھا جائے تو بھی مولانا حمید الدین کا صرف اتنا قصور ہے کہ تقسیم سُوَر، رکوعوں کے نام اور پاروں کی تفریق میں وہ اسلاف کی رائے سے کچھ ہٹے

ہوئے ہیں اور اگر کلام پاک کے سمجھنے میں کسی کو رائے کی اتنی آزادی بھی حاصل نہیں ہے تو پھر اسلام خدا اور رسول کا تو نہ ہوا بلکہ صرف مؤلف شرح مقاصد کا ہوا، شارح فقہ اکبر کا ہوا، ابن حجر اور صاحب منبراس کا ہوا، ابن حزم اور سیوطی کا ہوا جن کے استدلالات پر مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کو کافر قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرائے میر میں جو کچھ ہوا اس کو مذہبیت اور للہیت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا، بلکہ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگ مدرسۃ الاصلاح کی طرف سے بدظن ہو کر اس کی امداد ترک کر دیں اور دوسرے مدرسے کے مولویوں کی جھولیاں بھریں، یہ ہے ہمارے علمائے کرام کی ذہنیت اور یہ ہیں وہ ذلیل تدابیر جن سے وہ اپنا پیٹ پالنا چاہتے ہیں۔

○

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے

(ا)

مذہب کی حقیقت

علم و مذہب کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں کیونکہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے بغیر چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیئے اور اہل علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آ جائے اس پر یقین لانا ممکن نہیں۔ اہل مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے۔ فریق ثانی کہتا ہے کہ جس چیز کو تم "شے کامل" سے تعبیر کرتے ہو اسی کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے کہ ہماری عقل ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو۔ الغرض اہلِ علم و مذاہب کی یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلاف نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھی۔

اور اس لئے اہل مذاہب بزور شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندین مذہب کی جماعت بڑھتی جا رہی ہے۔ یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادر مطلق کے بجائے ALMIGHTY DOLLAR کی پرستش کی جاتی ہے الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہل کلیسہ حیران ہیں کہ آسمانی بادشاہت کے وجود کو کیونکر قائم رکھ سکیں۔

ھندوستان میں بھی یہ رَو کافی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کی کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے!

اہل مذاہب کی طرف سے جو تدبیر دفاع اختیار کی جاتی ہے وہ زیادہ تر اس لئے بے اثر رہتی ہے کہ انھیں یہی معلوم نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلائل کی بناء پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں۔ امریکہ وغیرہ میں تو اہل مذہب ان کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہوں لیکن ھندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے یہاں کے اہل مذہب قطعاً ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے مقابلے کے لئے کن نئی تیاریوں کی ضرورت ہے؟

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسائل ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے لیکن حقیقتاً ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرین خدا کو خاموش کر سکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انھوں نے خدمت اسلام کی اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے کیونکہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور

اور یہی کہے جائیں تو رہتا ہے کہ ہم کو ہراں عجب جائے گا۔ پھر چونکہ پیروانِ اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کے مطابق کہتے ہیں اس لئے ان کی طرف سے جب اس نوع کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔

علماء اہل اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو اعتراض کئے جاتے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اوّل تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ ان پرانے اعتراضات کا کبھی رد کیا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اگر اہل مذاہب واقعی الحاد کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو سنیں، بغیر کسی جذبۂ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ ان کے دلائل کا کوئی مسکت جواب ان سے ممکن ہے یا نہیں، صرف گالیاں یا بددعائیں دینے سے کام نہیں چلتا چنانچہ میں ایک لامذہب (ملحد) کے پانچ مقالے سلسلہ وار پیش کر رہا ہوں تاکہ اہل مذہب کو معلوم ہو جائے کہ دنیا میں الحاد پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور پھر اگر ممکن ہو تو اس کا علاج سوچا جائے

مَذہب کیا ہے؟

"خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبر ہے اس لئے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی مطیع رہے۔ یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی اعتقاد کے تحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے چنانچہ اوّل اوّل لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا ان کی فصلیں خراب کر دیتا، پانی برسانا بند کر دیتا، بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔ اس اعتقاد قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے، اور اسلام میں بھی۔ وہاں خدا اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لئے چین سے بیٹھ گیا، اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہو کر آئندہ کے لئے ——— صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا!

اہل مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے۔ اس لئے ان اعتقادات کے پیش نظر ——— قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لامذہبیت کی، اور چونکہ اس وقت تک اہل مذہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں اس لئے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

شبہات ملاحظہ ہوں:-

کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قائم ہے؟

کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کہتے ہیں؟

کیا واقعی خدا رب کا خالق ہے؟

کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دعاؤں کو سنا ہے؟

کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

(۱) اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کئے جو مسخ و قبیح ہیں، مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست؟

مجرموں۔ دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی، کیا کوئی ایسی قوت کی طرف سے جسے ذات کل اور قوت مطلق کہتے ہیں۔ ان نقائص تخلیق کی کوئی معقول توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے؟

(۲) اگر خدا تمام امور عالم کا مدبر و منظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنہوں نے دنیا میں سوا ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟ کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بے گناہوں کا خون بہایا جاتا ہے؟

کیا وہ دور غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بیگناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے ان کے بلکتے ہوئے بچے جدا جدا کر کے قتل و ذبح کر دیئے گئے؟

کیا وہ اُن مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بے گناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علیحدہ کر دینے پر مشتمل تھے؟

خدا نے کیوں ظالموں اور بد کرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں؟

خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقع دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں،

زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے ؟ سل، دق، سرطان، خناق اور اسی طرح کی سیکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے، جس سے نہ معصوم بچے جانبر ہو سکتے ہیں، نہ زاہد و مرتاض انسان ؟

درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا، زہریلے سانپوں کا لوگوں کو ڈستے رہنا اور خدا کا کچھ نہ کہنا عجیب معمہ ہے۔

کیا اس نے ناخن و چنگال اسی لئے پیدا کئے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اس نے پر و بال اسی لئے بنائے ہیں کہ معذور و بیکس آسانی سے گرفت میں آسکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بنا کر اپنی بھوک مٹائیں ؟

کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ ایک جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو اور کیا تدبیرِ عالم آداورکرادکا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی ؟ پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے ؟

دراصل وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا، جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے، خود ہی ایک معبد تیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف غلاموں کے لئے موزوں ہیں، یعنی اطاعت، فرمانبرداری، نفس کشی، صبر و تحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خود مختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرأت و اقدام کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو

غلام کو خوش گوار نہیں بنا سکتا۔

○

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے؟ وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب و جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گراتا، کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن سوا جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انہیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا ان کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا، ان کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے۔ بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے؛ مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دے کر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لئے باد سموم کے ان جھونکوں کو پیش کیا جائے گا؟ جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں؟ کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے؟ کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کے شعلے بچے بڈھے کی بھی تمیز نہیں کرتے؟

کیا اگر یہ تباہ کاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے؟ کیا اگر زلزلہ و طوفان، قحط و وبا کی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ خدا مہربان نہیں ہے؟

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا۔ اس نے

قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیا ہے تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی۔ ان کو ایذا پہونچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی؟

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہلائے گا؟ نوع انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دے گا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا، کتنے ماؤں کے دل ان کے بچے جدا کر کے تڑپائے گا۔ پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں تھا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز مناظر کا منتظر تھا؟

وہ قید خانے جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے اپنی جانیں دے دیں، وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لئے نصب کی گئیں، وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقع نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علیحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروایا گیا، وہ بے شمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا اور وہ لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دنیا میں مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام کچھ میں نہ آنے

والے واقعات رحیم وکریم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا ؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے لیکن حقیقت کیا ہے ؟

انسان فطرتاً قدام پسند واقع ہوا ہے وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتلاتے ہیں کہ اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط ۔

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کر کے چل پڑتا ہے وہ ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں، وہ بایاں راستہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کر کے منزل تک پہنچ جاتا ہے، اس کے بعد وہ اس جگہ پہونچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ تو کیا یہ رہنمائی خود اس کی جستجو کا نتیجہ تھی ؟

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اس قوت نے دیا یا خود اس کے تجربے نے ؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتلانے والی ہے، یہ قوت ادراک و ارادہ سے بالکل معرا ہے اور اس کا نام ہے تجربہ !

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس اخلاقیت کے وجود کو وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خاندانوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی و

عائلی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضاء شمار کئے گئے اور جنہوں نے تکلیفیں پہونچائیں انھیں برا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے بُرے ہونے کا معیار قائم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتائج پر غور کیا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتائج بعیدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

○

مذہب کیا ہے؟ اگر سول عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا؟ جب اس کا اقتدار قائم کیا تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنایا؟ اس کا اثر اطالیہ، اسپین، پرتگال اور آئرلینڈ پر کیا ہوا؟ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فائدہ اس سے حاصل ہوا؟ انگلستان، امریکہ، ہالینڈ و اسکاٹ لینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا؟ اگر عیسویت کے سوا وہ کسی اور مذہب کے پیرو ہوتے تو کیا وہ اس سے زیادہ خراب ہو جاتے؟

اگر ڈیرکسمڈ، زردشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہو جاتا، کیا کالون اور زیادہ خونخوار بن جاتا اگر وہ یہودی ہوتا؟ کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیث مسیحیت کے قائل نہ ہوتے؟ کیا جان ناکس اور زیادہ بُرے اخلاق کا ہو جاتا اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشش کا ماننے والا ہوتا؟

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہو چکا ہے اور اب اس کی ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لئے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبۂ رافت والفت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس لئے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا چنانچہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قائل ہیں ان کے لئے مذہب کا خیال کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا انسان، فطرت اور صفات مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کر سکتا ہے کیا ہم طوفانوں کو پوجا پاٹ کے ذریعے کم و بیش کر سکتے ہیں کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہوا کا رخ بدل سکتے ہیں کیا ہم الحاح وزاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں، کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز جسے نفس کہتے ہیں کیا وہ قانون قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قائم ہے کہ عالم فطرت کا کوئی ایک مالک ہے، جو دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دنیا میں کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہو سکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قائم کرتے ہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے محض وہم و قیاس پر کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا اس لئے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اس کے لئے چند بنیادی حقائق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں:

مثلاً یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے، تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کی وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں، اس لئے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے جسے مدبر کائنات کہا جائے۔

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا وہ واقع ہوا جو ممکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آئندہ بھی رونما ہوتا رہے گا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے۔ جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہوگا حال کا۔ انسان سے لے کر رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون کے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دنیا کی اصلاح کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لئے دیوتا، دیویاں، بہشت و دوزخ، الہامات و معجزات کلیسا و خانقاہ، تیغ و شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں۔ ایک بادشاہ کو تخت سے اتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا۔ نوح کشتیاں کی گئیں، دعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی۔ الغرض مذہب نے سبھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ کیونکہ مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی، اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو نوع انسان کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہ ہیں وہ خیالات اس زمانے کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں رسالوں اور لکچروں کے ذریعہ سے تمام دنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم دہریت و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کی اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں۔ پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں الجھا کر فریق مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح اس کی زبان تو بند ہو سکتی ہے، لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ضرورت ہے اس مذہبی روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوا بلند تعلیم اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام و معجزات، بہشت و دوزخ، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے تسلیم کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہل مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف

برسرِ پیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہے گی۔ دنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات، بین الاقوامی تعلقات، اقتصادی مشکلات، اخلاقی اصولِ عامہ کو پس پشت ڈال کر صرف "امید فردا" پر اپنی کارگاہ تبلیغ قائم کرے۔ وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لئے مخصوص ہوا کرتا تھا، اب کرۂ زمین کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے تخصیص نسل و جغرافیہ کا سوال بالکل لایعنی چیز ہے اور مذہب کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو تمام آبادی کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب کے اعتقادی حصہ کو علیحدہ کر کے اسے ہیئت اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل آرگنائزیشن" کی حیثیت نہ دی جائے۔

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے!

(۲)

صراطِ مستقیم

ہمارے سامنے دو راستے ہیں، ایک وہ جو فطرت اور عالمِ اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو ما فوق الفطرت باتوں کی جانب مائل کرتا ہے ——— یعنی ایک وہ ہے جو ہمیں تحقیق و جستجو، انکشافات و اختراع، سعی و کاوش اور رشتۂ علت و معلول کی طرف متوجہ کر کے راحت و آسائش، امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیں بتاتا ہے کہ اصل دنیا یہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے اور اسی غیر معلوم دنیا کے لئے بلا حیلہ و حجت ہم کو قربانیاں، دعائیں اور عبادتیں کرتے رہنا چاہیئے۔

ان دونوں راستوں میں اور کیا فرق ہے؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کے لئے اسباب راحت وسکون فراہم کرنے کا،

دوسرا کہتا ہے کہ حیات انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز وانکسار کا ابدی معاوضہ دیں گے ایک عقل وحقائق پر اعتماد کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرا صرف عقائد پر بھروسہ کرنے کی۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس وادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود تمہارے اندر پائی جاتی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ اس مقدس روشنی کو گل کر دو ؎

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ اس سے زاید کچھ نہ کر سکتے تھے وہ ایک مافوق الفطرت قوت پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر وہ طاعت وعبادت، دعا وقربانی نہ کریں گے تو نہ بارش وقت پر ہوگی اور نہ ان کی کھیتیاں بارآور ہوں گی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک مستبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذرا سی بات ناگوار ہو جاتی ہے اور جو برہم ہو کر سزا دینے پر اتر آتا ہے وہ خدائے خیر کے ساتھ خدائے شر کے بھی قایل تھے اور انھیں دو خداؤں کے درمیان بیم ورجا کی "رعشہ براندام" زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کی حیات کا کوئی لمحہ خوف سے خالی نہ گزرتا تھا اور ہر وقت وہ اسی ڈر سے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا کوئی ان سے خفیف سی گستاخی سرزد ہو جائے اور خدا ناراض ہو کر انھیں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوفان آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے انھیں کی بداعمالیوں کا، زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے۔ وبائی بیماریاں پھیلتی تھیں تو وہ اس

بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے۔ اور جب چاند سورج کو گرہن لگتا تھا تو اسے بھی اپنی ہی خطاؤں کا نتیجہ باور کرتے تھے تمام فضا انھیں فرشتوں یا خبیث روحوں سے معمور نظر آتی تھی اور شب و روز صرف اس لئے الحاح وزاری کیا کرتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہو کر تباہ و برباد نہ کر دے قدرت ان کے نزدیک گویا ایک سوتیلی ماں تھی جو پیشانی پر شکنیں ڈالے ہوئے ہر وقت انھیں خونچکاں آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔

آخر کار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والا دماغ لے کر پیدا ہوئے انہوں نے تمام حوادث و واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے سمجھا کہ طوفانوں اور زلزلوں کے اسباب طبیعی کچھ اور ہیں۔ سورج گرہن کے لئے ایک زمانہ معین ہے اور پہلے سے اس کے وقوع کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش۔ کرۂ زمین کے جغرافی حالات، آب و آتش کے خواص، مظاہر فطرت کے اسباب، حیات انسانی کی خصوصیات اعضاء جسم کے وظائف معلوم کئے گئے اور واہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ کڑیاں ٹوٹیں؛

اس کے بعد کچھ زمانہ اور گزرا یہاں تک کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں۔ کتابیں تصنیف کی گئیں، مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ علمی انکشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا، فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور مافوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اصول فطرت نے لے لی۔ پھر روح کے اس احساس آزادی کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہ ظاہر ہو کر رہا۔ یعنی اختراع و ایجاد کے دروازے کھل گئے اور ارباب مذہب اپنی اور اپنے اعتقادات کی کمزوریوں کو بُری طرح محسوس کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں "معتقدین" کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش کر نہ سکتے تھے، کیونکہ یہی ایک چیز ان کے دسترس سے دُور تھی۔ اس لئے وہ اہل علم

کے خلاف ملک میں نہایت مکروہ پروپیگنڈا کی اشاعت پر اتر آئے اور واہمہ پرستی کے پاس جہل و تعصب کے جتنے گندے حربے موجود ہیں ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کر دیا گیا ان کو ذریات شیطان بتایا گیا خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا۔ ان کے مٹا دینے کا نام مذہبی جہاد قرار پایا۔ اور استعمال آتش و زنجیر اور تعذیب تذلیل کی جتنی مہیب صورتیں ہیں وہ سب بروئے کار لائی گئیں،

پھر یہ سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا، بلکہ یہ خون آشامیاں صدیوں تک جاری رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکاب مذہب کے نام پر جائز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔ ایک فریق کہتا تھا کہ جذبات انسانی کو فنا کر دو اور ضروریات زندگی کو کم، اپنے آپ کو معذور سمجھو اور آسمانی قوت پر اعتماد کامل رکھ کر تمام کام اسی پر چھوڑ دو، دوسری جماعت کہتی تھی کہ جذبات انسانی اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ مناسب حدود میں ان کو تسکین پہونچائی جائے اور ضروریات زندگی کو بڑھانا بھی لازم ہے کیونکہ بغیر ان کے انسانوں کو اپنی قوتوں کا علم نہیں ہو سکتا اور دنیا میں کوئی ایجاد و اختراع معرض ظہور میں نہیں آسکتی،

ایک فریق کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے اور اسباب راحت سے نفرت کی جائے، یہ لوگ فنون لطیفہ کے دشمن تھے اچھی غذا، اچھے لباس، اچھے مکانوں سے متنفر تھے، گویا یوں سمجھئے کہ یہ حکما تھے، غربت و افلاس کے تشنگی و گرسنگی کے جھونپڑوں کے چیتھڑوں کے، برہنہ پائی کے اور ایک ایسے آہستہ رد عمل خودکشی کے جو دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً قوم کی قوم ہلاک کر دینے والا ہے۔ ان کو اس دنیا میں سوا عذاب و مصیبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا اور دوسری دنیا ہر قسم کے اسباب نشاط و راحت سے معمور نظر آتی تھی، وہ امرا و اصحاب ثروت سے اور تمام ان لوگوں سے جو اپنی قوت بازو

کی وجہ سے راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں نفرت کرتے تھے اور جنت میں سوائے گداگروں اور بھکاریوں کے کسی اور کا درخور محال سمجھتے تھے،

الغرض یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے دنیا کو ویران و غیر دلچسپ رکھنے کے لئے سیکڑوں سال تک جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انھیں کامیابی بھی حاصل رہی، لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار چکھ لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے، اس لئے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بالکل بدل گئی۔

چنانچہ اب انسان اس جسم متحرک کا نام نہیں ہے جو ایک وقت معین تک حرکت کرتے رہنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے بلکہ انسان نام ہے قوائے عقل و دماغ کی ترقی کا، حرکت و عمل کا، تحقیق و جستجو کا، اعتماد ذاتی کا اور آسمان سے لے کر زمین تک تمام مناظر قدرت پر چھا جانے کا۔ اب وہ اس کا قائل نہیں کہ طاعت و عبادت بجائے خود کوئی تقدس و پاکیزگی ہے اور انعام خداوندی کی مستحق، اب وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جزا و سزا مافوق الفطرت سے متعلق ہے بلکہ وہ تقدس کا مفہوم صرف حرکت و عمل کو قرار دیتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ انسان کی دوزخ و جنت خود اسی کے اندر اور اسی دنیا میں موجود ہے اور اسے اختیار حاصل ہے خواہ وہ مجہول و بے کار زندگی بسر کر کے جہنم میں چلا جائے خواہ سعی و محنت سے کام لے کر فردوس حاصل کرے۔

یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا، بادشاہ بنا کر بھیجتا ہے اور رعایا کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، اب ختم ہو گیا۔ یہ عقیدہ کہ مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتائے ہوئے اصول و عقائد کو بغیر چون و چرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے بہت کچھ مٹ گیا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں اور مذہبی حکومتیں بھی

محو ہوتی جارہی ہیں:

انگلستان میں بجائے خدا کے اب پارلیمنٹ کی حکومت ہے اور امریکہ میں مذہبی اقتدار کی جگہ رائے عامہ نے لے لی ہے۔ فرانس اپنی آبادی کے سوا کسی ما فوق الفطرت قوت کو حکومت میں دخل دینے کا مستحق قرار نہیں دیتا اور روس میں سب سے بڑا جرم خدا اور مذہب کا نام لینا ہے۔ یوروپ میں صرف ایک قیصر ولیم (شاہ جرمنی) ایسا بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو فرستادۂ خدا سمجھتا تھا سو گزشتہ جنگ میں وہ بھی ختم ہو گیا۔

انسان آزادی کامل کی اس منزل تک سخت صعوبتیں اٹھانے کے بعد پہونچا ہے اور استعمال عقل کے استحقاق کو اب اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ جس وقت تک وہ اپنی فہم و فراست کو مشعل راہ بنانے سے باز رکھا گیا۔ بے شک وہ کہہ سکتا تھا کہ اصل نیکی صرف خوف جہنم سے کانپتے رہنا ہے اور حصول نجات کے لئے یہی کافی ہے لیکن جب اس نے دیکھا کہ تنہا عقیدہ نہ اس کے لئے روزی فراہم کر سکتا ہے نہ تن پوشی کے لئے لباس تو اس کی نگاہیں آسمان کی طرف سے زمین کی جانب مائل ہوئیں اور وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب کا پابند کہتے ہیں وہ بھی اسی کی طرح جرم و معصیت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ سقراط کو جس نے زہر کا پیالہ دیا وہ بھی مذہبی انسان تھا اور عیسیٰ کو جنھوں نے سولی پر چڑھایا وہ بھی خدا ہی کے ماننے والے تھے اس لئے اس کی روح میں بغاوت پیدا ہوئی اور اس طرح سب سے پہلا جذبۂ انتقاد جو مذہب کے خلاف رونما ہوا وہ خود اہل مذہب ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔

○

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ اپنے سوا تمام دنیا کو گمراہ بتائیگا

اور اسی خدا کو قابلِ پرستش قرار دیگا جو اس نے وضع کیا ہے، دوسرے مذاہب و اقوام کے خداؤں کو وہ جھوٹا بتائے گا۔ وہ سوا اپنے معبد کے کسی اور کی عبادت گاہ کی عزت نہ کرے گا۔ سوا اپنے طریقِ عبادت کے وہ کسی اصولِ بندگی کا احترام نہ کرے گا وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذہب کی قربانیوں کو لغو و بیکار بتلائے گا۔ گویا اسی کا خدا خدا ہے، اور اسی کا پیغمبر پیغمبر، اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں مقبول۔

اب خدا کے اس تصور کو دیکھئے جو الہامی مذاہب نے پیش کیا ہے، خدا کو قادرِ مطلق، بے نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکنے والا بتایا جاتا ہے۔ لیکن اسی کیساتھ کتبِ مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے، وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے!

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرتا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اس قدر برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے انھیں اٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقسوم کر دیتا ہے۔ خدا اور اتنا غصہ، خالق اور اپنی مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی سرزد ہو گی تو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکنے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا۔ خود ہی برہم ہو کر انھیں مبتلائے آلام کر دیا، عجیب تماشہ ہے،

الہامی صحایف خدا کے غصے اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں

قوموں کو اس نے برباد کیا۔ بستیوں کو اس نے ویران کیا۔ وبائیں اس نے مسلط کیں، آسمانی عذاب اس نے نازل کئے۔ حالانکہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اسی کی پیدا کی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسان کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے) تباہ کرنا ہی مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ انہیں معصوم پیدا کرتا۔

—— ایک بار ساری دنیا کو سوائے آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام زمین کو لاشوں سے پاٹ دیتا ہے اس کے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے نہ وہ اہل مصر کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ اہل ایران کی طرف، نہ اسیریوں کو قابل اعتنا خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو (حالانکہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے —— کیوں؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کر کے ان کے مردوں عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ ہاتھ آجائیں انھیں لونڈی غلام بنالے۔ اس کے علاوہ وہ ادارۂ غلامی قائم رکھنے کے لئے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے۔ بادشاہوں کے جرائم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھتا ہے اور وہ بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہو جاتا ہے اور دوسری سے برہم۔ اس کا سبب؟

حقایق عالم کے لحاظ سے صحف مقدسہ نے جو معلومات انسان کے سامنے پیش کی ہیں، ان کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ زمین کا چپٹا و مسطح بتانا طبقات الارض

کا انتہائی درس ہے۔ اور تاروں کو آسمان میں جڑا ہوا ظاہر کرنا فلکیات کا بلند ترین نظریہ!

○

صحت و امراض کے متعلق دو نظریئے دنیا میں رائج ہیں، ایک مذہبی، دوسرا علمی، مذہبی نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواحِ خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسم انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواحِ خبیثہ کو مذہب کے نفوس مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔

جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین اور ارواحِ خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک یہ خدمت انجام دی، چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ میں لاکھوں کروڑوں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک، دعا، تعویذ اور گنڈوں سے ہوتا رہا۔ امراض کے طبیعی اسباب کا کوئی علم نہ تھا۔ مقدس اہل مذاہب دعاؤں کے بہانے سے ہزاروں روپیہ کماتے تھے (فقیروں کی روزی کا مدار اسی پر ہے)

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں چنانچہ اس وقت سوائے جاہل ممالک کے جن میں ہندوستان کا مرتبہ سب سے بلند ہے جنات یا شیاطین یا ارواحِ خبیثہ کا عقیدہ بالکل اٹھ گیا ہے اور جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو بجائے دعا تعویذ کے علاج کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

○

مذاہب عالم اور کتب مقدسہ کے متعلق بھی دو خیال ہیں۔ ایک جماعت (اہل مذہب) کہتی ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں، انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ صحف مقدسہ سب انسانوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور مذہب رونما ہوا ہے صرف اس جذبہ

خوف سے جو حوادث طبیعی و مظاہر قدرت کو دیکھ دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا چنانچہ دنیا میں کوئی قدیم قوم ایسی نہ تھی جس کا کوئی مذہب نہ رہا ہو اور طاعت و عبادت کو اس نے اپنی حفاظت و نجات کا ذریعہ خیال نہ کیا ہو لیکن رفتہ رفتہ یہ واہمہ پرستی کم ہوتی گئی یہاں تک کہ اب ہر ذی فہم انسان جانتا ہے کہ دنیا میں ہر واقعہ کا ایک فطری سبب ہوا کرتا ہے اور قدرت بغیر اس خیال کے کہ انسان کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں۔ اپنے کام میں مصروف ہے،

اب مفکرین اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کئے تھے اور خدا و الہام خداوندی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے انہیں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں، نہ خدا کو طاعت و عبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دعا سنتا ہے۔ اہل دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و وباء طوفان و سیلاب کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور کوئی دعا انھیں دور نہ کر سکی، زلزلے آتے رہے۔ جوالا مکھی آگ برساتے رہے۔ ہزاروں معصوم نفوس فنا ہوتے رہے اور انسان کی کسی گریہ وزاری نے خدا کو اس ہلاکت باری سے باز نہ رکھا، کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا نہ حاصل کر سکیں وبائیں پھیلتی رہیں اور خدا کے نام پر لکھے ہوئے تعویذ کسی ایک متنفس کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے غلاموں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان ہوتی رہی۔ عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جائز رکھا گیا۔ شیر خوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کئے گئے، ان کی فریاد و زاری ایک لمحہ کے لئے خدا کو متوجہ نہ کر سکی کہ وہ ظالم بادشاہوں کی حکومت کے بجائے آسمانی بادشاہت قائم کرتا۔

○

اخلاقیات کے باب میں اہل مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے جس فعل سے باز رکھا ہے وہی بُرا ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے زنی کرے گویا مذہبی انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمان خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہو جائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے

تقریباً تمام اہل مذہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ وجودِ خدا کا قائل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بے کار ہے۔

علماء اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بدی اشیاء کی فطرت میں موجود ہے بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مصائب کا سبب بن جاتے ہیں، چنانچہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاقِ حسنہ کہتے ہیں اور موخرالذکر کو افعال قبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق انسانی کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر اُن کے بُرے یا اچھے ہونے کا اُصول قائم کیا گیا ہے۔ نہ خدا ان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کر کے جزا و سزا دینے کی ضرورت، چوری کو بُرا سمجھنے کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی۔ انسان کے تجربے نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اُسے بُرا قرار دیا، تمام وہ جرائم جو انسان کو جسمانی اقتصادی و عمرانی نقصان پہونچاتے ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کس کو!

پھر جو چیز اس لحاظ سے بُری ہے وہ یقیناً بُری سمجھی جائے گی خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو، واقعات و تاثرات کو کوئی قوت بدل نہیں سکتی جس طرح قدرت ایک مربع کو دائرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے اسی طرح وہ کسی بُری بات کو اچھی اور اچھی کو بُری نہیں بنا سکتی

الغرض اہل مذہب نے جو نظریۂ اخلاق قائم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا۔ ایک شخص نیک کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طمع سے کہ اس کا انعام دوسری دنیا میں ملے گا، دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بناء پر کہ یہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے اور دونوں کے فرق کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

○

الغرض اس وقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف رہبری کرتا ہے۔ سو اول الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسطین میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن اہل فلسطین کی مذہبیت ان کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی، وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج البلد کئے گئے صدیوں تک امداد خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انھیں پھر مجتمع کرے گا۔ ان کی بستیوں، ان کے معبدوں اور قربان گاہوں کو از سر نو تعمیر کرے گا۔ لیکن صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

اس کا تجربہ سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا لیکن وہاں بھی سوا غلامی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں اور صرف انھیں لوگوں کو آزادی کے ساتھ بولنے کا حق رہا جو صاحب جاہ و ثروت تھے، عوام سے ان کی معصوم مسرتیں چھین لی گئیں،

نف
ان کے لئے ہنسنا ممنوع قرار پایا اور سوائے رنج غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اوراد و وظائف روزہ صلوٰۃ، وعظ و پند کو بھی آزما کر دیکھ لیا لیکن کوئی چیز انھیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کرسکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت لیکن ظالم گرگوں کا غلام بن کر رہنا پڑا۔ پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے اور خوف و واہمہ پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر رہے تھے، وہ اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے عذاب خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے۔ پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا جو ہونا چاہیئے۔ انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابل برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی جا رہی تھی۔

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو گل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اس زمانہ کے قانون اس زمانہ کے اوہام و تعصبات اس قدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ، پادری خدا کے بیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعویٰ کر رہے تھے۔ بہشت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا دھکیل دیتے تھے۔ نہ ان کے دلوں میں رحم تھا۔ نہ آنکھوں میں مروت ادنیٰ ادنیٰ سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا۔ کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈال دینا معمولی بات تھی۔

ازمنۂ مظلم میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ ہادم انسانیت تھا ہزاروں سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بے شمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست۔ قیدخانے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے اور سیکڑوں انسان دہکتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی جس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا ہو۔ الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ جو اصل

مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اب اس کے مقابلے میں اس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے کیسا صاف و ہموار راستہ ہے کیسی کھلی ہوئی فضا ہے۔ کیسی پُربہار زمین ہے۔ ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے۔ اور ہر دماغ اسی فکر میں ہے کہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا سامان بہم پہونچائے۔ نہ وہاں سولیاں ہیں نہ قید خانے۔ جہنم کے اژدہے ہیں نہ فرشتوں کے کوڑے قدرت کی وسیع فضا ہے جس سے ہر شخص یکساں فائدہ اٹھا رہا ہے عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر مستفیض کرنا چاہتا ہے۔ انسانیت کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں غلامی کا داغ اشرف المخلوقات کی پیشانی سے ہٹ چکا ہے، ذہنی آزادی نے مختلف قسم کے چمن کھلا رکھے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش و بغلگیر نظر آتا ہے۔

○

جس وقت میں تاریک ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو میرا ریشہ ریشہ کانپ اٹھتا ہے سب سے پہلے مجھے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں جہاں مقدس اژدہے کنڈلیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود ہیں۔ جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس افعی دیوتا کے حضور میں پیش کرتے ہیں وہ اس چیختے تڑپتے ہوئے بچہ کو اپنے بل میں لپیٹ کر پیس ڈالتا ہے اور بے رحم والدین اس ہدیہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں ——— اس کے بعد مجھے وہ عبادت گاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے تیار کیا گیا ہے لیکن یہاں ان کی قربان گاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس پجاریوں کے خنجر معصوم لڑکیوں کے سینوں میں یہاں بھی پیوست نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے

آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی کو انسانی گوشت زخون سے قائم رکھا جاتا ہے پھر چند عبادت گاہیں اور دکھائی دیتی ہیں جن کی قربان گاہیں بیلوں اور بھیڑوں کے خون سے تر ہیں اس کے بعد ہی مجھے کچھ اور معبد، کچھ اور پجاری، کچھ اور قربان گاہیں نظر آتی ہیں جہاں انسانی آزادی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ خدا کے معبد تو نہایت عظیم الشان ہیں، لیکن کسانوں کے پاس جھونپڑا تک نہیں۔ پجاریوں اور بادشاہوں کے جسم زرکار عباؤں سے آراستہ ہیں لیکن رعایا کے پاس جسم ڈھانکنے کو بوسیدہ سا چیتھڑا بھی نہیں۔ اور کیا دیکھتا ہوں؟ یہ کہ قید خانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں، خارج البلد خانماں برباد بوڑھے بچے، عورتیں پہاڑوں اور صحراؤں میں سر ٹکرا رہی ہیں۔ آلات تعذیب حرکت میں آ رہے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی چیخ سے خانقاہیں گونج رہی ہیں ——— اُف، وہ تاریک قید خانے، وہ زنجیروں کی جھنکار، وہ آگ کے بلند شعلے، وہ جھلسے ہوئے سیاہ چہرے، وہ اینٹھتے ہوئے اعضا، وہ شکنجوں میں کسے ہوئے ہزاروں معصوم انسان اور وہ ان رگوں کے ٹوٹنے کی آوازیں۔ اس کے بعد جو میری نگاہ اٹھتی ہے تو افق میں مجھے ایک نئی روشنی نظر آتی ہے انسانی جسموں کے راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی عقل و مذہب آزادی، اب غلامی کی زنجیریں آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں قربان گاہیں فنا ہوتی جاتی ہیں، عبادتگاہیں مسمار ہو رہی ہیں۔ زبان کی بندشیں اٹھتی جاتی ہیں اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ اب میں پھر دیکھتا ہوں لیکن ماضی کی طرف نہیں بلکہ مستقبل کی طرف اور فرط مسرت سے اچھل پڑتا ہوں۔ اس وقت مجھے کیا کیا نظر آتا ہے یہ کہ پجاری اور بادشاہ ختم ہو چکے ہیں۔ قربان گاہیں اور تخت و تاج خاک میں مل چکے ہیں۔ امارتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود ——— ان کی جگہ ایک نیا مذہب رونما

ہوا ہے، جس کا نام آزادیٔ ضمیر ہے۔ اور ایک نئی سلطنت قائم ہوئی ہے جس کی ملکہ حریتِ فکر و رائے اور جس کی رعایا اخوتِ عامہ ہے۔ ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن۔ نہ کوئی قید خانہ ہے نہ بیمارستان، نہ عدالت گاہیں ہیں نہ جرم و معاصی کی داستان۔ ایک ایسی دنیا ہے جہاں سوا صداقت کے کسی چیز کا گذر نہیں۔ سوا حُسن و جمال کے کوئی شے پیشِ نظر نہیں۔ جدھر دیکھو نور کی بارش ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں۔ عقبیٰ کا خوف دنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی محبت میں۔

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے

(۳)

مذہب کا مستقبل

اس وقت دنیا مذہب کی طرف سے کافی بدگمان ہو چکی ہے اور اس کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ مغرب کے اسی عہد کی برکت ہے درست نہیں۔ مذہب کی طرف سے انحراف کب اور کیونکر شروع ہوا اس کا سراغ لگانے کے لئے ہم کو یورپ کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اس دور میں جس کو ہم دورِ "نشأۃ ثانیہ" (RENAISSANCE) یا یورپ میں تہذیب و تمدن کی دوبارہ پیدائش کے نام سے یاد کرتے ہیں، زندگی کے مختلف مسائل پر بحث کرنا ایک عام تفریح ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں ——— علمی تحقیق و تجسس کا وہ جوش

وولولہ پایا جاتا تھا جو یورپ میں روم کی قیصریت کے فنا ہونے کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لوگوں کو اس وقت یہ پتہ چلا کہ دنیا میں ایسے بھی مسائل پائے جاتے ہیں جن کا نہ انجیل میں تذکرہ ہے اور نہ جن کے متعلق پادریوں کی زبانیں کھلتی ہیں چنانچہ ایسے ہی مسائل زندگی پر لوگ اکثر آپس میں بحث کیا کرتے تھے۔ اس چیز کی ابتداء سب سے پہلے اٹلی میں ہوئی اور پھر یہ مباحث انگلستان اور فرانس تک پھیل گئے۔

اٹلی کا ایک مشہور اور سابق پادری گیارڈینو برونو (GIORDENS BRORU) جب تک قتل ہونے سے محفوظ رہا برابر پادریوں اور ان کی مہمل تعلیمات پر اعتراض کرتا رہا اور پھر اُس نے لندن کو اپنا مستقل قیام گاہ بنا لیا۔ یہاں اس نے اور سر فلپ سڈنی نے (جو انگلستان میں ایک بے داغ ہستی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) مفکرین کا ایک ایسا حلقہ بنا لیا جو انسان اور کائنات پر بحث کیا کرتا تھا۔

چونکہ اس دور کے اکثر افراد ملحدانہ خیالات کے بھی حامل تھے اس لئے وہ مذہب کے مستقبل پر بھی بحث کیا کرتے تھے ان میں سے مشہور ڈرامانویس کرسٹوفر مارلو اور ملکہ الزبتھ کا مشہور درباری سر والٹر ریلے ایک قسم کا کلب بنائے ہوئے تھے جہاں مذہب کے مستقبل پر انتقاد و تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ مذہب عیسوی باطل ہے کیونکہ علمی و تاریخی تحقیقات عیسویت کے افسانوں کو جھٹلا رہی تھیں جہازراں ایسے ممالک دریافت کر رہے تھے جو کبھی عیسیٰ کے خواب میں بھی نہ آئے تھے۔ منجم کائنات کے بارے میں ایسے انکشافات کر رہے تھے جو عقل انسانی کی محدود چہار دیواری کی بنیادوں کو متزلزل کئے دے رہے تھے،

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ تحقیق و جستجو صرف ان لوگوں تک

محدود تھی جن کے پاس فرصت تھی، دولت تھی اور جو تمام دنیاوی علائق سے بے نیاز ہو کر اپنا سارا وقت اسی قسم کی تحقیق و تجسس میں صرف کرتے۔ ورنہ قوم کے زیادہ افراد جاہل تھے وہ مطلق نہیں جانتے تھے کہ تحقیق جدید کیا ہے اور جب کسی بے دین یا ملحد کو زندہ — — — جلتے ہوئے دیکھتے تھے تو خوش ہوتے تھے بالفرض تعلیم یافتہ لوگ تو مذہب کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے اصول سے انھیں اختلاف تھا لیکن قومی مصالح کی خاطر انھیں اپنے مذہب پر قائم رہنا پڑتا تھا۔

مگر ان تمام مباحث کے دوران میں ایک چیز کا فقدان تھا اور وہ ارتقا کا خیال تھا کسی کو یہ تصور بھی نہیں تھا کہ نظام معاشرت کسی وقت بدل جائے گا حتیٰ کہ جب سرٹامس مور نے اپنی مشہور کتاب اُتوپیا utopia لکھی تو بھی اسے "باغی" نہیں سمجھا گیا کیونکہ اس کتاب کے تجویز کردہ نظام معاشرت کے قوانین بالکل بعید از قیاس سمجھے گئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے انگریزی میں وہی چیز لکھی تھی جو اٹھارہ صدی قبل یونانی زبان میں افلاطون لکھ گیا تھا۔ تہذیب جدید کے نئے قوانین لوح آسمان پر لکھے جا چکے تھے مگر انسان کی آنکھیں اتنی ضعیف تھیں کہ وہ انھیں نہیں دیکھ پاتی تھیں اور اوہام پرستی کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

لیکن اب ہماری نگاہوں میں زیادہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے اور ہم ان مسائل کو ایسی صداقت کے معیار پر پرکھتے ہیں جس سے پہلے لاعلم تھے اب "قانون قدرت" یا "حقیقت" لفظ "ترقی" (PROGRESS) میں مضمر ہے۔

اگر واقعی نظام اشیاء کا کوئی قانون ابدی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ایک نظام کو دوسرے نظام میں تبدیل ہونا پڑے گا جیسے رات دن میں تبدیل ہوتی ہے۔ بہار خزاں سے بدلتی ہے اور بچپن جوانی سے بدل جاتا ہے ابھی تک ہم اپنے "بزرگوں کی عقل" کی مثالیں

پیش کیا کرتے تھے مگر موجودہ زمانہ میں اس فقرہ کو جو استعمال کرے اسے بالکل احمق سمجھنا چاہئے۔ ہمارے آباو اجداد نہ ہوائی جہاز بنا سکتے تھے نہ ریل چلا سکتے اور نہ موٹر تو پھر ہم انہیں اپنے سے زیادہ عقلمند کیوں تسلیم کریں۔

بہر حال مذہب کو بھی بدلنا ہے اور نصف سے زیادہ دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے وہ لوگ جن میں غور کرنے کی استعداد و صلاحیت موجود ہے اور ہمارے زمانے کے وہ تعلیم یافتہ مرد و خواتین جن کو پڑھنے اور تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کا موقع ملتا ہے ان میں سے اکثریت کو اس امر کا یقین ہو چکا ہے کہ مذہب مٹ جائے گا۔ اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ انسانی آراء کی دوسری منزل کیا ہوگی؟

وہ پیشین گوئیاں جو ادبیات کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ قابل تسلیم نہیں اٹھارویں صدی کے آغاز میں بالمیز (BALMES) نے کہا تھا کہ پروٹسٹنٹ تہذیب (جرمنی ہالینڈ وغیرہ) کی ختم ہو رہی ہے، دنیا کے لئے پروٹسٹنٹ مصلحین کا پیغام بے اثر ثابت ہوا ہے اور کیتھولک سلطنتیں مثلاً فرانس، اسپین، پرتگال، آسٹریا وغیرہ دراصل دنیا کی حکمران بن رہی ہیں مگر اس پیشین گوئی کے نصف صدی بعد یہ دیکھا گیا کہ کیتھولک ممالک تنزل پذیر ہیں یا یہ کہ وہ اپنے سابقہ مذہب کو ترک کر چکے ہیں عوام نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ پیس ثانی (PIUS II) آخری پاپائے روم ہے، اس کے نصف صدی بعد لارڈ میکالے نے لکھا کہ پاپائے روم کا جھنڈا اڑتا ہی رہے گا۔ آج سے بیس برس قبل ایک پیشین گوئی کی گئی کہ کیتھولک مذہب سب سے پہلے نیست و نابود ہوگا۔ اس کے بعد ایچ جی ولس نے یہ کہا کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد جدید شہروں میں بھی پیادہ پا راہب چلتے ہوئے دکھائی پڑیں گے لہٰذا اس قسم کی پیشین گوئیوں کو سچا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ گزشتہ عہد کی

پیشین گوئیاں سیاسی یا فوجی نقل وحرکات اور تحریکات کی وجہ سے غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو پیشین گوئی کی جائے وہ بھی غلط ثابت نہ ہو۔ مذہب کے بارے میں آج یہی نظریہ ٹوکیو میں بھی پایا جاتا ہے اور پیکنگ میں بھی بمبئی میں بھی اور قاہرہ میں بھی، قسطنطنیہ میں بھی اور ماسکو میں بھی۔

غرضکہ مقامی حالات کچھ ہوں اقوام عالم ان مسائل پر اس وقت تک رائے زنی کرتی رہیں گی جب تک اُن کا منطقی حل نہ معلوم ہو جائے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس منطقی حل معلوم کرنے کے شرائط ہر دس برس کے بعد بدل جاتے ہیں اور ان میں سب سے بڑی شرط "علم" ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر عہد میں ایک الحاد پسند قلیل اقلیت یونان۔ روم۔ قرطبہ۔ فلورنس اور تقریباً ہر مقام پر پائی گئی اور آخر میں اس اقلیت کا خاتمہ ہو گیا لیکن یہ نتیجہ تھا اس امر کا کہ "کلچر" صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود تھا اور اب یہ "کلچر" جمہوری ہے آج ۵۰ کروڑ انسان پڑھ سکتے ہیں اور ۵۰ برس کے بعد ان کی تعداد دو چند ہو جائے گی،

پھر یہ تو درست ہے کہ دنیا ہمیشہ مذہب کے بارے میں بحث کرتی رہے گی لیکن یہی کیوں فرض کر لیا جائے کہ ان مباحث کا منطقی نتیجہ الحاد و بے دینی کی صورت میں ظاہر ہوگا اور یہ کہ کیا یہ چیز ان پیشین گوئی کرنے والوں کا رسمی "فریب" (FALLACY) نہیں ہے۔

ہر پیشین گوئی کی سب سے بڑی کمزوری پیشین گوئی کی خود سری ہے وہ اپنے آپ کو اتنا عقلمند تصور کر لیتا ہے کہ جو کچھ اس کے خیالات ہیں آنے والی نسل ان کو بے چون وچرا قبول کرے گی خصوصاً سیاسی و اقتصادی نظریات کی دنیا میں کہ کتابوں اور دانشوروں کے لیکچروں کو جب کوئی شخص دیکھتا اور سنتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ کیتھولک

کو یقین رہتا ہے کہ ساری دنیا اسی کی ہم خیال بن جائے گی، موحد کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب وحدانیت تمام عالم کا ایمان بن جائے گا لیکن جب جارج برنارڈ شا آتا ہے تو وہ ان سب خیالات کو ٹھکرا کر ایک نئی بات کہتا ہے کہ مستقبل کا مذہب کیا ہوگا؟

الغرض ان معاملات میں صورت حال یکساں ہوتی ہے پیشینگو کے دلائل بہت سادہ ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حقیقت و صداقت سے میں ہی آشنا ہوں اور چونکہ تمام دنیا میری ہی طرح صداقت پرست ہونے والی ہے لہٰذا میری بتائی ہوئی صداقت کو ضرور تسلیم کیا جائے گا۔

مگر میں اپنے نظریہ کو اس طرح نہیں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مذہب اپنی ہر شکل میں ایک دھوکا ہے۔ ایک وہم ہے اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے پاس وہ ذرائع و اختیارات موجود ہیں جن کو مذاہب عالم نے ہم میں بڑھنے سے روکا ہے اور جب یہ تمام مظالم اور تمام دھوکے ختم ہو جائیں گے اور جب انسان کو اپنی صحیح طاقت کا اندازہ ہو جائے گا تو ایک ایسا نظام تیار ہوگا جو موجودہ نظام سے کہیں زیادہ خوش گوار اور دلکش ہوگا۔

میں یہ اس وجہ سے نہیں کہتا کہ میرا یہ عقیدہ مجھے اصل 'صداقت' یا حقیقت معلوم ہوتا ہے بلکہ میں یہ اس واسطے کہتا ہوں کہ دنیا اسی سمت جا رہی ہے آگے چل کر میں 'مذہب' کی داستان مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

تجربۂ سابق مذہب کی داستان کئی ہزار برس کی پرانی داستان ہے اور مذہب کی ابتداء تلاش کرنے کے لئے ہم کو عہد حجری سے

بھی قدیم ترزمانہ کی طرف نظر دوڑانی پڑتی ہے لیکن یہاں کسی مدت پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے ابتدائی دور ہی سے مذہبی خیالات میں تدریجی ارتقاء ہوتا رہا ہے۔ اس ارتقاء میں کوئی تحریک جذبات نہ شامل تھی بلکہ تفکر و واقعات کا ایک منطقی تسلسل تھا یا جیسا کہ اعتدال پسند مذہبی لوگ کہتے ہیں یہ ارتقا کسی غیبی قوت کی طرف سے کوئی الہام نہیں ہے اور اقوام عالم کی معیار عقل کے مطابق خدا نے اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں ظاہر کیا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب پہلے ایک مغفرت رساں خیال تھا اور رفتہ رفتہ وہ بدتر ہوتا گیا۔

اگر تمام نسل انسانی برابر رفتار سے چلتی تو آج ہم مذہب کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوتے مگر انسان نے اپنے تجربات صرف ۵-۶ ہزار برس پیشتر سے محفوظ رکھنا شروع کئے یہاں تک کہ فرضی داستانیں (LEGENDS) بھی بہت پرانی نہیں ہیں لیکن انسانوں کی یہ داستان ہر واقعے اتنا متاثر ہوئی ہے کہ نسل انسانی کے مختلف حصوں نے عام ارتقا میں ہر منزل پر ترقی نہیں کی۔ بہرحال آج ہم دو انسانی سلسلے (SERIES) شمار کرا سکتے ہیں ایک تو ان قبل تاریخ (PREHISTORIC) قوموں کا سلسلہ جو لاکھوں برس پہلے گزر رہی ہیں۔ دوسرے وحشیوں کا زمانہ یہ دونوں مدتیں تقریباً یکساں ہیں کیونکہ دونوں زمانہ قبل تاریخ (PREHISTORIC) میں گزری ہیں اور ان قوموں کے خیالات سے تفکر انسانی کے ارتقا کے گزشتہ منازل ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں اس کے بعد تہذیب قدیم کے مذہب کا پرانی عمارتوں سے پتہ چلتا ہے اور پھر ادبیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے بارے میں لوگوں کے کیا خیالات تھے۔ ادب سے گزشتہ تین ہزار برس قبل کے مذہبی ارتقاء کا حال معلوم ہوتا ہے جو مختلف مذہبی مرکزوں مثلاً چین۔ ہندوستان۔ ایران۔ یونان۔ روم اور مصر وغیرہ

میں عیسائیت کے قبل پایا جاتا تھا اور جو سبق اس سے ہم کو ملتا ہے وہ اس کے بالکل مطابق ہے جو اس وقت سے اس وقت تک ہوتا رہا اور اب بھی ہو رہا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہر قسم کی آب ہوا اور ہر قسم کی اقتصادی حالت میں مذہب کا ارتقا اتنا یکرنگ یکساں رہا ہے کہ خود ایک مذہبی آدمی اس کا مستقبل دیکھ سکتا ہے جن واقعات نے انسانی ترقی کو (ایسے ممالک میں جہاں ترقی کے وسائل تھے) روک دیا وہ لڑائیاں یا ایسی غلطیاں تھیں جو ہمیشہ تہذیب کو شاقی رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الحاد اسی زمانہ میں پھیلا جب تہذیب اپنے انتہائی عروج پر ہوئی اور جب تخریبی قوتوں نے علم کو مٹا دیا اور جہالت کا دور دورہ ہوا تو الحاد کا بھی خاتمہ ہو گیا یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب علم کی ترقی ہوتی ہے تو مذہب کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں اور جو تہذیب مٹنے لگتی ہے تو اس میں پھر قوت آجاتی ہے۔

مذہب اور فطرتِ انسانی

میری رائے میں مذہب کی ابتدا کا حال بالکل ایسا ہی جیسے پرانے زمانے کے وحشی کا تصور اپنے سایہ کے بارے میں میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی کتے کو عمر میں پہلی مرتبہ ژالہ باری سے سابقہ پڑے تو وہ بے انتہا حیرت زدہ ہو جاتا ہے یا اگر کوئی بلی پہلی مرتبہ کسی کچھوے کو رینگتے ہوئے دیکھتی ہے تو وہ بہت متعجب ہو جاتی ہے اسی طرح زمانہ قدیم کے انسان میں ممکن ہے ایسے ردِ عمل (REACTION) ہوتے ہوں مگر ان کا مذہب سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں ہوا جب تک وہ یہ خیال نہیں کرنے لگا کہ جو چیز ان کا باعث ہے وہ ایک غیبی طاقت ہے۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ انسان نے پہلے ایک مبہم طاقت کا تصور کیا اور پھر یہی چیز شخصی روحوں (SOULS) میں تبدیل ہو گئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روح کا سب سے پرانا نام "سایہ" (SHADOW) ہے اور جب ہم اپنے آپ کو ایک قدیم وحشی کی جگہ

دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سایہ کا حیرت انگیز وجود پر غور و فکر پہلی چیز تھی جس نے قدیم انسان کے دماغ میں تصوّر کی جھلک پیدا کی۔ اب سے سو برس قبل جب مشنریوں اور سیاحوں نے وحشیوں کے خیالات کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کے خیالات اخلاق پر مبنی نہیں ہیں اور بعض کے تو مذہبی خیالات بھی نہیں ہیں بعض "ہمزاد" یا "سایہ" پر یقین کرتے ہیں اور بعض انسان کے "دوسرے جیتے" پر جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے کامل اعتقاد رکھتے ہیں۔

○

دوسری منزل یا حیات بعد الموت کا خیال بھی تمام دنیا میں متوازی نظر آتا ہے، یعنی کہ مردوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور ان کی سرگرمیاں زیادہ بڑھ جاتی ہیں نیز یہ کہ ارواح بہت رنجیدہ اور خشک مزاج ہوتی ہیں گویا زندگی ترک کرنے سے ان کو تکلیف پہونچی ہے اس کا اظہار وہ خشونت سے کرتی ہیں یا یہ کہ چونکہ اب وہ کسی کو نظر نہیں آتیں اس لئے وہ ایسے کام کرنے لگتی ہیں جو پہلے گوشت و پوست کی زندگی میں راز کھل جانے کے ڈر سے نہ کر سکتی تھیں، بہرحال وجہ کچھ بھی ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب نے ایک وحشی کی زندگی کو کچھ عرصے کے بعد تکلیف دہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان ارواح کو تمام بیماریوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا اور چونکہ ہر آدمی کے مرنے کے بعد ایک خبیث روح بڑھتی ہے لہٰذا انسانی آبادیاں انھیں ارواح سے معمور نظر آنے لگیں۔ بعد کو وہ زمانہ آیا جب ان ارواح کے لئے خاص جگہیں (مثلاً آسمان یا زمین) میں مقرر کر دی گئیں ان میں سے بعض ایسی بھی سمجھی جانے لگیں جو آدمیوں کی مدد کرتی ہیں لیکن عام نظریہ یہی تھا کہ وہ عموماً شریر ہوتی ہیں۔

مذہبی مقدسین کا ظہور: مذہب کے اس ابتدائی دور میں زیادہ اظہار خیال کی

عالت میں گریز کرے گا جبکہ وہ عیسائی مذہب کو نہیں پسند کرتا۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرا کہہ سکتا ہے کہ اس کا خدا پر کوئی اعتقاد نہیں مگر پھر بھی ایک عالمگیر قوت کا دونوں کو احساس ہو سکتا ہے۔ ایک آدمی مختلف علوم کا ماہر ہو سکتا ہے مگر اس کا بھی امکان ہے کہ اس نے مذہب پر کبھی غور نہ کیا ہو۔

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ مذہب بحیثیت ایک مجموعۂ عقاید کے تعلیم یافتہ طبقے سے اپنا اثر زائل کرتا جا رہا ہے اور چونکہ آجکل تعلیم عام ہو چلی ہے۔ اس لئے یہ بھی صحیح ہے کہ گویا عوام پر سے اس کا اثر زائل ہو رہا ہے۔ یہ مسئلہ مذہب میں اصلاح کرنے کا نہیں ہے کیونکہ اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پیغمبروں پر حرف آتا ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصولی مذہب سے انکار کر کے صرف اخلاقیات کو مانا جائے کیونکہ اس نظریہ کو ایک قلیل اقلیت کے علاوہ اور کوئی نہ تسلیم کرے گا۔ اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب کا زوال یقینی ہے،

اسی کے ساتھ واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا پرستی کا زوال بھی لازمی ہے ہم دیکھ رہے ہیں کہ گذشتہ پچاس برس سے وحدانیت کس طرح اپنی جگہ پر قائم ہے اور الحاد کتنا پھیل رہا ہے لہٰذا اب جبکہ علم عام ہو رہا ہے مستقبل کا حال ظاہر ہے۔ خدا کے خیال کو خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ بنایا جائے مگر اب وہ باقی نہیں رہ سکتا

گذشتہ نصف صدی میں کئی مذاہب پیدا ہوئے اور ان کے معتقدین کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی گئی مگر پھر بھی ان کے پیروؤں کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ حالانکہ ۲ کروڑ آدمی ایسے ہو گئے ہیں جو مذہب سے بالکل بے پرواہ ہیں، در آنحالیکہ ہمارے نصاب تعلیم میں مذہب پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ بہرحال

مذہب کا خاتمہ اب کچھ مدت کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذرا صورت حال پر نظر ڈالیے کہ (مغربی عیسائی) ممالک میں مبلغین مذہب کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ ہے اور ان کے مقابلے میں بے دینی پھیلانے والے ۵۰۰ کے تناسب سے زیادہ نہیں اس پر طرہ یہ کہ مذہب کی طرف سے کروڑوں روپیہ بھی ہر سال خرچ ہوتا ہے کیا اس حالت پر غور کرنے کے بعد بھی مذہب کے مستقبل کے متعلق کوئی شک باقی رہ جاتا ہے تعلیم یافتہ ممالک میں تو مذہب تقریباً ختم ہو گیا ہے البتہ جاہل ملکوں میں اکثریت مذہب کی پابند ہے مگر وہ بھی اس وقت تک اسے مانتی رہے گی جب تک وہاں تعلیم عام نہیں ہوتی، بہرحال کچھ بھی ہو اس صدی کے آخر میں اگر کہیں مذہب قائم بھی رہا تو وہ انتہائی نفرت خیز چیز ہو گی۔

یاد رکھیے کہ مذہب کا خاتمہ وہ مبارک گھڑی ہو گی جب ہم مردہ انسانوں سے مدد مانگنے کے بجائے اپنی عقل سے امداد کے طالب ہوں گے اور ہم میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو جائے گی جو تمام زندگیوں سے لطیف تر، خوش گوار تر اور مرغوب تر ہو گی،

ملاحدۂ دورِ حاضر کے نقطۂ نظر سے!

(۴)

روایت و معجزہ کی حقیقت!

زندگی کا صحیح مقصود حصولِ مسرّت ہے اور ذہنِ انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب و شرائط معلوم کرے۔ واضح رہے کہ مسرت سے مراد میری صرف کھانا پینا نہیں محض جسمانی راحت و آسائش نہیں، بلکہ بلند قسم کی وہ مسرّت ہے جو ادائے فرائض کے بعد حاصل ہوتی ہے، جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے جو فطرت کے مطالعہ اور حسنِ مجرد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جو آزادیٔ ذہن و ضمیر کی پیداوار ہے۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرّت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے جو حرّیتِ فکر و رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جس نے عقلِ انسانی کو شل کر دینا ہی اپنی مقصودِ زندگی قرار دے رکھا ہے، یہ گروہ اپنے آپ کو اہلِ مذہب اور رُوحانیت پرست کہتا ہے۔ یہ گروہ وہ ہے جو احساساتِ مسرّت کو وسوسۂ شیطانی

کہتا ہے یہ اس دنیا کی زندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ہے ـــــ جس کا اصطلاحی نام اس نے "حیات بعد الموت" رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی تبلیغ و تہلیل کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ پیام ربانی کے لئے اس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت و حقیقت کا نام ہے صرف اس چیز کا جو اس کے دل و دماغ سے پیدا ہو۔

اس جماعت نے ہمیشہ عقل و علم سے دشمنی کی، ذہن انسانی کو اس نے ہمیشہ کند رکھنا چاہا اور اس لئے علم و یقین کا ماخذ ہمیشہ غیر فطری کرامات و معجزات کو قرار دیا ہے اس لئے دنیا میں صرف نفرت، تعصب اور خوف کی اشاعت کی۔ اس نے منکرین کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا اس نے محنت و عمل سے ہمیشہ جی چرایا اور اسی کو برگزیدہ قوم سمجھا جس کے لئے غیب سے من و سلویٰ نازل ہو سکتا ہے۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے جسے عقل انسانی کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اس میں تخلیق کائنات کا بھی ذکر ہے اور آفرینش انسان کا بھی۔ اس میں تاریخ قدیم کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی لیکن بایں ہمہ یہ محض روایت و داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں یا پھر ان ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعصب و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قائم کیا۔ انھوں نے ہمیشہ دنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شامل حال نہ ہوں تو بارش بند ہو جائے، کھیتیاں برباد ہو جائیں، دنیا قحط و وبا سے فنا ہو جائے اور جب کبھی کوئی مصیبت نوع انسانی پر نازل

ہوئی تو انھوں نے اس کو اپنی ہی بدُعاؤں کا نتیجہ بتایا۔ پھر انھوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ جب کبھی انھیں اقتدار حاصل ہوا۔ علم کو روندا گیا۔ عقل پامال کی گئی آزادی کو مٹایا گیا۔ مفکرین عالم کو قید میں ڈالا گیا۔ ارباب فضل وکمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر وہ سب کچھ کیا گیا جسے شیطان بھی گوارا نہ کر سکتا تھا۔

لیکن مذاہب کا ظہور، مذہبی کتابوں کی پیدائش، خانقاہوں کی تعمیر اور اہل خانقاہ کا وجود، کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ عہد وحشت کے غاروں سے لے کر موجودہ دور تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے دنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے نہ اس میں معجزہ وخرق عادات کو کوئی دخل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو ہر شے اور ہر حالت واقعات سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اگر ہمارے اسلاف کے دلوں میں مذہب وروحانیت کا خیال پیدا ہوا تو وہ بالکل فطری خیال تھا کیونکہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہونچ سکتی تھی اور وہ اس کو سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے۔

تمام زمانوں میں انسان نے اپنے اور اپنے ماحول کے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ دیکھتا تھا اور تعجب کرتا تھا کہ پانی کیوں برستا ہے۔ درختوں کا نشوونما کیوں ہوتا ہے بادل کیونکر معلق فضا میں اڑتے ہیں، ستاروں کی چمک کہاں سے آتی ہے۔ چاند سورج کو کون ادھر سے ادھر لے جاتا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی کے بعد موت کا سکون کیا۔ بیداری کے بعد نیند کیسی، روشنی کے ساتھ تاریکی کیا معنی۔ بجلی اور کڑک کو دیکھ کر وہ سہم جاتا تھا۔ زلزلوں اور پہاڑوں کی آتش فشانیاں دیکھ کر وہ لرزہ براندام ہو جاتا تھا اور چونکہ وہ ان کے طبعی حدوث کے اسباب سے ناواقف تھا

اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ ان تمام حوادث کے پیچھے کوئی عظیم الشان، ذی حیات ہستی ضرور ایسی موجود ہے جو ان تمام مناظر و مظاہر کی پیدا کرنے والی ہے اور انھیں کو وہ دیوتا یا دیوی سمجھ کر ان سے ڈرنے لگا اور ان کی پوجا کرنے لگا۔

طلوع صبح کو وہ سمجھنے لگا کہ یہ کوئی نہایت ہی حسین و جمیل دیوی ہے آفتاب کو اس نے ایک جنگجو عاشق مزاج دیوتا فرض کر لیا۔ رات کو اس نے سانپ یا ناگ سمجھ لیا اور ہوا کو مغنی، جاڑے کو اس نے ایک ایذا رساں درندے سے تعبیر کیا اور خزاں کو ایسی دیوی سے جو دنیا کے سب پھول چن کر لے جاتی ہے، الغرض اسی طرح کی سیکڑوں تعبیریں، ہزاروں تفسیریں، اس نے مناظر فطرت اور حوادث طبعی کی اپنی ذہانت سے پیدا کیں اور ان کو حقیقت جان کر پھیلانا شروع کیا۔ اقوام عالم کی روایات مذہبی یا "اساطیر الاولین" پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد بیشتر انھیں شاعرانہ تعبیروں اور اسی قسم کے قیاسات ضعیفہ پر قائم ہے چنانچہ باغ عدن کی روایت کو دیکھئے کہ وہ دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے کیونکہ جب وہ مصائب سے گھبرا اٹھی تو اپنی تسکین کے لئے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے،

اسی طرح طوفانوں کی روایت ایشیا و یورپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے انھوں نے گھونگھے، سیپیاں اور لہروں کے نشانات، پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوا چند مقبول بندوں کے کوئی جانبر نہ ہو سکا۔ توریت، انجیل اور کلام مجید کے علاوہ ہندوؤں میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ منو نے ایک بار گنگا میں کوئی ظرف ڈبو کر پانی لیا اس میں ایک مچھلی بھی آگئی۔ مچھلی نے التجا کی کہ مجھے پھر پانی میں چھوڑ دیجئے۔ منو

نے رحم کھا کر اسے چھوڑ دیا لیکن مچھلی نے اس احسان کے عوض میں ان کو بتایا کہ ایک بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے۔ آپ ایک کشتی بنا کر اس میں اپنے ساتھیوں کو مع مویشیوں کے بٹھا لیجئے۔ میں بر وقت پہونچ کر آپ کی مدد کروں گی، چنانچہ منو نے اس کی تعمیل کی اور جب طوفان آیا تو مچھلی حاضر ہوئی لیکن اب وہ بڑی مچھلی ہو گئی تھی جس کے سر پر ایک سینگ بھی نکلا ہوا تھا۔ منو نے ایک رسی اس کے سینگ سے باندھ کر کشتی میں اٹکا دی اور وہ طوفان سے کشتی کو بچا کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئی اور طوفان کے ختم ہونے تک منو جی یہیں ٹھہرے رہے۔ ان تمام روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اس کے کتنے اندیشے، کتنی امیدیں، کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آنسو شامل تھے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا اولین مذہب "آفتاب پرستی" تھا اور یہ بالکل فطری بات تھی کیونکہ روشنی ہی زندگی ہے اور اسی سے زندگی میں حرارت قائم رہتی ہے اپالو بھی سورج تھا جو رات کے ناگ کو شکست دے کر بھگا دیتا تھا۔ اگنی بھی سورج تھا جو انسان کے ہر ہر جھونپڑے کی حفاظت کرتا تھا۔ کرشن بھی سورج ہی تھے کہ ان کی ولادت کے وقت تمام درخت ہرے بھرے ہو گئے۔ ہرقلس بھی سورج دیوتا تھا، جوتا دیونس، بھی وہی تھا اور یہ سب کے سب ۲۵ر دسمبر کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا۔ سب غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے اب مسیح کے حالات کا ان روایات سے موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی سب کچھ یہی ہے، ۲۵ر دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوئے، ہیروڈ نے بہت سے بچوں کو ان کے دھوکے میں ہلاک کیا۔ چالیس[1] دن

---

[1] چالیس کا عدد مذاہب عالم کی تاریخ میں بہت نظر آتا ہے۔ طوفان سے پہلے چالیس دن بارش ہوتی رہی۔ موسیٰ چالیس دن کوہ سینا پر رہے۔ چالیس سال تک بنی اسرائیل صحراؤں میں پھرتے رہے!

کا روزہ رکھا غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔ عیسیٰ بھی سورج دیوتا تھے اور یقیناً تمام مذاہب کی ابتدا آفتاب پرستی ہی سے ہوئی چنانچہ اس وقت بھی عبادت کے وقت لوگوں کا آنکھیں بند کر لینا اسی زمانہ کی یادگار ہے کیونکہ وہ سورج کو نہ دیکھ سکتے تھے اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں،

اس کے علاوہ جب ہم امم سابقہ کی دیگر مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مذاہب میں کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی۔ ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہد قدیم کے مذاہب ہی سے جا کر مل جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ کی رسم پائی جاتی ہے لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے، ہندوؤں، مصریوں، یونانیوں اور رومیوں میں بھی مقدس پانی کا وجود پایا جاتا تھا۔ صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے، یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی، زندگی کی، آگ کی۔ قبر انسانی کی، اٹلی کی قدیم آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قائم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں۔ بابل کی سرزمین سے جو سکے یا ٹھپے دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے، اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے۔ اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا۔

ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے۔ اساطیر نام ہے کسی بات کی خیالی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑ کر بیان کرنے کو۔

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مردے زندہ ہو گئے تھے وہ غالباً کہے گا ہاں ہوا ہوگا۔ اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مردے زندہ ہو جائیں گے

تو وہ کہے گا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے، لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ کیا تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مردے کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمہیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا۔

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ خدا نے یہودیوں کے لئے جتنے معجزات سے کام لیا وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی سے آزاد کرانا بھی معجزہ ہی کے ذریعے سے ہوا۔ جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آگے رہنمائی کے لئے ہوتا تھا۔ دریائے نیل ان کے لئے شق کیا گیا من وسلویٰ ان کے لئے آسمان سے نازل کیا گیا۔ لیکن یہودیوں نے ان میں سے کسی معجزہ کی پروا نہیں کی اور جب تک بچھڑا بنا کر پوج نہیں لیا انھیں چین نہ آیا۔

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کئے لیکن بالکل بے نتیجہ۔ وہی مردے جن کو انھوں نے زندہ کیا۔ وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑھی جنھیں اچھا کیا ان پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا۔ صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔

پانی کو شراب بنا دینا۔ سینکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا۔ طوفان کو خاموش کر دینا۔ پانی پر چلنا یہ سب باتیں ہیں جنھیں انسان سوچتا تھا، جن کے پورا ہونے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انھیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت و تقدس کے لئے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جہل وخوف سے معمور تھی اور اپنی ہر مشکل میں مافوق الفطرت ہستی سے امداد کی توقع رکھتی تھی چنانچہ انھوں نے ان مفروضہ غیر انسانی ہستیوں کو

خوش کرنے کے لئے مندر بنائے، قربان گاہیں تیار کیں۔ اُن کے سامنے ناک رگڑی قربانیاں چڑھائیں اور وہ سب کچھ کیا جس سے وہ خود خوش ہو سکتے تھے لیکن ان آسمانی قوتوں نے ایک نہ سُنی۔ ان میں سے کوئی انسان کی فریاد کو نہ پہونچا۔ طوفان بھی آئے، کھیتیاں بھی برباد ہوئیں، وبائیں بھی پھیلیں، جن کو بُرے حال جینا تھا وہ بُرے حال ہی جئے اور جنھیں مرنا تھا وہ مر ہی گئے،

انسان یہ سمجھتا تھا اور اب بھی مذہبی انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اسی کے لئے ہے۔ اسی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کائنات وجود میں آئی چنانچہ وہ ہر چیز پر قابض ہونا چاہتا تھا اور جب ناکام رہتا تھا تو سمجھتا تھا کہ خدا ضرور اس کی مدد کرے گا حالانکہ اگر دنیا میں ایک انسان نہ ہوتا تو بھی سورج کا یہی طلوع و غروب ہوتا۔ یہی بہار و خزاں ہوتی، گلاب اسی طرح کھلتا۔ انگور کی بیلیں اسی طرح پھل لاتیں۔ وہی سمندر کا مد و جزر ہوتا اور وہی رات دن، وہی طوفانی ہوائیں ہوتیں اور وہی رعد و برق،

جب ایک زمانہ، ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل و بے بصری کی حالت میں گذر گیا تو کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے ان روایات و معجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے غور کیا کہ کسوف و خسوف کیوں مقررہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخر کار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کر کے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گردش اولاد آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہر طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے۔

گلیلیو، کوپرنکس اور کیپلر نے مذہب کی بتائی ہوئی ہئیت کو درہم برہم کر دیا،

زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول اور ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہوگئی۔ آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلاء محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا۔

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا وہ تاریکی جو زمانۂ معلوم سے دماغوں پر مسلط تھی یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی۔ آخر کار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قائم کیا۔ اور مذہب کے درندہ نے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگین رہے ہیں۔ برونو (BRUNO) کے خلاف اپنا پنجہ بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کرہ کے علاوہ اور کرّوں کا بھی قائل تھا،

اسے کافر و ملحد قرار دے کر سات سال کے لئے قید کر لیا گیا کہ اگر وہ اپنے الحاد سے باز آجائے تو رہا کیا جا سکتا ہے لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیونکر ممکن ہے اور آخر کار پابہ زنجیر اسے قصاص گاہ میں لے گئے اور بہت سی لکڑیاں جمع کر کے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا الغرض مذہب نے عقل و علم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن جہل کے پاؤں جب ایک بار اکھڑ جاتے ہیں تو مشکل سے جمتے ہیں۔ عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی۔

جانبازان علم اٹھے اور انھوں نے سمندروں، پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے دے کر وہ وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں انھوں نے بخار و برق کی قوت دریافت کر کے انسان کو دیوتا بنا دیا۔ لیکن اہلِ مذہب بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے۔ مذہب والے مفروضہ معجزے بیان

ہی کرتے رہے اور انہوں نے انھیں پورا کر کے دکھا دیا یعنی انسان کی جن لغتوں کو دیوتا پورا نہ کر سکے تھے علم و عقل نے پورا کر دیا۔

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی چیز ہے نہ فنا کوئی چیز، ایک لامحدود ہستی کا وجود، ایک لامحدود استحالۂ عقلی ہے، کائنات کے تمام مظاہر وآثار اسباب و نتیجے سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا۔

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا۔ لیکن کوئی آسمانی مددلے نہ پہنچی خدا کا رحم حاصل کرنے کے لئے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں، لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا۔ برہنہ وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا، سانپوں نے ڈسا، طوفانوں نے ڈبویا۔ زلزلوں نے تباہ کیا لیکن خدا نے اپنا اصول کار نہ بدلا، انسان نے لاکھوں مندر بنائے رات دن اس کی پوجا کی لیکن ظالموں کا ظلم بدستور قائم رہا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوڑے پڑا کرتے تھے بدستور پڑتے رہے یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا اور اس کے نزدیک گھاس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں اس لئے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور رہبری عقل پر ہے آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گذر گیا، روایات مذہبی کا دور ختم ہو گیا۔ اور اب انسان اس کے لئے تیار نہیں کہ وہ مذہب کے بتائے ہوئے اصول نجات پر یقین رکھ کر اپنی دنیا کو تباہ کرے اور بے وقوف کہلائے۔

روح :- "برونو"

مسیح :- "کیا تو مسیحی تھا"

برونو :- "کچھ عرصہ تک مسیحی رہا لیکن اس کے بعد میں نے خود اپنی عقل سے سچائی کی تلاش شروع کی"

مسیح :- "کیا تو نے لوگوں میں تبلیغ کی؟"

برونو :- "کی، لیکن مسیحیت کی نہیں، آزادیٔ فکر و ضمیر کی، اچھا کام کرنے کی بغیر "طمعِ ثواب" اور بُرے کام سے بچنے کی بلا "خوفِ عذاب" میں نے لوگوں کو بتایا کہ انسانیت نام ہے صرف بھلائی کا، ہمدردی کا اور دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا"

مسیح :- "یہ تو گویا تو نے انجیل کو جھٹلایا اور معجزات سے انکار کیا جا، اسفل سافلین میں تیرا ٹھکانہ ہے اور وہیں تجھے ابد الآباد تک دوزخ میں جلنا ہے"

●

کیا خدا اور مسیح کے اس فیصلے کو دنیا اب بھی قرین انصاف سمجھ سکتی ہے؟

اور کیا مذہب کا دور معجزہ و کرامات اب پھر واپس آ سکتا ہے؟"

ملاحدہ دورِ حاضر کے نقطہ نظر سے!

(۵)

مذاہبِ عالم کی تاریکیاں

ترقی کرنا انسان کا فطری حق ہے لیکن ترقی کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس باب میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں کیونکہ وہی ایک حالت ہے جس کو ایک جماعت ترقی تہذیب سے تعبیر کرتی ہے اور دوسری وحشت و جہل سے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ ہر وہ چیز جو قدیم ہے، پرانی ہے، قابلِ احترام ہے گویا جب تک کسی چیز کے چاٹنے سے صدیوں کی جمی ہوئی خاک نہ اڑے قابلِ اعتناء نہیں ان کے نزدیک حکومتیں وہی تھیں جو ختم ہو گئیں۔ فرمانروا وہی تھے جو گذر گئے۔ مصلح وہی تھے جو مر گئے۔ نہ ویسے شاعر اب پیدا ہوتے ہیں نہ ویسے ادیب نہ ویسے سیاست داں اب نظر آتے ہیں، نہ ویسے حکماء و فلاسفہ۔

دوسرا گروہ قدیم و قدامت کا دشمن ہے اور موجودہ زمانہ کا مداح، ان کے

نزدیک زمانۂ قدیم میں کوئی بات معقول تھی ہی نہیں اور قدرت نے اپنے تمام برکات زمانہ حال ہی کے لئے وقف کر دئے ہیں۔ میری رائے میں دونوں غلطی پر ہیں نہ قدیم زمانہ کی ہر چیز بری تھی نہ زمانۂ حال کی ہر بات اچھی، صداقت ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور اسے ہم قدیم و جدید نہیں کہہ سکتے۔ وہ ہر زمانہ میں یکساں رہی اور ہمیشہ اس کی جستجو کرنا چاہیئے۔

اگر ہم اصولاً اس بات کو تسلیم کر لیں کہ فکر و عمل ہی ملک کی ترقی و مسرت کی بنیاد ہے اور یہ عمومی مسرت ہی فی الحقیقت فطری صداقت ہے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا کے "فکر و عمل کو بالکل آزاد ہونا چاہیئے آپ اس عہد قدیم کو نہ دیکھئے جب ایشیا ترتیب تاریخ سے پہلے بھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا بلکہ عہد وسطیٰ کو لیجئے اور غور کیجئے کہ اس وقت یورپ کی (جو اس وقت سب سے بڑا مدعی تہذیب و آزادی ہے) کیا حالت تھی، طبقۂ عمال کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ جہل کی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور فکر انسانی نام تھا صرف اوہام پرستی کا، فضا میں ہر طرف ملائکہ و عفاریت چھائے بیٹھے تھے اور ہر سمجھ میں نہ آنے والی بات معجزۂ خداوندی قرار دی جاتی تھی۔ اعتقادات نے عقل انسانی کو بیکار کر رکھا تھا اور مذہب نے غور و فکر کو انسان کے لئے وجہ امتیاز صرف یہ تھا کہ یا تو وہ سپاہی ہو یا پادری، یعنی سوائے لڑنے اور جبر سے بیگار لینے کے اور کوئی صورت انسانیت کی موجود نہ تھی صنعت و حرفت کو ذلیل سمجھا جاتا تھا اور اس ذریعے ایک شخص بھی اپنا پیٹ آسانی سے نہ بھر سکتا تھا۔ قومیں خرید و فروخت کے ذریعے ضروریات زندگی حاصل نہ کرتی تھیں بلکہ لوٹ مار سے اور ہر مسیحی ملک غیر مسیحی قوم کے مال کو لوٹ لینا ثواب جانتا تھا

لکھنا پڑھنا نہایت خطرناک بات سمجھی جاتی تھی اور اگر کوئی شخص بدقسمتی سے سیکھ لیتا تھا تو اسے ساحر یا کافر سمجھا جاتا تھا اس وقت تقریباً بالکل ناممکن ہے کہ ہم اس زمانہ کی جہالت واہمہ پرستی اور کور دماغی کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اُس وقت انسان کے جسم و دماغ دونوں مقید تھے۔ ایک کے لئے لوہے کی زنجیریں تھیں اور دوسرے کے لئے وہم پرستی کی اور اس غلامی سے آزاد ہونے کی صورت سوا موت کے اور کوئی نہ تھی۔

پندرھویں صدی میں انگلستان کا قانون یہ تھا کہ اگر کوئی شخص انجیل مقدس کا مطالعہ اپنی مادری زبان میں کرے گا تو اس کی جائداد اور اس کے مویشی ہمیشہ کے لئے ضبط ہو جائیں گے اور وہ حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ اس قانون کے نفاذ کے بعد ایک دن ۳۹ آدمی پھانسی پر لٹکائے گئے اور ان کی لاشیں سربازار جلائی گئیں پھر یہ جہل صرف انگلستان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ یورپ کے ہر حصہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ سولہویں صدی میں فرانس کی حکومت نے ایک شخص کو اس خطا پر آگ میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالا کہ وہ راہبوں کے ایک جلوس کے سامنے دوزانو نہ ہوا تھا۔ اب آیئے اس اجمال کی ذرا تفصیل بھی سن لیجئے:-

عہد وسطیٰ کے تمام انسان جاہل و عالم، آقا و غلام، پادری و غیر پادری سب کے سب جادو ٹونا اور ٹوٹکے کے قائل تھے، انھیں یقین تھا کہ شیطان نہ صرف انسان بلکہ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے اندر بھی حلول کر جاتا ہے اور چونکہ شیطان کا مقابلہ ایک مقدس فریضہ تھا۔ اس لئے کسی ایسے شخص کو جس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ وہ شیطان کا ہمراز و ندیم ہے۔ مار ڈالنا یا زندہ جلا دینا بہت معمولی بات تھی جس حد تک حقیقت یا واقعیت کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ مہمل عقیدہ اور کوئی

نہیں ہوسکتا کہ کسی انسان کے اندر شیطان حلول کر جائے اور وہ اسے نجس و ناپاک افعال پر مجبور کرے لیکن اس عقیدہ کی مذہبی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ رگ جو اس جرم میں گرفتار کئے جاتے تھے جن کے خلاف عدالت گاہوں میں مقدمے چلائے جاتے تھے اور جن سے دنیا نفرت کرتی تھی خود بھی یقین رکھتے تھے کہ واقعی ان پر شیطان سوار ہے اور وہ اس کا اعتراف کر لیتے تھے۔

جیمس اوّل کے زمانہ میں ایک شخص اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا اس جرم میں جلایا گیا کہ وہ شاہی خاندان کو ڈبو دینے کے لئے سمندر میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔

ایک بار سر میتھو ہیل کے سامنے جو انگلستان کا مشہور قانون داں جج تھا، ایک عورت پیش کی گئی کہ یہ بچوں سے سوئیوں کی قے کراتی ہے اور شیطان سے ساز باز رکھتی ہے چنانچہ جج صاحب نے اس کو مجرم قرار دے کر زندہ جلوا دیا اور فیصلہ میں لکھا کہ یہ جادوگرنی ہے اور جادو کا از روئے مذہب حق ہونا ثابت ہے۔ عام عقیدہ ایک یہ بھی تھا کہ بعض آسیب زدہ انسان بھیڑیے کی شکل اختیار کر سکتے ہیں ایکمرتبہ کسی شخص پر بھیڑیے نے حملہ کر دیا اس نے مقابلہ کر کے اس کا ایک پنجہ کاٹ لیا اور جیب میں رکھ کر گھر پہونچا دیکھا کہ اس کی بیوی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے اور اس کے خون نکل رہا ہے اس سے یہ یقین کیا گیا کہ اس کی بیوی بھیڑیا بن کر گئی تھی، چنانچہ اس نے اقرار کیا اور جلا دی گئی۔

اس طرح لوگوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ وہ گرمیوں میں پالا گراتے ہیں اولے برسا کر فصلیں تباہ کرتے ہیں بشرابیں ترش کر دیتے ہیں اور گایوں کو بانجھ بنا دیتے ہیں، اس زمانہ میں کسی کی زندگی محفوظ نہ تھی۔ کسی کا اپنے دشمن کے متعلق یہ کہہ دینا

کو ساحر ہے کافی تھا اور اس الزام کی تحقیق کوئی نہ کرتا تھا پھر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہ الزام صرف انسانوں ہی پر عائد نہ کیا جاتا تھا بلکہ جانور بھی اس سے محفوظ نہ تھے ۱۴۷۴ء میں ایک مرغ پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ اس نے انڈا دیا ہے اور چونکہ مرغ عام طور پر انڈا نہیں دیتا اس لئے یقیناً اس میں شیطان حلول کر گیا ہے چنانچہ یہ مرغ مع انڈے کے عدالت گاہ میں پیش کیا گیا اور اس کو سرِ راہ جلا دیئے جانے کا حکم صادر ہوا اسی طرح ایک سؤر پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ اس نے آدمی کو مار کر کھا لیا ہے اور اسے بھی جلا دیا گیا ۱۹۰۶ء میں ایک کتے پر بھی آسیب زدہ ہونے کا الزام قائم کر کے اسے سزا دی گئی جانوروں کو بطور شاہد کے طلب کرنا بھی اس وقت کا دستور تھا۔

ایک وقت میں یورپ کا قانون تھا کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی شخص رات کو داخل ہوا اور وہ اسے قزاق سمجھ کر مار ڈالے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس سلسلہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے کوئی شخص کسی بہانہ سے کسی کو بلا کر مار ڈالے اور اس طرح سزا سے بچ جائے۔ اس بناء پر قانون میں ترمیم کی گئی کہ مالک مکان اس وقت تک بے گناہ نہیں سمجھا جائے گا جب تک وہ گھر کے کتے، بلی یا دوسرے جانور کو پیش نہ کرے جس کے سامنے اس نے مارا ہے پھر یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی ایسا واقعہ پیش آ جاتا تھا تو گھر والے کوئی پلا ہوا جانور پیش کر کے اس کے سامنے اپنی بے گناہی کی قسم کھانا پڑتی تھی عقیدہ تھا کہ اگر وہ جھوٹ بولے گا تو ضرور کسی نہ کسی طرح جانور اس کا اظہار کر دیگا۔

یہ بھی انگلستان کا قانون تھا کہ اگر کوئی شخص جرم کرے تو وہ اس متبرک پارۂ نان وپنیر سے اپیل کرے جو اس مقصد کے لئے الگ کر دیا جاتا تھا یعنی مجرم اس روٹی کے ٹکڑے کو لے کر کہتا تھا کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے میرے حلق میں پھنس جائے۔

پانی اور آگ کے ذریعہ سے بھی گناہ و بے گناہی کی جانچ ہوتی تھی یعنی مجرم آگ میں تپایا ہوا سرخ لوہا ہاتھ میں لیتا تھا اور عقیدہ یہ تھا کہ اگر وہ گناہگار نہیں ہے تو اس کو کوئی ضرر نہ پہونچے گا (ہندوستان کے بھی بعض سید خاندان مدعی ہیں کہ آگ ان پر اثر نہیں کر سکتی کیونکہ وہ معصوم ہیں، یہ جاہلانہ عقیدہ بھی اسی نوع کی مذہبی تاریکی کا نتیجہ ہو) اسی طرح مجرم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں ڈال دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو ڈوبے گا نہیں؛

ان مثالوں کے دینے سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان قوموں میں جو مذہب کی جاہلانہ گرفت میں مبتلا تھیں یا ہیں کیا کیا بدتمیزیاں پائی جاتی ہیں اور عقل انسانی کا خون کرنے میں معتقدات مذہبی نے کتنا حصہ لیا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی اس لعنت میں صرف جاہل انسان ہی مبتلا نہ تھا بلکہ پڑھے لکھے، ذی فہم و ذی ہوش افراد بھی مبتلا نظر آتے تھے،

کیپلر دنیا کے مشہور بڑے آدمیوں میں سے تھا اور ہیئت دانی میں تو اس کا نظیر نہ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس احمقانہ عقیدہ میں بھی مبتلا تھا کہ ستاروں کو دیکھ کر ایک شخص کے مستقبل کا حال معلوم ہو سکتا ہے یہ عقیدہ اس کے دل میں مذہبی بنیاد رکھتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ ایسے ہی ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی۔ ٹیکو براہی بڑا زبردست ہیئت داں تھا یہ بہت سے مہمل الفاظ ایک جگہ لکھ کر پیشین گوئیاں کیا کرتا تھا اور ان کے پورا ہونے کا منتظر رہتا تھا۔

لوتھر کو یقین تھا کہ اس کی ملاقات شیطان سے ہوئی تھی اور بعض مذہبی مسائل پر اس سے مباحثہ بھی ہوا تھا۔ چارلس پنجم شہنشاہ جرمنی کے زمانہ میں اسٹوفلر بڑا

مشہور ہیئت داں گذرا ہے اس نے ایک بار ستاروں کو دیکھ کر حکم لگایا کہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے اور اس کا اتنا یقین ہو گیا کہ ہزاروں آدمیوں نے جو نشیبی علاقۂ زمین میں رہتے تھے ترک وطن کر دیا اور خانماں برباد ہو گئے۔ فرانس میں تو لوگوں نے دوسری کشتیٔ نوح تیار کر لی اور ذخائر سے اسے بھر دیا تاکہ طوفان میں کام آسکے لیکن طوفان نہ آنا تھا نہ آیا۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن انسانی کس درجہ غلامی میں مبتلا تھا، اور مذہب کا مفہوم سوائے شیطان کی پرستش کے اور کچھ نہ تھا۔

———— الغرض ان کی مذہبی روایات اسی طرح کی لغو باتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انسانی معلومات کا ذریعہ صرف مذہبی ادارے تھے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ ادارے تھے وہ قصداً جھوٹ بولتے تھے۔ اور ارادتاً خلاف عقل باتیں گھڑ لیتے تھے تاکہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں اور وہ اس کے جواب میں معجزات و کرامات وغیرہ بیان کر کے عوام کو مرعوب کر لیں اور اپنا اقتدار جمائیں،

پھر جہل و ظلمت کا یہ اثر کسی ایک شعبہ تک محدود نہ تھا بلکہ تمام انسانی معلومات پر چھایا ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ زبان ہی کے مسئلہ کو لیجئے تو عجیب و غریب حقائق کا انکشاف ہو گا اول اول عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ عبرانی ہی اصل زبان ہے اور تمام زبانیں اسی سے نکلی ہیں (عربی کو بھی ام الالسنہ اسی لئے کہتے ہیں) بعد کو یہی دعویٰ اور زبانوں نے بھی کیا اینڈرے کمپ نے ۱۵۶۱ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا مقصود یہ بتانا تھا کہ بہشت کی زبان کیا ہے چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ خدا نے آدم سے سویڈن کی زبان میں باتیں کیں۔ آدم نے ڈنمارک کی زبان میں جواب دیا اور سانپ نے حوا سے فرانسیسی

میں باتیں کیں۔

ایزو نے اپنی کتاب میں جو ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی تھی، ظاہر کیا ہے کہ جنت عدن میں بسکانی زبان (شمالی ہسپانیہ کی) بولی جاتی ہے۔ ۱۸۵۰ء میں گروپیس نے ایک کتاب لکھی کہ یہ سب غلط ہے، بہشت میں توڈچ زبان بولی جاتی ہے۔

اب جغرافیہ کو لیجئے کہ اس میں کیا کیا گل کھلائے گئے، چھٹی صدی میں ایک راہب نے جس کا نام کاسماس تھا ایک کتاب ہئیت وجغرافیہ کی ملی جلی لکھی اور ظاہر کیا کہ بائبل میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہی بالکل صحیح ہے یعنی دنیا مشتمل تھی ایک مسطح قطعۂ زمین اور اس کے بعد دائرہ دار ٹکڑوں پر یہ قطعۂ زمین چاروں طرف پانی سے بھرا ہوا تھا جسے سمندر کہتے ہیں اور پانی کے اس حصے سے آگے ایک اور حلقہ خشکی کا تھا اور طوفان سے قبل یہیں انسانی آبادی پائی جاتی تھی۔ یہیں ایک بلند پہاڑ تھا جس کے گرد سورج چاند طواف کرتے تھے۔ اور جب سورج اس پہاڑ کے پیچھے چلا جاتا تھا تو رات ہو جاتی تھی اور سامنے آجاتا تھا تو دن ہو جاتا تھا۔ اس راہب نے یہ بھی بتلایا کہ بیرونی دائرۂ خشکی کے کنارے سے آسمان بندھا ہوا تھا اور وہ کسی ٹھوس چیز کا بنا ہوا تھا اور زمین کو ایک کڑھائی کی طرح ڈھکے ہوئے تھا۔

ان بیانات کے ساتھ ہی اس کا بھی اہتمام تھا کہ بائبل میں کائنات کے متعلق جو لکھا ہے اس کے خلاف کوئی شخص کچھ نہ کہے نہ سمجھے ورنہ وہ کافر بے دین قرار دیا جائے گا۔

علم کے خلاف مذہب کی اس جنگ کا یہ حال تھا کہ لکھنا پڑھنا ممنوع تھا اور جو کوئی ایسا کرتا تھا اسے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اگر کسی کے منہ سے

نکل گیا کہ زمین ایک کرہ ہے تو اسے پکڑ کر جلا دیا گیا۔ اگر کسی نے دعویٰ کیا کہ آفتاب نظام شمسی کا مرکز ہے تو اسے جلا وطن کر دیا گیا۔ ایک عورت کو صرف اس لئے سولی پر چڑھا دیا کہ وہ بخار کی تکلیف کو گا گا کر کم کر رہی تھی۔

مگر چونکہ یہ عقیدہ عام تھا کہ انسان اپنی روح کا مالک نہیں ہے اس لئے ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی مرتسم ہو گیا کہ وہ اپنے جسم کا بھی مالک نہیں ہے اور اس طرح غلامی کی بنیاد قائم ہوئی پھر جنھوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے ان سے مخفی نہیں کہ یونان و روما، فرانس و جرمنی وغیرہ میں غلامی کے کتنے وسیع و مہیب ادارے قائم تھے اور انسانوں کو جانور بنانے میں انھوں نے کتنا بڑا حصہ لیا۔

الغرض مذہب کے تاریک دور میں انسان کا جسم و ذہن دونوں انتہائی ذلیل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور انسانیت کا مستقبل سخت تاریکی میں مبتلا تھا، لیکن چونکہ حقیقت و صداقت کو عرصہ تک دبایا نہیں جا سکتا اور فراست انسانی وہ چنگاری نہیں جو کسی نہ کسی وقت بھڑک نہ اٹھے۔ اس لئے رفتہ رفتہ ایک زمانہ آیا کہ علم کی روشنی پھیلی۔ مذہب نے اس کے لئے جگہ چھوڑی اور اس طرح انسانیت جو ہزاروں سال سے وحشت و درندگی کے بوجھ کے نیچے پڑی کراہ رہی تھی، آزاد ہوئی۔

پرانے جغرافیے بدلے، تاریخ بدلی۔ معتقدات بدلے اور آخر کار انسان مذہب کی گرفت سے چھٹ کر آزاد ہو گیا۔ علم و فن کسی کی ملکیت نہ رہا۔ سوچنے سمجھنے کا ہر شخص کو مجاز ہو گیا۔ غور و تدبر ہر شخص کا فطری حق قرار پایا۔ اختراعات و ایجادات کا دروازہ کھل گیا۔ آزادی فکر و رائے کے لئے کوئی مانع حائل نہ رہا اور انسان کو

اس طرح سب سے پہلے ترکِ مذہب ہی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔

ترقی کا مفہوم کیا ہے اس سوال کا مطالعہ آپ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی کیجئے اور مذہب سے علیحدہ ہو کر بھی آپ کو بالکل دو مختلف جواب ملیں گے مذہب کے نزدیک ترقی کا مفہوم اس دنیا سے تعلق رکھتا ہے جہاں دنیاوی افعال و اعمال کے نتائج سے واسطہ پڑے گا اور عمل کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے پھر کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ جس عالم کے کردار سے مذہب نے جزا و سزا کو متعلق بتایا ہے، اسی کو اندھوں کی طرح بسر کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

اب ذرا مذہب کی پابندیوں سے ہٹ کر انسانیت کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی وسعت ہے، جدوجہد کا کتنا پھیلاؤ ہے اور اس کے مقاصد کتنے بلند ہیں، سب سے بڑی چیز جس پر انسان فخر کر سکتا ہے وسعتِ نظر ہے اور اس کا پتہ صرف عالمِ اخلاق میں چل سکتا ہے پھر دیکھئے کہ اخلاقی حیثیت کس کی زیادہ بلند ہے۔ ایک مذہب کا پابند، خواہ وہ کتنا ہی بلند نظریہ اخلاق کا رکھتا ہو دوسرے مذہب والے کو تحقیر و استخفاف کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہے، یہ خیال کہ صرف میں راہ راست پر ہوں اور دوسرا گمراہ ہے۔ قدرتاً ایک شخص کے جذبۂ تفوق پیدا کر کے دوسرے کو حقیر و ذلیل ٹھہرائے گا اور یہی وہ ایک جذبہ تھا جو ہمیشہ دنیا میں فساد و خونریزی کا باعث ہوا۔

یوں تو مذہب نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں امن و

سکون پھیلانے آیا ہے لیکن عمل سے وہ اس دعویٰ کو کبھی صحیح ثابت نہ کر سکا اور اس لئے اگر واقعی ترقی کی راہوں پر غور کرنا ہے تو مذہب سے علیحدہ ہو کر غور کرنا چاہیئے اور انسانیت کے کلی مفہوم کو سامنے رکھ کر شاہراہ عمل متعین کرنا چاہیئے

○

مذاہب کی اہمہ پرستیاں!

کل ایک بزرگ تشریف لائے دعجیب وغریب بحث چھڑی ان کا ذہن جن خیالات سے متاثر تھا ان کا خلاصہ یہ تھا کہ: کہنے والے کہتے ہیں خدا مستجاب الدعوات ہے لوگوں کی دعائیں سنتاہے' غریبوں کی فریاد کو پہونچتا ہے۔ اس نے آدم کی گریۂ وزاری کو سنا اور کھوئی ہوئی جنت کے عوض اس سے بہتر فردوس کا وعدہ کرکے ان کے آنسو پونچھے یعقوب کی سرشک آلود آنکھوں کو دیکھا اور ان کے یوسف گم گشتہ کو پھر ان کی آغوش تک پہونچا دیا وہی تھا جس نے نوح کو طوفان سے زندہ سلامت نکالا۔ آتش نمرود کو ابراہیم کے لئے اک گلزار بنا دیا۔ یونس کو بطن ماہی کے اندر فنا ہونے نہ دیا۔ موسیٰ کی حمایت میں فرعون کو غرق کیا۔ مسیح کو دوبارہ زندہ کرکے اپنے پہلو میں جگہ دی اور محمد کو ان کی دعائے نیم شبی کے عوض کونین اٹھا کر دے دئے لیکن جس وقت ہم خود اپنے ذاتی احساس و تجربہ کی دنیا میں اس عقیدہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ "روایتی خدا" واقعی ہے بھی یا نہیں

اور اگر ہے تو اس کی حقیقت و نوعیت کیا ہے؟

آج انسانیت جس دور اضطراب سے گزر رہی ہے اس نے نوحؑ کے طوفان کو بھلا دیا۔ آتش نمرود اس کے سامنے ایک چنگاری کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ بنی اسرائیل پر جو مظالم روا رکھے گئے ان سے زیادہ ظلم اب دنیا پر ہو رہا ہے۔ محمدؐ کے زمانہ میں جس بت پرستی نے اخلاق انسانی کا خون کر رکھا تھا اس سے زیادہ صداقت سوز صورتیں اس وقت پیدا ہیں غریبوں کی فریاد مظلوموں کی کراہ اگر پہلے ہزاروں تک محدود تھی تو اب کروروں تک پہنچ گئی ہے۔ پہلے آگ جسم سے شروع ہوتی تھی اور وہیں ختم ہو جاتی تھی اب یہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں اور جسم و جان دونوں کو پھونکے ڈالتے ہیں لیکن نہ خدائی قہر و غضب میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کا دریائے رحمت جوش میں آتا ہے" یہ سن کر میں نے جو جواب دیا وہ زیادہ تر نکاہی حیثیت رکھتا تھا لیکن ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کیا یہ ذہنی گمراہی ہماری مذہبی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے اور کیا دروں میں ایسے شکوک پیدا ہونے کی ذمہ داری مذہب پر نہیں ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود ہی ایک مفروضہ اپنے ذہن سے پیدا کرتا ہے۔ اور جب تجربے اس کے نتائج خلاف امید ظاہر ہوتے ہیں تو وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں پر الزام رکھتا ہے اس نے آپ خدا کا ایک مفہوم مقرر کیا اور جب خدا ویسا نہ نکلا جیسا اس نے سمجھا تھا تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کی جگہ خدا کی طرف سو بدگمانیاں پیدا کرنے لگا یعنی خدا کو وہ ویسا ہی سمجھو جائے گا جیسا وہ سمجھ چکا ہے خواہ خدا کی خدائی رہے یا نہ رہے۔

خدا کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس مسئلہ پر انسان اپنی مجبورانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کرتا ہے اور اس لئے وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی کا سہارا ڈھونڈھ کر اپنی جد وجہد

کی مصیبتوں کو کم کردے اور یہیں سے وہ خدا وجود میں آجاتا ہے جس سے ہم اپنی ناکامیوں پر بازپرس کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنی قوت عمل کو اصل چیز قرار دیکر خدا کا مفہوم متعین کرے تو شاید خدا خود اس کو اپنے اندر نظر آئے اور وہ اپنی ہی عملی زندگی کی اصلاح و درستی کی طرف مائل ہو۔

سوچتے سوچتے جب میرے سامنے مذاہب عالم کی تاریخ آئی اور ان معتقدات کی تفصیل جن کو مذہب نے دنیا سے تسلیم کرا لیا ہے تو میرے ذہن نے زیادہ عمیق فلسفیانہ رخ اختیار کیا۔ ایک بے لاگ انتقادانہ کیفیت میرے اندر پیدا ہوئی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اگر مذاہب کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی بنیاد سوا واہمہ پرستی کے اور کچھ نظر نہیں آتی۔

سب سے بڑی واہمہ پرستی جو سرچشمہ ہے اور بہت سے اوہام کا معجزہ کا اعتقاد ہے معجزہ نام ہے ایسے فعل کا جو قوانین فطرت کے خلاف ہو، یعنی اگر کوئی شخص ایسا دائرہ بنا سکے جس کا قطر اس کے محیط کا نصف ہو تو یہ اقلیدس کا معجزہ کہلائے گا اگر ہم دو اور دو کے مجموعہ کو پانچ ثابت کر دکھائیں تو یہ دنیا ریاضی کا معجزہ کہلائے گا اگر کوئی شخص بلندی سے پتھر گرائے اور پہلے سیکنڈ میں اس کی رفتار دس فٹ ہو دوسرے سیکنڈ میں ۲۵ اور تیسرے سیکنڈ میں پانچ فٹ تو یہ طبیعیات کا معجزہ کہلائے گا۔ اگر ایک آدمی ہائڈروجن آکسیجن اور نائٹروجن کو ملا کر سونا تیار کرے تو یہ علم الکیمیا کا معجزہ ہوگا اور اگر کوئی حکومت چاندی کے سکے کو سونے کا سکہ بنا سکے تو فنانس کا معجزہ ہوگا، اس طرح ایک چوکور مثلث بنانا۔ آئینہ کی پشت پر کھڑے ہونے والے کا عکس آئینہ میں دکھا دینا۔ آواز بازگشت سے علاوہ اپنی آواز کے اور کوئی آواز پیدا کرنا، الغرض قدرت کے

مقررہ قوانین کے خلاف کوئی بات کر دکھانا معجزہ کہلائے گا لیکن اس وقت جبکہ فطرت کے قوانین اٹل سمجھے جاتے ہیں اور تمام ذہنی ترقیوں کا انحصار اس پر ہے، کیا آپ میں اس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ ایسا دعویٰ کریں، اور کیا کوئی اس کا یقین کر سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو انسان ہی نے پیدا کیا اور بڑی حد تک اپنی ہی طرح سے انسان سمجھا جب وحشت کے انسان نے خود تصور خدا کا پیش کیا اس میں بھی وہی وحشت و درندگی پائی جاتی تھی اس کے بعد جب انسان نے کچھ ترقی کی تو خدا بھی ایک حد تک ترقی یافتہ ہو گیا۔ اس کی وحشت کم کر کے تھوڑا سا رحم بھی اس کے دل میں ڈال دیا گیا، جب انسانی ذہن و خیال میں اور زیادہ وسعت پیدا ہوئی تو خدا بھی زیادہ منصف زیادہ رحم کرنے والا اور زیادہ مقدس ہو گیا۔ یہاں تک کہ مسیح تشریف لائے اور انھوں نے خدا کو سراپا رحم و محبت ظاہر کیا۔ لیکن زلزلے برابر آتے رہے، وبائیں بدستور پھیلتی رہیں قحط برابر پڑتے رہے اور لاکھوں آدمی تڑپ کر جان دیتے رہے جس کی تاویل مذہب والوں نے یہ کی کہ یہ تباہیاں، یہ مصائب سب انسان ہی کی فلاح کے لئے ہیں۔ کیونکہ لذت تنعم عیش و راحت اخلاق خراب کر دیتے ہیں لیکن کیا یہ باتیں اس زمانہ میں بھی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ہم کو معلوم ہے کہ نہ نیکی کبھی بدی ہو سکتی ہے اور نہ بدی نیکی: یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ تاریکی کسے کہتے ہیں اور روشنی کیا ہے؟ لیکن یہ کبھی نہیں مان سکتے کہ نیکی و بدی کی تعیین و تحدید خدا کی طرف سے ہوئی ہے۔ بلکہ ہم کو ہماری ضروریات زندگی نے بتایا ہے کہ ہماری معاشرت کے تجربات نے سکھایا ہے اور آئندہ بھی اصول اخلاق میں جو تغیرات پیدا ہوں گے وہ ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہوں گے اور ہماری ضروریات تمدن سے متعلق ہوں گے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ معتقدات مذہبی سے ہم کو کیا نقصان پہونچتا ہے اگر ہم دوزخ و جنت، حور و قصور، جن و ملک، معجزہ، خرقِ عادات وغیرہ پر عقیدہ رکھتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے جبکہ ان عقائد کا مقصود بھی اصلاحِ اخلاق ہے بظاہر یہ بات قرینِ عقل معلوم ہوتی ہے، لیکن فی الحقیقت ان عقائد کے نقصانات حد درجہ مہلک ہیں!

یہ معتقدات چونکہ یکسر روایات پر مبنی ہیں اور عقل و درایت کا ان سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے ان کو صحیح سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن حقائق کی جستجو سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اسباب و نتائج کے رابطہ کو سمجھنے کی اہلیت ہم میں باقی نہیں رہتی۔ انسان کے تمام قوائے ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں اور ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

پھر اگر خدا کا تصور ہمیشہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے تو اب بھی اس کو بدلنا پڑے گا اور اگر مذہب انسان کے لئے ضروری ہے تو اس کے اصول بھی وہی مقرر کرنے ہوں گے جو ہمارے لئے مفید ہوں یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم قدرت کا مفہوم اس کے قوانین سے قطع نظر کر کے متعین کریں۔ اگر خدا ہے تو یقیناً وہ ان اصولوں کا پابند ہے جو اس نے وضع کئے ہیں اور اگر وہ ان اصولوں سے منحرف ہو سکتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم بھی اس سے منحرف ہو سکتے ہیں اور رشتۂ عبد و معبود کبھی استوار نہیں ہو سکتا۔

خدا کا وجود فی نفسہ نہ خلافِ عقل ہے نہ مضرتِ رساں، یعنی ہمارا نفع و ضرر اس کے تصور کی نوعیت سے ضرور متعلق ہو جاتا ہے اگر ہم خدا کو ایسی ایک قوت مان لیں جو کائنات کے نظامِ تخلیق و ارتقاء میں کارفرما ہو

تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم اس کا تصور ایک دنیاوی بادشاہ کی طرح کریں کہ وہ کسی سے خوش ہو کر نہال کر دیتا ہے اور کسی پر غضب ناک ہو کر تباہ، تو بے شک یہ تصور غلط، مضرت رساں اور مانع ترقی ہوگا۔

ہر چند خدا کے اس جدید تصور سے انبیاء، رسل، صحف مقدسہ، حیات بعد الموت، دوزخ و جنت، ملائکہ و شیاطین، حشر و نشر، عذاب و ثواب ختم ہو جائیں گے یا ان کی کوئی عقلی توجیہہ و تاویل کرنا ہوگی۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہم کو ان مروجہ عقاید اور خدا دونوں میں سے ایک کو لینا ہے اور غالباً یہ زیادہ آسان ہوگا کہ خدا کے مقابلہ میں ان معتقدات کو پس پشت ڈال دیا جائے اور بقائے مذہب کی ہلکی سی ہلکی جو صورت ہو سکتی ہے اس پر قناعت کی جائے۔

میں اس سے قبل بھی بارہا لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جب تک مذہب کا وجود باقی ہے دنیا کا امن و سکون خطرہ میں ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ تمام کرۂ ارض پر ایک ہی مذہب کے ماننے والے پائے جائیں اور مذاہب کا اختلاف حقیقتاً دلوں کا اختلاف ہے جس سے جذبۂ منافرت پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مذہب کے فنا ہونے کے بعد بھی جنگ و جدال یقیناً قائم رہے گی لیکن یہ اختلاف ہمارے قوائے ذہن کو مضمحل کرنے والا ثابت نہ ہوگا بلکہ مدافعت و حفاظت کا جذبہ ہمیں زیادہ حرکت و عمل پر آمادہ کرے گا، اور ہو سکتا ہے کہ آخر کار تمام نوع انسان کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر ان مادی اختلافات کو دور کر سکیں۔ لیکن مذہب کے ہوتے ہوئے اس کا کوئی امکان نہیں۔

بُت پرستی و بُت شکنی

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی کی شدید مخالفت کی اور جس کے علمبرداروں نے اپنے آپ کو "بت شکن" کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پروا کی اور نہ بحر ہند کی گہرائیوں کی۔ وہ مور و ملخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کر کے اٹھے اور سیل کی طرح نہ رکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برق و زلزلہ کے مانند ہر اس بتکدہ کو تباہ و برباد کر گئے، جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اٹھتا تھا "جنت عدن" سے قریب تر کر دینے والا ہوتا تھا۔ اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بت پر پڑتی تھی گویا قصر فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی۔ وہ مذہب جس کی بنیاد ہی لات و ہبل کی مسماری پر قائم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہیئے تھا اور ہر سومنات کے لئے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہو جانا ضروری تھا لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب مذہب کے کسی

گھنٹہ کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ "ایک بُت" کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف "گرز گراں" اٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف "جنید کلید بتکدہ در دست برہمن"

یوں تو دنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گذر جاتے ہیں "بُت بننے" کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "ناتراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے لیکن نہ بُت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ بُت شکن اس پر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔ کیوں؟ آیئے آج کی صحبت میں اسی پر غور کریں۔ شاید تسبیح و زنار کی گتھیوں کو اس طرح سُلجھا سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق "مادہ" سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے۔ ہمیں اس دعویٰ کے صدق و کذب پر اس وقت بحث کرنا مقصود نہیں۔ لیکن ہمارا تجزیہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ محض مادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اصل چیز جو اس کو باوقعت بناتی ہے● انسان کی ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے۔ مٹی یوں کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنا لیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہو جاتی ہے۔ لوہا اپنے معدن کے اندر بے کار ہے لیکن جب انسان اسے باہر نکال کر دوسری شکلوں میں تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے سونا یوں کسی کام کی چیز نہیں لیکن چونکہ ذہن انسانی نے اس کو معیاری قدر و قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے اس لئے وہ گراں ہے۔ الغرض مادہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص عملی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی، اس سے متعلق نہ ہو تو وہ بالکل بے کار شے ہے!

اب اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ایک "بُت" کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے؟

"بُت" فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا جب تک اس کو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا وہ ایک حقیر پارۂ سنگ تھا جس وقت تک انسان نے اپنے

جذبات کو اس میں مشکل نہ کیا تھا لیکن ایک بت تراش کی چھینی اور ایک برہمن کے جذبۂ عقیدت سے مس ہوتے ہی وہ اس قدر مقدس ہو گیا کہ پیشانیاں اس کے سامنے جھکنے لگیں اس لئے اگر بت شکنی کا ہدف صرف وہ "پیکر سنگیں" قرار پائے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پتھر کو بت بنا دینے والی حقیر و ذلیل پارۂ سنگ کو "معبود" کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی، اور وہ ہزار بت شکنیوں کے بعد بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے۔ ہاں اگر کسی مخصوص و متعین "بت" کو توڑ دینے کے بعد کوئی دوسرا بت اس کی جگہ نہ لے سکے تو بے شک بت شکنی "مفید" ثابت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ بت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لئے جب تک اس بتکدہ کو نہ توڑا جائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے۔ یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں!

اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے بت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود لات و ہبل کی صرف مورتیوں کو مسمار کر کے خاموش ہو جانا نہیں تھا بلکہ اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تذلل پیدا کرتی ہے اور اسی لئے جب کسی بت کو توڑا تو اس کا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک اور چیز ہے جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور جس کا اصطلاحی نام "خدا" ہے۔ انسان جسم ظاہری کے لحاظ سے یقیناً فانی ہے لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر فانی ہے۔ انفرادی حیثیت سے وہ چاہے کتنا ہی بے بود ہو لیکن کلی و اجتماعی حیثیت سے وہ لازوال مقصود آفرینش ہے اور یہی وہ حقیقت

تھی جو بعض زبانوں سے "اناالحق" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہرحال بُت پرستی اگر انسان سے اس جذبۂ بلند کو محو کر دینے والی ہے تو یقیناً نہایت مضرت رساں چیز ہے اور اس کو یقیناً مٹ جانا چاہیئے لیکن سوال یہی ہے کہ کیا اس وقت بھی نزاع کفر و دین کو جاری رہنا چاہیئے اور ایک کے جذبۂ بت شکنی کو دوسرے کے جذبۂ بت پرستی سے متصادم ہونا چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ عقول انسانی کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم ہمارے سامنے آیا جس پر تمام نوع انسانی متفق ہو سکتی ہے اور یہی وہ دور عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے چہرے کو بے نقاب کر کے اس کے دلکش خط و خال نمایاں کر دئے ہیں۔

مذہب ضرورت انسانی کی پیداوار تھی اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہیئے۔ اول اول جب انسان کی "اجتماعی حیثیت" محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطۂ نظر بھی تنگ تھا اور ہونا چاہیئے تھا لیکن اب کہ نظام تمدن نے وسیع ہو کر شرق و غرب کا امتیاز کر مٹا دیا ہے اور انسان صحیح معنی میں "خلیفۃ اللہ فی الارض" بن کر سارے کرۂ ارض پر چھا گیا ہے۔ مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہیئے۔ اس کے مقصود کو بھی بدلنا چاہیئے اور اس کے اصول میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہیئے تاکہ امتیاز نسل و رنگ اور اختلاف مسجد و کلیسا سے بلند ہو کر تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لایا جا سکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعیات تک محدود

رکھا جائے جزا و سزا کا معیار، بہشت و دوزخ یا حور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اور اب خدا نام کسی ایسی قہار و جبار ہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرمانروا کی طرح دنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے۔ مذہب کا دور استبداد (AUTO CRACY) ختم ہو گیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اس وقت صرف عالمگیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔

وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے آج جو خدا عیسائیوں کا ہے وہی ہندوؤں کا ہے۔ جو ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے۔ اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے۔ اس کے الطاف سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے حسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو محصور کر رکھا ہے اس کے نغموں نے ہر ہر شے کو مبہوت بنا رکھا ہے وہ ذرہ ذرہ کے اندر سمایا ہوا ہے وہ کائنات کی نبض میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے عالم کون کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے وہ گویا ایک مرکز المراکز ہے جہاں پہونچ کر ماضی حال و مستقبل سب ایک ہو جاتے ہیں۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علیحدہ قرار دے اس کا کوئی جداگانہ تصور پیدا کر کے اپنے لئے مخصوص کر لے۔ مذاہب قدیمہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا لیکن اب وہ اس شکنجہ سے آزاد ہو گیا ہے اور اپنا معبد اس نے عقل انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحوش و طیور، انس و جن، سیاہ و سفید، جاہل و عالم، شاہ و گدا سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوع

انسانی اپنی تفریق کو محو کر چکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لئے مخصوص کر سکے۔ کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوا اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہوگی اور نوع انسانی کا ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک انعام خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے۔ اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے۔ اگر معصیت کی بنا پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں اور آپ بچ جائیں۔ اب تو یہاں دوزخ ہی رہے گی یا فردوس، اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑنا ہے۔ یہ دور اشتراکیت کا اجتماعیت کا ہے جب ہر چیز ایک کلی و عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی حیات انسانی کی ہر ہر پہلو کو کائناتی (UNIVERSALITY) بنا دینا چاہتی ہے' ہمارا خدا، ہمارا معبد، ہمارا مذہب، ہماری عبادت، ہماری روحانیت سب کو "کائناتی" رنگ اختیار کرنا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصود آفرینش تھا جس کی تکمیل کا زمانہ اب آ رہا ہے۔

خدا اب مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا اس کا مطالبہ اب یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اسے تلاش کیا جائے اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے۔ وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبدوں میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس معبد میں جو خود اسی کا بنایا ہوا ہے جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جھک جاتے ہیں اور وہ معبد انسان کا قلب و دماغ ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا۔ زنار و تسبیح کے امتیاز کا زمانہ ختم ہو گیا جن کو ہم بت سمجھ کر پوجتے تھے وہ از خود سرنگوں ہوتے جا رہے ہیں جن کی پرستش

ہم خدا سمجھ کر کرتے تھے وہ خود ہم سے بیزار ہیں اس لئے ہم کو بُت پرستوں کی جستجو اجودھیا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہیئے۔ در پرستاران خدا کی تلاش حطیم کعبہ کے باہر کہیں اور دنیا میں بت پرستی اب بھی قائم ہے لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں۔ بت شکنی اب بھی ضروری ہے لیکن تیشۂ آہنی سے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بت ہر جگہ موجود ہیں اور مختلف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ بت تم کو خانقاہوں میں زرکار مسندوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ تعلیمی اداروں میں قرآن و حدیث کا درس دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ان کی صورتیں نورانی ہوں گی لیکن دل سیاہ، ان کی زبانوں پر خدا، رسول کا نام ہوگا لیکن صرف نمود و نمائش کے لئے ان کی تقریروں سے ملک قوم کی محبت ٹپکتی ہوگی لیکن ان کا مقصود صرف اپنی ذات ہوگی۔ ان کی پیشانیوں پر سجدہ کا نشان، ان کی دامن دراز طویل قبائیں، ان کی عریض و طویل داڑھیاں، ان کی ہر وقت گردش کرنے والی خاک شفا کی سمرنیں۔ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن سے تم ان بتوں کو ہمیشہ آسانی سے پہچان سکتے ہو۔ یہ خود کبھی سلام میں تقدیم نہیں کریں گے۔ کوئی دوسرا سلام کرے گا تو جواب میں کبھی سر جھکائیں گے جب یہ کسی طرف سے گذریں گے تو ان کے زائرین کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ہوگا اور جب خانقاہوں کے اندر شہ نشینوں پر ان کو بیٹھا دیکھو گے تو یہ معلوم ہوگا کہ "خداوند تعالیٰ" اپنے بندوں کو دیدار سے مشرف کر رہا ہے۔

جس وقت یہ قرآن کا درس دے رہے ہوں گے تو سوائے نحوی و صرفی نکات

کے کوئی اور موضوع ان کے سامنے نہ ہوگا۔ جب حدیث پڑھا رہے ہوں گے تو اسماء رجال کی تحقیق ان کا انتہائی کارنامہ ہوگا۔ جب یہ منبر پر وعظ فرما رہے ہوں گے تو سوا خدا کے قہر و غضب اور جہنم کے ہولناک مناظر کے وہ کچھ نہ بیان کریں گے۔ سیرۃ اکابر پر اظہار خیال فرمائیں گے تو سوا ان باتوں کے جو حماقتوں سے پُر ہیں کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکلے گا فرشتوں کی باتیں، جنّات کے افسانے، معجزہ و کرامات کے واقعات اور اسی طرح کے دیگر مزخرفات ان کے مواعظ کی جان ہیں۔ اخلاق کا درس بھولے سے اگر کبھی دیں گے بھی تو وہ بہشت کی طمع، جہنم کے خوف سے خالی نہ ہوگا اور ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئے گی کہ نیکی کرنا ہر انسان کا فطری فرض ہے اور اسے خیال مزد و تعزیر سے بہت بلند ہونا چاہیئے۔

یہ اگر رواداری و ہمدردی کا درس دے رہے ہوں گے تو یقین رکھو کہ ضرور کسی نہ کسی کا حق غصب کر کے آئے ہیں۔ یہ اگر اہل و عیال کے ساتھ محبت و رافت کا وعظ فرما رہے ہوں گے تو باور کرو کہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو ٹھوکروں سے مار کر باہر نکلے ہیں لوگوں کو سچ بولنے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ جھوٹ بولنے کا حق ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو، عجز و انکسار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ آ آ کر ان کے قدموں کو بوسہ دیں۔

الغرض یہ ہیں وہ بت جن کو اس وقت توڑنے کی ضرورت ہے اور یہ ہیں آجکل کے "لات و ہبل" جن کو مسمار کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

قرآن کے کلامِ خدا ہونے کا صحیح مفہوم

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو اس مفہوم میں خدا کا کلام کہنا جو عام طور پر قرار دیا جاتا ہے نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے منشاء کے خلاف ہے بلکہ اس صحیح تصور وحدانیت کے بھی منافی ہے جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا نہ اقوالِ سلف سے کیونکہ یہ جھگڑے کی چیزیں ہیں بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے اور اگر ہے تو کس مفہوم میں؟

ا۔ چونکہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلّمہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ سے پہونچایا گیا تھا اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کرلی جائے۔

وحی کے لغوی معنی "اشارۂ سریع" یا "الہام بالسرقۃ" کے ہیں اردو میں اس کا صحیح مفہوم "برمحل سوجھ بوجھ" کے نقرہ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری ودیعت ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی خدا کی عنایت ہے اور نتیجہ ہے اس ذہنی قوت کا جو فطرتاً انسان میں ودیعت کی گئی ہے اور چونکہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی ہے اور ان کا ہر قول و فعل صرف نوع انسان کی خدمت کے لئے ہوتا تھا اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارۂ خداوندی کے تحت ہوتا تھا

وحی کا مفہوم جو میں نے معین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔

سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی ہے یہ ہے کہ وحی کو انبیاء و رسل کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا، حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیہ"

ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں"

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اس لئے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈالدی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ہے:۔

"واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر ومما یعرشون"

ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں اور درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے،

اس جگہ وحی کے معنی اس فطرت ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لے کر شہد کی مکھی اپنا خوب صورت چھتا تیار کرتی ہے۔ جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورۂ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے۔

"یومئذ تحدث اخبارہا بان ربک اوحیٰ لہا۔

" اس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگے گی جیسے [illegible] اس پر وحی نازل کی ہو"

ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی اس لئے اس کا یہ بیان بہ زبان حال ہوگا اور اس جگہ وحی کا مفہوم "ماحول واقتضاء ماحول" قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے سورۂ "حم" میں ارشاد ہوتا ہے:

" فقضٰہن سبع سموات فی یومین واوحیٰ فی کل سماء امرہا"

پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دے دیا اور ہر آسمان میں اس کے نظم و اصول کو وحی کر دیا۔

اس جگہ وحی کے معنی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے لیکن آپ سن کر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بُری باتوں کے لئے بھی کیا گیا ہے۔

سورۂ شمس میں نفسِ انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

"فالہمہا فجورہا وتقواہا"

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی —— یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بُری باتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی یہ آیت۔

وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضہم الی بعض زخرف القول غرورا۔

اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن اس کے ساتھ لگا دئے۔

یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنی "بُری بات سجھانے" کے ہوئے۔ یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف مفہوم میں مستعمل ہوا ہے اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما ینطق عن الہویٰ ان ہو الا وحی یوحی علمہ شدید القویٰ۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور

اس کا تعلق بڑی حد تک اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے لیکن آپ اس کر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بُری باتوں کے لئے بھی کیا گیا ہے۔

سورۂ شمس میں نفس انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

"فالہمہا فجورہا وتقواہا"

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی —— یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بُری باتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی یہ آیت۔

وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضہم الی بعض زخرف القول غرورا۔

اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن اس کے ساتھ لگا دئے۔ یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنی "بُری بات سجھانے" کے ہوئے۔ یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف مفہوم میں مستعمل ہوا ہے اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما ینطق عن الہویٰ ان ہو الا وحی یوحی علمہ شدید القویٰ۔

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا، بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھایا ہے۔

سورۂ انعام میں رسول اللہ کی زبانی یہ الفاظ کہے جاتے ہیں۔

واوحی الی ہذا القرآن لانذرکم بہ۔

مجھ پر قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے میں تمہیں بری باتوں کی طرف سے ڈراؤں،

سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے۔

ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ،

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

قل لا اقول لکم عندی خزاین اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ،

(اے رسول کہدو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں، میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے)

ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہمکلام نہیں ہو سکتا، نہ کوئی انسان اس سے ہمکلام ہو سکتا ہے اور عبد و معبود کی اس باہمی گفتگو کی صورت کوئی اگر ہو سکتی ہے تو صرف وحی

کے ذریعے چنانچہ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من ورای حجاب

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ خدا سے باتیں کرتے تھے۔ مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے الفاظ اور فرشتہ ان الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا۔ اس کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش کی جاتی ہیں پہلے انھیں سن لیجئے:۔

سورۂ زخرف کی آیت ہے:

انا جعلنٰہ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون۔ وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم۔

اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اس ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے یہ ام الکتاب ہے کیا اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ ـ

یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے لیکن جس وقت ہم سورۂ رعد کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو "لوح و ام الکتاب" دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

ہو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ہن ام الکتاب واخر متشابہات۔

اس آیت میں 'ام الکتاب' کو آیات محکمات سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی "مضبوط و مستحکم نشانیاں" یا بالفاظ دیگر وہ قوانین فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور

یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔

۲۔ اب عام روایات کی بنا پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو قرآن کے ام الکتاب اور لوح محفوظ میں مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پایا گیا ہے قصص الانبیا کی روایت ملاحظہ ہو :۔

عرش عظیم سے نیچے اس نے ایک دانۂ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوح محفوظ بنائی۔ اس لوح کا طول ۷۰۰ سال کی راہ اور عرض ۳۰۰ برس کی راہ[1] تھا۔ اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی گلکاری کی تھی بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ "لکھ اے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تا قیامت ہوگا اس کے متعلق میرے علم کا حال۔

• قلم نے لوح محفوظ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا، یہاں تک کہ درخت کا پتہ ہلنے گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوشنویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گلکاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں درج ہو گیا تھا۔ لیکن اس خیال کی تکذیب

---

[1] معلوم نہیں راہ کس کی مراد ہے۔ انسان کی، چیونٹی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ گھنٹے دن کی قرار پائے گی ۱۲

خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں زبور، توریت، انجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوح محفوظ میں درج ہو گئی ہوں گی ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے۔ اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے۔ یہی خیال توریت میں منتقل ہوا جیسا کہ کتاب استثنا، باب ۱۰ آیۃ الغایۃ ۵ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں جیسی اس نے توڑ دی تھیں تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے۔" ——— اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا چنانچہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کے لئے استعمال ہوا ہے وہی ہے جو عربی میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے، کہ ان کے توریت و انجیل لوح محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے اس لئے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن توریت و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوح محفوظ میں درج ہونا چاہیئے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑ لی گئیں۔

۳۔ یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوح محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے اب درایتی حیثیت

سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے۔ حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہونچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا کی صفت نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی اور یہ اسلام کے تصور وحدانیت کے منافی ہے۔

گفتگو، نطق، الفاظ ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلات نطق یا عضلات واعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صوت کے لئے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کر سکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت،

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا، بولتا چالتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لئے بھی ضروری نہیں کہ خدا اس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اپنے فرشتہ کے ذریعے اس کے پاس بھیجے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ رسول کی عظمت کی منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغامبر کی حیثیت دینا جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو ایک ڈاکیہ کی حیثیت دے دینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔

ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں۔ لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہو سکتا ہے۔

جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو، جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کر سکتا ہو اور جسے اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو، فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر فوج کو نہ لڑائے اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقع کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیونکہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کر سکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہیئے لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوت اختراع کیا ثابت ہوتی ہے؟

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے۔ قرآن میں جہاں جہاں کلام اللہ اور کلمات اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد خدا کے احکام ہیں۔ رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کر کے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا تقاضا یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل

کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

اگر قرآن کو خدا کا کلام سمجھا جائے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے تو اس پر بہت سے شبہات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے، دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم ذات صرف خدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شے مخلوق" ماننا پڑے گا لیکن "شے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شئی ہالک الا وجہہ" اس لئے نتیجہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے، اور اس لئے خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضائع ہو جائے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضائع ہو گیا۔

(۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے، یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے۔ اس لئے لامحالہ اسے "صفت ربانی" ماننا پڑے گا لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعے آنحضرتؐ تک پہونچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا جس طرح خدا نے کیا تھا، بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

(۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے اس لئے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اس قرآن سے بلحاظ ترتیب مختلف ہے جو لوح محفوظ میں پایا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیئے۔

(۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں رسالتمآبؐ پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں "شان نزول" کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا، وہ آیت بھی موجود نہ تھی اس لئے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بناء پر پہلے ہی تمام آیات لوح محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں

(۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوح محفوظ میں موجود تھا تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ "قل" سے شروع ہوتی ہیں، یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کرکے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" درآنحالیکہ اس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی اسی طرح ان دعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے۔ کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کرلی گئیں تھیں اور اس کی کیا ضرورت تھی؛

(۸) اگر قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو پھر "بسم اللہ الرحیم" کے یہ معنی ہونگے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے جو بالکل بے معنی سی بات ہے۔

سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لے کر مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہے گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعتاً "ایاک نعبد" سے انداز تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جارہا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علیحدہ علیحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے، اگر سورۂ فاتحہ پہلے سے لوح محفوظ میں منقوش ہوتی تو اس کا انداز تخاطب یہ نہ ہوتا۔

(۹) قرآن شریف میں بکثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق بالکل عہد نبوی سے ہے، مثلاً ابولہب یا کفار مکہ! وہاں کے اصنام وغیرہ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلق عالم کے وقت لوح محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ صورت

مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ درآنحالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے:

(۱۰) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں لیکن اس کی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفت نطق کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو جو الفاظ کا محتاج ہے جس طرح اس کو سننے اور دیکھنے کے لئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کلام کے لئے زبان یا الفاظ سے بے نیاز ہونا چاہیئے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند منجملہ اور شبہات کے جن کی بناء پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" سمجھنے سے مجبور ہوں، لیکن اگر ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلام خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ و حرف نہیں ہیں بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علی وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کئے جنھیں آپ نے اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔

روح و بقاء روح

علمی و اسلامی نقطۂ نظر سے

مذہبی و علمی دنیا کے درمیان یوں تو بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن ان تمام اختلافات کی بنیاد مذہب کے صرف مابعد الطبیعی عقائد ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ اگر اہل مذہب بقاء روح و حیات بعد الموت سے انکار کر دیں یا اہل علم اس کے قائل ہو جائیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مذہب والے کہتے ہیں کہ موت، زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ ابتداء ہے دوسری زندگی کی یعنی جس طرح اس عالم آب و گل میں ایک انسان اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کا تشخص باقی رہے گا کیونکہ روح غیر فانی ہے اور اس کے ماننے یا نہ ماننے کا نام مذہب و لا مذہبیت ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ بقاء روح یا حیات بعد الموت کا عقیدہ دنیا کے مذہبی دور کی پیداوار ہے یا اس سے پہلے کی اور اس کا جواب تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد ہم کو یہ ملتا ہے کہ مذاہب الہامی کے ظہور سے بہت پہلے جب انسان جہل و تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا یہ عقیدہ پایا جاتا تھا اور مذاہب عالم نے اس میں کوئی تبدیلی ایسی نہیں کی جو الہام خداوندی کے بغیر ناممکن ہوتی یا جس کے ثبوت میں کسی ربانی دلیل کی ضرورت لاحق ہو اس لئے اگر لامذہب جماعت اس عقیدہ کی مخالف ہے تو دراصل یہ مخالفت مذہب کی نہیں بلکہ انسان کے تاریک دور کے ایک خیال کی مخالفت ہے اور اگر اہل مذاہب یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ عہد قدیم کے انسان کا یہ عقیدہ بھی الہامی تھا تو پھر عہد تاریک کے اس عقیدہ کو بدستور قائم رکھنے کی ذمہ داری اہل مذاہب ہی پر عائد ہوتی ہے اور وہی اس کے جوابدہ ہیں۔

ابتداء آفرینش میں انسان کا علم و تجربہ دونوں بہت محدود تھے، وہ کائنات کے ہر طبیعی حادثہ کو دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا اور اپنی کوتاہ عقل کے مطابق اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ دنیا کے حوادث میں سب سے پہلا اور اہم حادثہ جس سے اس کو دوچار ہونا پڑا غالباً اس کی اولاد یا دیگر عزیزوں کی موت کا رہا ہوگا۔ اول اول اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہوگا کہ جیتا جاگتا چلتا پھرتا انسان کیوں اور کہاں چلا گیا۔ لیکن جب اس کے واہمہ نے خواب میں پھر اس کو زندہ دکھایا ہوگا تو اس نے خیال کیا ہوگا کہ آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی وہ زندہ ہے اور یہیں سے نہ صرف بقاء روح بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدہ کی ابتداء

ہوتی ہے جو اس وقت بھی مذاہب عالم میں اصل بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عقیدہ کا دوسرے الفاظ میں یہ مفہوم قرار پاتا ہے کہ روح زندگی سے مختلف چیز ہے اور وہ زندگی ختم ہونے کے بعد بھی پائی جاتی ہے، حالانکہ علمی تحقیق سے زندگی کی جو حقیقت دریافت ہوئی ہے وہ اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

تمام اونچے درجے کی حیوانی زندگی صرف ایک خلیہ (CELL) سے شروع ہوتی ہے یہ خلیہ دوسرے خلیے سے ملتا ہے اور پھر ان سے اور بہت سے خلایا پیدا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک خاص صورت کا حیوان تشکیل پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی تمام حیوانی زندگی کے دوران میں کروروں بلکہ اربوں خلایا اس کے جسم میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں یہاں تک کہ بیماری یا کھولت یا کسی حادثہ کی وجہ سے یہ خلایا بے کار ہو جاتے ہیں اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خلایا میں روح ہوتی ہے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جب وقت استقرار حمل ہوتا ہے تو ماں کی طرف سے کم از کم دس ہزار خلایا اور باپ کی طرف سے اربوں خلایا کام کرنے کے لئے حرکت میں آجاتے ہیں لیکن ان میں صرف ایک یا دو خلایا انسانی زندگی کا باعث ہوتے ہیں اور باقی سب ضائع ہو جاتے ہیں اس لئے اگر خلایا اور جراثیم میں بھی روح کا وجود تسلیم کیا جائیگا تو کائنات میں روحوں کی تعداد غیر محدود تسلیم کرنا پڑے گی، علاوہ اس کے اگر روح کو حیات سے علیحدہ کوئی چیز دوسری مانیں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ انسان میں وہ روح، کب، کیونکر اور کہاں سے داخل ہوئی اور جسم سے جدا ہو جانے کے بعد وہ کہاں چلی جاتی ہے۔

اس سے پہلے جب علم طب نے زیادہ ترقی نہ کی تھی تو ایک مردہ بچہ پیدا

پہلے پہلے دفن کر دیا جاتا تھا اور اس طرح ڈوبنے کے بعد جب انسان بے جان ہو جاتا تو اسے بھی سپرد خاک کر دیتے تھے لیکن اب بعض صورتوں میں بجلی یا دوسرے ذرائع سے ان کے ساکن قلب میں حرکت پیدا کر دی جاتی ہے اور زندگی عود کر آتی ہے اگر ہم روح کے وجود کو زندگی سے علیحدہ تسلیم کر لیں گے تو ان صورتوں میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ مردہ روح کیا کہیں قریب ہی منڈلا رہی تھی جو ان کے جسموں میں داخل ہو گئی اور اگر ایسا ممکن تھا تو پھر وہ بغیر طبی ذرائع اختیار کئے ہوئے از خود کیوں نہ آ گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم جس چیز کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں وہی دراصل روح ہے تو پھر حشرات و نباتات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ زندگی سے وہ بھی خالی نہیں ہیں۔ حالانکہ اہل مذاہب سوا انسان کے کسی اور جاندار میں روح کا وجود تسلیم نہیں کرتے۔

بہرحال اہل مذاہب کا یہ عقیدہ کہ روح زندگی یا حیات سے علیحدہ کوئی ایسی چیز ہے جو فنا نہیں ہوتی، اہل علم کے نزدیک قابل تسلیم نہیں اور اس اعتراف و انکار کے سلسلہ میں مذہب کی طرف سے کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جاتی ہے اور اہل علم انکار کے بہت سے دلائل اپنے پاس رکھتے ہیں مثلاً:۔

(۱) اگر روح غیر فانی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قدیم ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک چیز کی انتہا نہ ہو لیکن ابتدا ہو۔ وجود کا ایک سرا اگر لا محدود ہے تو دوسرا بھی یقیناً لا محدود ہوگا اس لئے روح کو غیر فانی کہنا گویا اسے واجب الوجود تسلیم کرنا ہے حالانکہ یہ صفت صرف خدا کو حاصل ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔

(۳) اگر روح حیات سے علیحدہ کوئی چیز ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہے کہ وہ کس وقت جسم انسانی میں داخل ہوتی ہے آیا اسی وقت جب نطفہ رحم مادر میں قرار پاتا ہے یا اس کے بعد کسی اور زمانہ میں۔ اگر استقرار حمل کے وقت ہی کو آمد روح کا اوّلین لمحہ قرار دیا جائے تو چونکہ روح کو صاحب شعور و ادراک کہا جاتا ہے اس لئے جنین کو رحم مادر کے اندر بھی صاحب شعور و ادراک ہونا چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر آمد روح کا کوئی اور وقت مقرر کیا جائے گا تو پھر اس تعین کے کیا اصول ہوں گے جبکہ شعور و ادراک کے مسئلہ میں تمام انسان یکساں نہیں ہیں کسی میں شعور و ادراک بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے کسی میں بہت دیر کے بعد، کسی کا حافظہ ابتداء ہی سے قوی ہوتا ہے اور کسی کا آخر عمر تک ضعیف رہتا ہے اور جو دیوانے پیدا ہوتے ہیں ان میں آخر عمر تک شعور و ادراک پیدا نہیں ہوتا حالانکہ روح ان کے اندر بھی پائی جاتی ہے اس صورت میں مجبوراً یہ ماننا پڑے گا کہ شعور و ادراک کا تعلق روح سے نہیں ہے جو عقیدۂ مذہبی کے خلاف ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ دماغی خرابی یا موت کے ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہے حالانکہ یہ بقاء روح کے عقیدہ کے منافی ہے۔

(۴) اگر یہ کہا جائے کہ روح اور حیات ایک ہی چیز ہے تو پھر حیات کے ساتھ اس کی ابتداء اور موت کے ساتھ اس کا اختتام بھی تسلیم کرنا چاہئے اور اس صورت میں روح کو غیر فانی نہیں کہہ سکتے۔

(۵) اگر روح غیر فانی ہے تو اس کے بقاءِ دوام کی نوعیت متعین کرنا پڑے گی اور اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ روح کے وجود کے لئے زمان و مکان کی تعین ضروری ہے اور جب زمان و مکان کی قید لگ جاتی ہے تو پھر اسے محدود

ماننا پڑے گا اور ہر محدود چیز فانی ہے اس لئے روح کو بھی فانی ماننا پڑے گا۔

(۶) اگر ہر انسان کی روح انفرادی طور پر علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وجود انسانی سے قبل بھی انفرادیت رکھتی تھی۔ لیکن وہ انفرادیت کیا تھی؟ اگر عقیدۂ تناسخ کی رو سے اس کا تشخص کسی اور ہستی کے تشخص کے ساتھ وابستہ تھا تو پھر ان تمام ہستیوں کا شعور و ادراک جن جن میں وہ روح داخل ہوگی تھی یکجا ہونا چاہیئے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ جس شعور و ادراک کی روح جسم میں داخل ہوگی وہی شعور و ادراک انسان میں پیدا ہوگا تو پھر اس کا جوابدہ کون ہے کہ احمد میں کیوں احمقانہ روح داخل کی گئی اور محمود کو کیوں عظمت روح سے سرفراز کیا گیا

(۷) اگر یہ کہا جائے کہ روح میں پہلے سے کوئی شعور نہیں پایا جاتا بلکہ جسم انسانی میں داخل ہونے کے بعد شعور پیدا ہوتا ہے تو پھر یہ بتانا پڑے گا کہ اس شعور و ادراک کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے اور کیا اس کا تعلق کسی اور روح سے ہے۔

(۸) اگر حیات اور روح کو ایک ہی چیز تسلیم کیا جائے تو جنین کی اولین جنبش و حرکت کے ساتھ اس کے آغاز کو ماننا پڑے گا اور انسان کی موت کے ساتھ اس کے اختتام کو۔ اور اس صورت میں روح کو فانی ماننا پڑے گا یا حیات کو غیر فانی اور یہ دونوں مسلمات مذہب کے خلاف ہیں۔ علاوہ اس کے ہم کو ان تمام مخلوقات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جو ذی حیات کہلاتے ہیں اور روح کی حامل نہیں۔

(۹) اگر یہ کہا جائے کہ روح انسانی، روح حیوانی، روح نباتی اور روح حشراتی سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اس صورت میں ان سب روحوں کو غیر فانی

ماننا پڑے گا یا پھر اس کی وجہ بتانا پڑے گی کہ روح انسانی کیوں غیر فانی ہے، اور دوسری قسم کی روحیں کیوں فانی ہیں اور اگر روح نباتی و روح حشراتی کے غیر فانی ہونے کو عقل قبول نہیں کرتی تو روح انسانی کے غیر فانی ہونے کو کیوں قبول کرے۔

(۱۰) اہل مذاہب اس کا ایک الزامی جواب یہ دیتے ہیں کہ جب مادئین مادہ کو غیر فانی مانتے ہیں تو روح کو غیر فانی ماننے میں کیا حرج ہے۔ یعنی اگر جسم کے اجزاء فنا نہیں ہوتے بلکہ صرف ہیئت بدلتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ روح بھی انہیں مختلف تشخصات کے ساتھ نہ پائی جائے۔

اہل مذاہب کا یہ اعتراض ــــ خود ان کے عقائد کے خلاف ہے کیونکہ اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی روح اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہی اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنے کیڑوں یا پودوں کی روحوں میں منقسم ہو گئی اور اس طرح یوم آخرت میں انسانی روح کے جزا پانے کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے۔

(۱۱) مذاہب بقاء روح اور عذاب و ثواب کے ثابت کرنے میں ایک اخلاقی منطق سے بھی کام لیتے ہیں اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد احیاء موتی، بقاء روح حشر و نشر عذاب و ثواب کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ایک شخص اس دنیا میں باوجود عصیاں کاری کے لطف و مسرت کی زندگی بسر کرے، اور دوسرا شخص باوجود تقدس و نکوکاری کے خراب و خستہ رہے اس عدم توازن کے دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک عدالت گاہ قائم کی جائے اور وہاں عذاب و ثواب سے دونوں پلے برابر کر دئے جائیں اس صورت میں خدا کے عادل ہونے کی صورت برقرار رہتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ یہ عقیدہ علمی حقائق و مسلمات اور فطری قوانین اور مقادیر کے خلاف بھی ہے سب سے بڑا نقص اس میں یہ ہے کہ خدا کی مسئولیت اس عقیدہ کے بعد بھی دور نہیں ہوتی کیونکہ ایک انسان کو انسان، ایک حیوان کو حیوان۔ ایک پودے کو پودا پیدا کرنے کی ذمہ داری بہرحال خدا ہی پر عائد ہوتی ہے اور اس لئے سبزہ فریاد کر سکتا ہے کہ اسے کیوں سبزہ پیدا کر کے ہمیشہ پامال رکھا۔ ایک کیڑا شکایت کر سکتا ہے کہ اسے کیڑا پیدا کر کے کیوں چڑیوں اور جانوروں کا لقمہ بنایا۔ ایک جانور کہہ سکتا ہے اسے جانور بنا کر کیوں انسان کے بس میں دے دیا اور اگر ان کا جواب یہ دیا جائے کہ یہ خدا کی مصلحت ہے "جسے چاہا جیسا بنا دیا" تو پھر انسانی دنیا کے اس عدم توازن کا بھی یہی جواب ہو سکتا ہے کہ خدا مختار ہے دنیا میں جس طرح جس کو چاہا رکھا اگر اچھے کام کرنے والے کو تکلیف پہونچی تو کیا اور برے کام کرنے والے آرام سے ہے تو کیا؟ خدا بے نیاز ہے اور اس سے کوئی اخلاقی بازپرس نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام مذہبی عقائد صرف اس کے اس پندار کا نتیجہ ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے اور اگر کسی کام کا نتیجہ اس کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ اپنی تسکین اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ یہاں نہیں تو کہیں اور اس وقت نہیں تو کسی وقت اور اس کی تلافی ہوگی اس لئے اپنی دنیاوی زندگی کے لحاظ سے اچھائی اور برائی کی تعیین کی، اور اسی لحاظ سے اس نے اُخروی عذاب و ثواب کی طرح ڈالی، ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں عیش کی ہے کبھی یہ نہیں چاہ سکتا کہ اس سے اس عیش کوشیوں کی بازپرس ہو اور ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں ناکام زندگی بسر کی ہے، اپنی تسلی صرف اس طرح کر سکتا ہے کہ ایک دوسری دنیا فرض کر کے

اس میں اپنے آپ کو عیش کرتا ہوا دیکھے۔ الغرض بقاء روح اور عذاب و ثواب کا عقیدہ خدا کی بے نیازی اور علم و عقل کو دیکھتے ہوئے ضرورت و مصلحت اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے اور اس کو تسلیم کرانے کے لئے نہ کوئی ربانی دلیل پیش کی جاسکتی ہے نہ اخلاقی و علمی۔

یہاں تک تو علمی بحث اس عقیدہ کے متعلق ہوئی۔ اب آیئے دیکھیں کہ اسلام نے اس گتھی کو کس طرح سلجھایا ہے اور چونکہ اسلامی لٹریچر میں صرف قرآن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس لئے ہم اپنی جستجو کو صرف آیات قرآنی ہی تک محدود رکھیں گے۔

قرآن مجید میں روح کا لفظ متعدد جگہ آیا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لئے ہم ان آیات کو اپنے سامنے رکھیں جن میں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں روح کا لفظ حضرت عیسیٰ سے تعلق رکھتا ہے مثلاً سورۂ بقر میں ارشاد ہوتا ہے "وایدناہ بروح القدس" (یعنی ہم نے روح القدس سے ان کی مدد کی) سورۂ مائدہ میں خطاب ہوتا ہے کہ "ایدتک بروح القدس" (ہم نے روح القدس سے تمہاری مدد کی) سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے "عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القھا الیٰ مریم و روح منہ" اس آیت میں گویا عیسیٰ کے "روح اللہ" ہونے کی صراحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ اور کلمتہ اللہ کا بھی وہی مفہوم ہے جو روح اللہ کا۔

ہرچند ان آیات سے اس روح پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جو زیر بحث ہے

لیکن ان سے کم ازکم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ رُوح کا لفظ اپنے لغوی و اصلی معنی سے ہٹ کر مجازاً کسی دوسرے مفہوم میں بھی استعمال ہو سکتا ہے،

سورۃ سجدۃ میں ایک جگہ انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :۔ ونفخ فیہ من روحہ" سورۃ شوریٰ میں خود قرآن کو رُوح سے تعبیر کیا گیا ہے کذالک اوحینا الیک روحا من امرنا" سورۂ مومن میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"یلقی الرُّوح من امرہ علیٰ من یشاء من عبادہ" یعنی اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہتا ہے رُوح نازل کرتا ہے.

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں رُوح کو بمعنی الہام، وحی یا فراست استعمال کیا گیا ہے، اور اس رُوح سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جو حیات انسانی سے تعلق رکھتی ہے، سورۃ بنی اسرائیل میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رُوح کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے" یسئلونک من الروح قل الروح من امر ربی" (تجھ سے رُوح کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں۔ کہدو کہ رُوح حکم خداوندی کا نام ہے)

اول تو اس آیت کے بعد کی آیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی رُوح سے قرآن یا وحی والہام مراد ہے کیونکہ بعد کی آیتوں میں صراحتاً وحی و قرآن کا ذکر موجود ہے لیکن اگر ہم سیاق کی دوسری آیتوں سے علیحدہ سمجھ کر یہاں رُوح کے معنی واقعی رُوح کے لیں تو اس سے رُوح کی حقیقت صرف اس قدر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے اور شاید اس سے بہتر الفاظ میں رُوح کی حقیقت کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپ امر ربانی یا حکم خداوندی پر غور کریں گے تو قانون قدرت یا مقادیر الہیہ کے علاوہ کچھ نظر نہ آئیگا

اوراس طرح روح کے معنی صرف اس حیات یا زندگی کے رہ جائیں گے جو قانون قدرت کے مطابق پیدا ہوتی اور فنا ہوجاتی ہے۔

مجھے تلاش سے کلام مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ روح زندگی سے علیحدہ کوئی دوسری چیز ہے اور موت کے بعد وہ باقی رہتی ہے۔

سورۂ نبا، میں بے شک ایک جگہ "یوم یقوم الروح والملائکۃ صفا" کہا گیا ہے لیکن ———— غالباً یوم قیامت کا ایک منظر اس میں ظاہر کیا گیا ہے ———— یہ پوری سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی جب عہد رسالت کی ابتداء تھی اور کفار عرب نے رسول اللہ کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ سورت دراصل رسول اللہ کی کامیابیوں اور کفار کی ناکامیوں کی پیشین گوئی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اچھی اور بری طاقتوں کا مقابلہ ہوگا اور کامیابی رسول اللہ کو ہوگی۔

○

خدا کا تصوّر

آپ مذاہب عالم کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مادیات سے ہٹ کر خدا کا تصور آج تک کوئی مذہب قائم نہ کر سکا، یہاں تک کہ جمادات نباتات و حیوانات میں سے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو کبھی نہ کبھی خدا بننے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو، خیر آفتاب و ماہتاب کو چھوڑ دیجئے کہ ان میں تو ایک قسم کا علو پایا جاتا ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ مذہب نے پتھروں، درختوں اور جانوروں کے سامنے بھی ہمیں سر جھکانے پر مجبور کیا۔ گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مذہب نے انسان کو ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا اور ایسی صورت میں اخلاق انسانی پر جو خراب اثر پڑنا چاہیئے تھا، پڑا، اور آج تک مذہب زدہ قومیں اس کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔

جن بانیان مذہب نے خدا کا تصوّر قائم کرنے میں ان پریشان خیالیوں سے کام لیا، اُن کو میں بُرا نہیں کہتا کیونکہ انھوں نے جو کچھ کیا خلوص نیت سے کیا۔ جہل کی مجبوری سے کیا اور اس سے زیادہ کوئی اور توقع ان سے ہو بھی نہ سکتی تھی، لیکن میں موجودہ زمانے کے انسان پر ضرور حیرت کرتا ہوں کہ وہ اب بھی اس تقویم پارینہ کو سامنے رکھ کر

اپنے آپ کو اپنی زندگی کا جوابدہ سمجھتا ہے۔

انسان کو جتنے حواس فطرت نے عطا کئے ہیں ان سب کا تعلق مادیات سے ہے یعنی وہ کسی ایسی بات کا تصور کر ہی نہیں سکتا جو اس کے حواس کے حدود سے باہر ہو اس لئے جب اول اول انسان کو ان ناکامیوں سے واسطہ پڑا جن کا سبب وہ متعین نہ کر سکتا تھا تو اس کا خیال کسی ایسی قوت کی طرف منتقل ہوا جسے وہ اپنے سے زیادہ زبردست سمجھتا تھا لیکن اس کا تصور اس نے قائم کیا انھیں چیزوں کو دیکھ کر جن سے وہ دنیا میں روز دوچار ہوتا تھا۔ یہ تو تھا خوف کا عنصر جس نے انسان کو خدا کا خوفناک تصور قائم کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن بعض تجربات اس کے دلخوش کن بھی تھے۔ اس لئے ان کا تعلق اس نے مہربان خداؤں سے رکھا اور ان کا تصور اس نے ایسی چیزوں کی مدد سے قائم کیا جو اس دنیا میں اس کے لئے سازگار ثابت ہوئیں،

اس میں شک نہیں کہ اسلام کا بتایا ہوا خدا غیر مادی ہے لیکن جو تصور اس نے پیش کیا ہے وہ مادیت کی جھلک سے بالکل پاک نہیں ہے اسلام کے تصور الٰہی کا تذبذب اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ننانوے ناموں سے اسے سمجھانا چاہا حالانکہ ان میں سے بعض نام مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد بھی ہیں مثلاً رحمان و جبار، رحیم و قہار اور مفہوم کے لحاظ سے سوا ایک آدھ کے کوئی ایسا نہیں جو جذبات سے علیحدہ ہو۔ ان ناموں میں صرف ایک نام "کل" ایسا ہے جو فلسفیانہ گہرائی لئے ہوئے ہے لیکن یہ اسا زیادہ مشہور نہیں اور میں نے آج تک نہیں سنا کہ کسی درویش یا مولوی نے یہ نام ورد کیا ہو۔ وہ یا غفور، یا رحمٰن یا رحیم کا ورد تو بکثرت کرتا ہے کیونکہ دوزخ سے ڈرتا ہے لیکن "ہوالکل" اس کی سمجھ میں نہیں آتا

اس لئے وہ اس نام سے سرسری گزر جاتا ہے۔

ان ناموں کے مفہوم میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کی تاویل میں ہم کو "کل یوم ہو فی شان" سنایا جاتا ہے۔ یعنی وہ رحم و کرم کے موقع پر رحیم و کریم ہے اور قہر و جبار کے موقع پر قہار و جبار، لیکن اس قسم کی تاویل کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہ یہ کہہ کر خدا کو انسان کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں کیونکہ رحم و کرم، قہر و غضب، خوشی و برہمی، لطف و بیزاری، عطا و انتقام، ان سب کا تعلق جذبات سے ہے اور خدا اگر جذبات رکھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان بھی خدا نہ کہلائے، ان ناموں میں بعض نام مثلاً صبور، شکور، مومن وغیرہ تو ایسے ہیں جو انسان کے انفعالی جذبات سے متعلق ہیں اور کسی طرح خدا کی صفات میں شامل نہیں ہو سکتے اور ادنیٰ تامل سے یہ بات ہر شخص پر واضح ہو سکتی ہے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر خدا کا صحیح ترین نام سوائے "جامع اضداد" کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انسان کے لئے کسی ایسی چیز کا تصور بہت دشوار ہے جس نے اس کو نہ دیکھا ہو، وہ کسی غائب چیز کے سمجھنے میں صرف قیاس سے کام لے سکتا ہے اور قیاس کا تعلق صرف انھیں اشیاء سے ہوتا ہے جن کو انسان دیکھ چکا ہے اس لئے خدا کا تصور قائم کرنے میں بھی اس کو یہی دشواری پیش آئی اور چونکہ انتہائی عظمت و قوت کے تصور میں وہ ایک مستبد و جابر بادشاہ سے زیادہ اور کوئی چیز موزوں نہ پا سکتا تھا اس لئے اس نے خدا کو اسی صورت میں سمجھنا چاہا

ہمارے پاس اس کی کوئی شناخت موجود نہیں ہے کہ خدا کے اس تصور میں کوئی خاص تبدیلی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی لیکن یہ ضرور ہے

کہ اسلام نے جو تصور پیش کیا اس میں کہیں کہیں اس بلندی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے جو اس مادّی تصور سے خدا کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ کر دیتی ہے؛ اور شاید یہ سب سے پہلا قدم تھا جس نے بعد کو علم کلام کی بنیاد ڈالی اور صوفیہ نے اس الجھن کو "ہمہ اوست" "ہمہ از وست" کہہ کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

میں خود ایک زمانہ تک اس کے سمجھنے میں سرگرداں رہا اور آخر کار مجھے پناہ ملی تو انھیں صوفیہ کے یہاں، جن کا تصور واقعی ایک کائناتی اور ہمہ گیر تصور ہے اور جس کو سامنے رکھ کر ہم دنیا کے ہر انسان کو اس کے سمجھنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

ہر چند صوفیہ نے بھی بعد کو اس میں بہت سی الجھنیں پیدا کر دیں لیکن احساس واصول کے لحاظ سے ان سب کا اتفاق اسی تصور پر ہے جسے ہم دوسرے الفاظ میں "ہو الکل" یا "ہو الاول اور ہو الآخر" سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

اسلام نے ایک اور تصور بھی پیش کیا جو خالص فلسفیانہ ہے اور وہ تصور خدا کے "واجب الوجود" اور "قدیم" ہونے کا ہے لیکن اس قسم کے فلسفیانہ تخیل سے اخلاق انسانی پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ البتہ ذہن انسانی کی ورزش ضرور ہو جاتی ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ محض واجب الوجود اور قدیم کا مفہوم متعین کرنے میں دفتر کے دفتر لوگوں نے سیاہ کر دئے اور بجائے اس کے کہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا، فرقہ بندی کی صورت پیدا ہو گئی۔

میری رائے میں خدا کا بہترین تصور وہی ہو سکتا ہے جو ہمارے اندر خدا کے ساتھ محبت کی کیفیت پیدا کرنے، خوف و خشیت کا جذبہ نہ خدا سے محبت کرنا سکھا سکتا ہے اور نہ انسا جنس کے ساتھ رواداری کی تعلیم دے سکتا ہے۔ عیسوی

مذہب میں خدا کا تصور یک گونہ اس معیار پر پورا اترتا ہے لیکن ان کے یہاں تثلیث کے عقیدے نے اس کو بالکل مہمل بنا دیا۔ اب سائنس کے دور میں اگر خدا کا کوئی تصور قائم ہو سکتا ہے تو اس کو ہم صرف قوت (ENERGY) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہمارے اندر محبت و شفقت کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتا اور دنیا کے امن و سکون کے لئے ہمیں ضرور کوئی نہ کوئی تصور خدا کا ایسا قائم کرنا پڑے گا جو ہمیں محبت کرنا سکھائے۔

خدا کو آگ برساتے ہوئے، خون اور پیپ پلاتے ہوئے، آتشیں کوڑوں سے سزا دیتے ہوئے بہت زمانہ ہو چکا ہے، اب ضرورت ہے کہ وہ صرف زخموں پر مرہم رکھے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس پہونچائے اور بجائے کسی خاص قوم پر لطف کرنے کے وہ تمام بنی نوع انسانی کو اپنا ہی بندہ سمجھے اور نجات کا دروازہ بغیر کسی شرط کے سب کے لئے کھول دے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک مذاہب کا عقائدی اختلاف دور نہ ہو، خدا کا کوئی ایسا کائناتی تصور قائم ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر کوئی شخص اس اختلاف عقائد کو مہمل قرار دیتا ہے تو اسے ملحد و کافر کہا جاتا ہے اس لئے میری رائے میں اب خدا کی خدائی اگر صحیح معنی میں قائم ہو سکتی ہے تو اس کی توقع ہم کو صرف کافروں اور ملحدوں ہی سے کرنا چاہیئے۔

ماخذ القرآن پر ایک اصولی گفتگو

علماء کرام کا سکوت

ڈاکٹر ٹسڈل کے "ماخذ القرآن" کی اشاعت کو عرصہ گزر چکا اور اس وقت تک مجمل یا مفصل ایک جواب بھی ایسا موصول نہیں ہوا جسے واقعی جواب کہا جا سکے۔ میں سمجھتا تھا کہ علماء کرام کے بعض افراد جو واقعی سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے اہل ہیں اس موضوع پر ضرور قلم اٹھائیں گے اور غیر ضروری مباحث سے قطع نظر اصل اعتراضات کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہہ سکیں گے جو خالص علم و عقل کے نقطۂ نظر سے بھی لوگوں کے لئے باعثِ تسکین ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ میرا یہ خیال غلط نکلا اور ہمارے "اکابر مذہب" نے کوئی توجہ نہ کی۔

انھوں نے اس وقت تک زیادہ سے زیادہ صرف اتنا کہا کہ یہ بحث نئی نہیں ہے اس پر اس سے قبل کافی کہا جا چکا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ احمدی جماعت، امرتسری اور اسی طرح کی بعض دوسری تبلیغی جماعتوں کے ان رسائل کو پیش کرتے ہیں جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں اور اگر کسی نے کچھ اس کے علاوہ لکھنے کی کوشش بھی کی تو بالکل دور از کار باتوں کو چھیڑ دیا۔

اول تو بعض کے لئے یہی سمجھنا مشکل ہو گیا کہ "ینابیع الاسلام" اور "ماخذ القرآن" دو بالکل علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں اور اگر بعض نے اسے سمجھا بھی تو جواب میں اسی "پارینہ" لٹریچر کو کافی سمجھا جو ایک ربع صدی بلکہ اس سے بھی قبل بعض مشنریوں کی طرف سے شائع ہو چکا تھا اور جن کا اب حوالہ دینا "عذر گناہ بدتر از گناہ" سے زیادہ نہیں۔

میں ایک سے زائد بار اس حقیقت کو واضح کر چکا ہوں کہ اس وقت سوال نہ ٹسڈل کا ہے نہ کسی اور عیسائی مشنری کا، بلکہ ان مسلم یا غیر مسلم افراد کا ہے جو "ماخذ القرآن" کے مطالعے کے بعد اوہام و شکوک میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور جن کو اُن استدلات سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا، جو ٹسڈل یا دوسرے ارباب کلیسا کو خاموش کر سکتے ہیں ——— ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب والے کو نہایت آسانی کے ساتھ الزامی جواب سے مطمئن یا ساکت کر سکتا ہے، کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی بات خلاف عقل نہ پائی جائے اور اس صورت میں ایک مذہب والا نہایت اطمینان کے ساتھ فریق ثانی سے کہہ سکتا ہے کہ "تمہارے مذھبی عقائد میں اس سے زیادہ ابہال پایا جاتا ہے" لیکن مشکل تو اس وقت آن پڑتی ہے جب ہم مدعی کو اس قسم کا الزامی جواب نہ دے سکیں اور یہیں پہونچ کر اہل مذاہب کا یا تو تاویلات سے کام لینا پڑتا ہے یا اگر ان میں کوئی صاحب حال ہے تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ :-

خود گرفتم کہ نظر بر رخ خوباں جرم ست
من ازیں باز نیایم کہ مرا ایں دیں ست

لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نہ کسی "صاحب قال" نے توجہ کی اور نہ

کسی "صاحب حال" نے :

مجھ سے تقاضائے جواب

اس دوران میں "علماء کرام" کے سکوت کو دیکھ کر "قارئین نگار" نے مجھ پر تقاضہ شروع کیا کہ میں خود اس بحث میں براہ راست حصہ لوں اور ان تقاضہ کرنے والوں میں سے چونکہ اکثر ایسے ہیں جن کو میرے مسلمان ہونے کی طرف سے شک ہے اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیونکر انھیں مطمئن کر سکتا ہوں، کیونکہ اسلام کا واقعی جو مفہوم میرے ذہن میں ہے اس کا تعلق زیادہ تر محمدؐ سے ہے نہ کہ خدا سے :

قرآن کی روح سے ہے نہ کہ الفاظ سے، کردار سے ہے نہ کہ گفتار سے یعنی دنیا محمدؐ کو سمجھنا چاہتی ہے، قرآن و احادیث سے اور میں قرآن و حدیث کو پرکھنا چاہتا ہوں محمدؐ کی زندگی سے، لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ وہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے، میں کہتا ہوں قرآن وہ ہے جسے محمدؐ نے اپنے عمل سے ظاہر کیا، دنیا کے نزدیک اسلام سمجھنے کی منزلیں یہ ہیں :- "خدا، قرآن اور محمدؐ" اور میرے یہاں اس کے بالکل برعکس ان منازل کی ترتیب ہے :- "محمدؐ، قرآن اور خدا" لوگ خدا سے ڈر کر قرآن و محمدؐ کا مطالعہ کرتے ہیں اور میں محمدؐ سے محبت کر کے قرآن و خدا کو سمجھنا چاہتا ہوں :-

تو گل از باغ می خواہی، من از گل باغ می جویم
من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

ان حالات میں میرے لئے یہی مشکل ہے کہ میں اسلام کے مروجہ عقائد و مسلمات کو سامنے رکھ کر مذہب اسلام کا مفہوم متعین کروں۔ چہ جائیکہ ان عقائد و روایات کو علم و عقل کی رو سے صحیح ثابت کرنا کہ یہ تو اس سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

اسلام میرے نزدیک

پچھلے پندرہ سال کے اندر مجھے اتنی بار کافر، مرتد، ملحد و دہریہ کہا گیا کہ کبھی کبھی مجھے بھی سوچنا پڑا کہ کیا حقیقتاً میں اسلام سے خارج ہو چکا ہوں، کیا واقعی میرے لئے اب اس مذہب میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی، لیکن باور کیجئے کبھی مجھ کو اس کا یقین نہ آیا اور میں نے جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لیا۔ میں اپنے خیال پر زیادہ مستحکم ہو گیا اور بار بار رسول اللہ کا وہی ارشاد سامنے آیا جو آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا تھا کہ "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لاکر رکھدیں تو بھی میں اپنے خیال سے باز نہ آؤں گا۔"

اس موقعہ پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو میرا اسلام کس قسم کا ہے اس کے کیا اصول ہیں اور یہ اصول قرآن و حدیث پر کیونکر منطبق ہو سکتے ہیں۔

اگر میری سابقہ تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ان سوالات کا جواب مل سکتا ہے لیکن چونکہ وہ سب کے سامنے نہیں ہیں اس لئے مجملاً اس کی وضاحت یہاں کر دینا چاہیئے۔

اسلام کی اساسی شرط یہ بتائی جاتی ہے کہ "خدا کے سوا کسی اور کو معبود نہ سمجھا جائے اور محمدؐ کو اس کا رسول تسلیم کیا جائے" اور اس حد تک مجھ میں اور عام مسلمانوں میں شاید کوئی فرق نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی ایک شخص مسلمان نہیں ہو سکتا اور غالباً یہی وہ خیال تھا جس کی بناء پر حضرت عمرؓ نے "من قال لا الٰہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ" کی روایت کو بہ جبر رد کر دیا۔ کیونکہ محض خدا کو زبان سے ایک کہدینا کوئی

ایسی بات نہیں

——— جس کا انعام جنت قرار پائے رسول اللہ کی بعثت سے قبل بھی بہت سے لوگ توحید کے قائل تھے اور اس کے بعد بھی کافی تعداد ایسے لوگوں کی پائی جاتی تھی لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے وہ اتنے گرے ہوئے تھے کہ ان کو کوئی توقع جنت یا کسی دوسرے انعام کی نہ ہونا چاہیئے تھی۔

ہر جماعت میں داخل ہونے کے لئے بعض مخصوص شرائط ہوا کرتے ہیں جن کا تعلق ظاہر و باطن دونوں سے ہوا کرتا ہے اور اس قسم کے بعض شرائط جماعت اسلامی میں داخل ہونے کے لئے مقرر تھے، ظاہری شرائط یہ تھے :۔

(۱) توحید و رسالت کا اقرار (۲) متعینہ طریقوں سے مراسم عبادت ادا کرنا۔ (۳) بعض مخصوص مابعد الطبیعیاتی عقائد کا ماننا، لیکن معنوی شرط صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ اسوۂ رسول کی پابندی کی جائے۔ پھر چونکہ اجتماعی مفاد صحیح طور پر معنوی شرائط ہی سے وابستہ ہوتا ہے اور ظاہری شرائط محض علامات و آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے میرے نزدیک مسلمان ہونے کی پہلی اور آخری شرط یہی ہے کہ وہ رسول کی سیرت کو سامنے رکھ کر اس کی پابندی کرے اور اسی لئے میں نے بارہا اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ میں اگر مسلمان ہوں تو صرف "محمد رسول اللہ" کی حد تک "لا الہ الا اللہ" کی بحث میں پڑنا نہ صرف یہ کہ بیکار بلکہ ایک حد تک نقصان رساں بھی ہے کیونکہ یہ مسئلہ اتنا مشکل یا دلچسپ ہے کہ پھر انسان کو "ترک ماسوا" کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہتا اور مذہب و مذہب سب رخصت ہو جاتے ہیں حالانکہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا لائحہ عمل ہمارے سامنے ہونا بالکل فروری ہے جو یہاں کی مادی کشمکش میں ہماری بقاء حیات

کا ضامن ہو اور یہی وہ لائحہ عمل ہے جس کو میں سیرت نبویؐ سے تعبیر کرتا ہوں اور اسی کی پابندی کو اصل اسلام قرار دیتا ہوں۔

میری نامسلمانی کی ابتدا

میری نامسلمانی کی تاریخ بہت دلچسپ ہے اور ممکن ہے کسی وقت اپنے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ بالتفصیل اسے پیش کر سکوں تاہم نہایت اختصار کے ساتھ اس وقت بھی سن لیجئے۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ میرے والد سے قبل میرے خاندانی افراد جاہل تھے یا عالم، مذہبی تھے یا غیر مذہبی، لیکن خود اپنے والد کے متعلق مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ وہ سخت مذہبی انسان تھے گو اصطلاحی حیثیت سے وہ فرنگی محل یا دیو بند کے سند یافتہ عالم نہ تھے لیکن ان کا علم بڑے بڑے عالموں سے زیادہ وسیع تھا۔ فارسی کے وہ بڑے زبردست شاعر و انشا پرداز تھے صہبائی سے عنفوان شباب میں مشورہ لیتے تھے غالب کے پرستار تھے اور کتب بینی کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ رہی مذہبیت سو اس کی سختی کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ میری عمر ۶، ۷ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ اس وقت بھی مجھے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

اب یہاں اس تفصیل کا موقعہ نہیں کہ میری تعلیم و تربیت کے متعلق ان کا کیا نظریہ تھا۔ اور انھوں نے اس کے لئے کیا کیا اہتمامات کئے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میری ابتدائی تعلیم نہایت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی اور ایک نہایت متعصب مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا نشو و نما ہونے لگا۔ میں نمازیں بھی پڑھتا تھا۔ روزے بھی رکھتا تھا۔ ظاہری وضع و لباس میں بھی سر سے لے کر پاؤں تک نہایت خشک و بھیانک قسم کا مسلمان تھا

اور چونکہ صحبت عالموں اور مولویوں ہی کی تھی اس لئے شب و روز میرے دل و دماغ پر مذہب ہی مسلط رہتا تھا اور میں دنیا کی ہر بات کو مذہب ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا، لیکن اس کے ساتھ یہ بات ضرور دل میں کھٹکتی رہتی تھی کہ مذہبی لوگوں اور مولویوں کے اخلاق پست کیوں ہیں، خصوصیت کے ساتھ ان کی رعونت اور ان کا پندار تفوق مجھے بہت برا معلوم ہوتا تھا۔ ان کی یہ خواہش کہ ہر شخص دور ہی سے دیکھ کر ان کے سامنے جھک جائے، مجھے اچھی نہ معلوم ہوتی تھی اور آخرکار یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ ان کی عبادتیں بے روح ہیں اور بے روح عبادت بالکل بے کار چیز ہے۔

میری فطرت شروع سے ہی یہ ہے کہ ہر بات کے سبب و نتیجہ پر غور کرتا ہوں اور جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو میں مشکل ہی سے کسی بات کو مان سکتا ہوں چنانچہ حضرات علماء کرام کے ان اطوار و انداز کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں صرف نماز کی غرض سے اور مذہب کا مفہوم ان کے یہاں سوا اس کے کچھ نہیں کہ مراسم عبودیت کو مخصوص اوقات پر مخصوص طریقہ سے ادا کر دیا جائے اور بس، انھیں اس سے بحث نہیں کہ ان کے قلب و روح میں بھی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے یا نہیں اور اس کا نتیجہ قدرتاً یہی ہونا چاہیئے کہ ان کے دلوں میں شقاوت پیدا ہو اور اس پندار کی بناء پر کہ وہ خدا کے بڑے عبادت گزار مقبول بندے ہیں عام لوگوں سے وہ اپنے آپ کو بلند سمجھنے لگیں۔

یہ تھی ابتداء میرے تنفر کی جو مولویوں کی طرف سے مجھ میں پیدا ہوا اور مطالعہ و تجربہ کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ احادیث کا نصاب میرے سامنے آیا اور مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا چونکہ اب مجھ میں غور و فکر کی اہلیت زیادہ پیدا ہو گئی

تھی اس لئے خود میری عقل نے فیصلہ کیا کہ تمام احادیث یقیناً رسول اللہ کا ارشاد نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان میں سے اکثر بالکل فضول خیالات کا مجموعہ ہیں اور جب میں نے اپنے شبہات اساتذہ کے سامنے پیش کئے تو انھوں نے زجر و توبیخ کے علاوہ کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا اور ہمیشہ یہی کہہ کر خاموش کرنا چاہا کہ مذہب میں عقل آرائی کافروں اور ملحدوں کا کام ہے:

یہ تھا سب سے پہلا فتوائے کفر و الحاد جس نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ اگر مولویوں کی جماعت واقعی مسلمان ہے تو میں یقیناً کافر ہوں اور اگر میں مسلمان ہوں تو یہ سب نا مسلمان ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام نام ہے صرف کورانہ تقلید کا، اور تقلید بھی رسول و احکام رسول کی نہیں بلکہ بخاری اور مسلم و مالک وغیرہ کی اور میں سمجھتا تھا کہ حقیقی کیفیت یقین کی اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک ہر شخص اپنی جگہ غور کر کے کسی نتیجہ پر نہ پہونچے۔

محمدؐ کی عظمت کا تصوّر

قصہ مختصر یہ کہ اولین بیزاری اسلامی لٹریچر کی طرف سے مجھ میں احادیث نے پیدا کی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مطالعۂ اسلام کے لئے مجھے "اقوال رسول" نہیں بلکہ "افعال رسول" پر غور کرنا چاہیئے چنانچہ میں نے سیرت نبوی کے متعلق چھان بین شروع کی اور ہر چند سیرت کی کتابوں میں بھی مجھے بڑا حصہ مزخرفات ہی کا نظر آیا (کیونکہ یہاں بھی وہی احادیث و استناد احادیث کا جھگڑا موجود تھا) تاہم میں نے یہ ضرور سمجھ لیا کہ محمدؐ کی ہستی واقعی نہایت عجیب و غریب ہستی تھی اور ایسے پاکیزہ اطوار و خصائل کا انسان بن نہیں سکتا بلکہ پیدا ہوتا ہے اور یہی مفہوم ان کے اور تمام انبیاء کے مبعوث ہونے کا ہے،

اس کے بعد قدرتاً مجھے قرآن کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اس باب میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ قرآن میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ یقیناً رسول کی زبان سے ادا ہوا ہے اور اگر اسے عام مروجہ مفہوم میں خدا کا کلام نہ مانا جائے تو رسولؐ کا کلام ہونے میں تو شک ہو ہی نہیں سکتا اور اس لئے اسلام کے قیمتی مقاصد سمجھنے کے لئے تنہا یہی ذریعہ اختیار کرنا چاہیئے۔

خدا کا تصوّر اس وقت تک خدا کا تصور میرے لئے بالکل مبہم سی چیز تھا لیکن مطالعۂ قرآن کے سلسلہ میں میرے لئے ناگزیر ہو گیا کہ سب سے پہلے خدا کو سمجھوں، لیکن میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ خدا کے سمجھنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جاتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ برسوں اسی حیرانی کے عالم میں گذر گئے اور آخرکار جب میں نے فلکیات کا مطالعہ کیا تو مجھ پر خدا کی حقیقت ظاہر ہوئی لیکن یہ انکشاف حقیقت اس سے زیادہ نہ تھا۔

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست — چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہاں تاب کجاست
دیر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ ست صنم — کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست
اے سمندر بہ ہوس داغ فروش آتش کو — ماہیاں تشنہ بہ بستر یہ دم آب کجاست

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے تصورات، دوزخ و جنت، حشر و نشر وغیرہ کے عقائد، ان سب کا مفہوم میرے لئے کچھ سے کچھ ہو گیا کیونکہ اب مجھے نہ صرف یہ عقائد بلکہ خود مذاہب کا وجود بچوں کا کھیل نظر آنے لگا اور میں نے اس کو خدا کی توہین سمجھا کہ اس کے اور اس کے کاروبار کے متعلق انسانی نفسیات اور دنیا کے اصول زندگی کو سامنے رکھ کر کسی انسانی زبان کے ذریعہ سے اظہار خیال کیا جائے

یہ تھا میرا دوسرا لیکن زیادہ مضبوط قدم لامذہبیت یا لاادریت کی طرف لیکن باوجود ان تمام پریشان خیالیوں اور ذہنی تشویشوں کے رسول کی عظمت ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ جب خدا کی ہستی اتنا زبردست معمّہ ہے جسے رسول و غیر رسول کوئی بھی حل نہیں کر سکتا اور جس کی حقیقی عظمت کا تصور مذاہب کے وجود سے بھی بے نیاز ہے تو پھر قرآن میں جو تمام بیانات خدا اور جزا و سزا وغیرہ کے متعلق پائے جاتے ہیں، ان کی کیا حقیقت ہے اور ان کے اظہار کا مقصود کیا ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا مشکل سوال تھا کیونکہ ایک طرف محمدؐ کی شخصیت تھی جس کے متعلق میرا ایمان ہے کہ ان سے زیادہ سچّا، مخلص اور مکمل انسان ہونا مشکل ہے اور دوسری طرف قرآن کے وہ بیانات جن کا اگر واقعی وہی مفہوم قرار دیا جائے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو پھر خدا، خدا نہیں رہتا بلکہ مشرکوں کا وہ دیوتا ہو جاتا ہے جو انسانوں پر غصّہ بھی کر سکتا ہے۔ ان سے خوش بھی ہو سکتا ہے جس میں جذبۂ انتقام بھی ہے اور ولولۂ لطف و انعام بھی۔

قرآن اور وحی والہام

اس سلسلہ میں میرے لئے ضروری ہوا کہ پہلے میں اس حقیقت پر غور کروں کہ قرآن کو خدا کا کلام کہنا کیا معنی رکھتا ہے، وحی والہام کا کیا مفہوم ہے اور "گفتۂ او گفتۂ اللہ بود" کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے، یہی وہ خیال تھا جس کی بناء پر پچھلے سال میں نے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور جس کے جواب میں ہندوستان کے اکابر علماء کی متفقہ قوت نے "براہین وحی" لکھ کر شائع کی۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو اعتقاداً بغیر کسی حجت و دلیل کے قرآن کو واقعی خدا کا کلام

سمجھتے ہیں یہ کتاب مزید ایقان کا باعث ہوئی ہو لیکن میں نے اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو مجھے مطمئن کر سکتا، البتہ اکابر اعظم گڈھ اور دریاباد کی گالیوں نے اسے دلچسپ ضرور بنا دیا۔

بہر حال اس بحث کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن کے کلام خداوندی ہونے کی حیثیت کو متعین کر لیا جائے۔ اس کے بعد یہ غور کیا جائے کہ رسول اللہ کی تعلیمات کا اصل مقصود کیا تھا، اور پھر قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر 'معقولات' کے نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت بھی پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔

امر اول کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ کسی انسانی زبان کی کتاب کو اسی مفہوم میں خدا کا کلام قرار دینا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا کی ذات ہر نوع کے مادی لگاؤ سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں کلام سے صرف اس کا مفہوم مراد ہوگا، بلکہ (زیادہ صحیح الفاظ میں) وہ طبعی و نفسیاتی کیفیت جس کے زیر اثر ایک شخص بے اختیارانہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی کیفیت کا نام مذہبی زبان میں وحی و الہام، جبرئیل اور روح القدس وغیرہ ہے اس سے انکار ممکن نہیں کہ قرآن کے الفاظ عربی زبان کے الفاظ ہیں اس لئے اگر قرآن کے الفاظ کو کلام الٰہی کہا جائے گا تو ساری عربی زبان کلام خداوندی قرار پائے گی حالانکہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ کسی ملک کی مخصوص زبان کو خدا کی زبان کہا جائے کیونکہ اگر خدا کسی زبان میں گفتگو کر سکتا ہے تو پھر کسی خاص زبان کی قید کیسی، اسے دنیا کی ہر زبان جاننا چاہیئے اور وہ ہر زبان میں قرآن نازل کر سکتا ہے۔

عام مسلمانوں اور مولویوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن، اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے لحاظ سے پہلے ہی لوح محفوظ میں منقوش تھا اور فرشتہ (جبرئیل) یہی محفوظ و منقوش کلام رسول اللہ کو آ کر سناتا تھا اور رسول اللہ انھیں آسمانی الفاظ کو دوہرا دیتے تھے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اگر قرآن کی زبان عربی نہ ہوتی بلکہ کوئی نئی زبان ہوتی تو بھی خیر کچھ کہا جا سکتا تھا، لیکن جبکہ وہ اس زبان میں نازل ہوا تھا جو عام طور پر عرب میں رائج تھی تو اس کے الفاظ کو کیونکر خدائی الفاظ کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال قرآن کو خدا کا کلام اس حیثیت سے تسلیم کرنا کہ اس کا ایک ایک نکتہ ایک ایک لفظ خدا کا بتایا ہوا ہے اور خود رسول اللہ کے عقل و دماغ کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا تو خدا کو اس کے منصب سے گرا کر انسان کی حد تک کھینچ لانا ہے اور رسول کو سطح انسانیت سے بہت نیچے گرا دینا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ خدا کو سمیع و بصیر ماننے کے بعد تو اس کی سماعت و بصارت کی کیفیت کو انسانی سماعت و بصارت سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں لیکن صفت کلام کی بحث میں انسان ہی کی طرح الفاظ کا محتاج قرار دیتے ہیں۔ اگر خدا کی سماعت و بصارت کا مفہوم اس کی عام توجہ و نگرانی قرار دیا جائے تو اس کے نطق یا کلام کا مفہوم کیوں نہ وہ اثر قرار پائے جس سے متاثر ہونے کے بعد ایک انسان والہانہ بے اختیار کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

منصب رسالت

اگر ہم رسول اللہ کی قائم کی ہوئی شریعت اور ان کے بتائے ہوئے اصول اخلاق و معاشرت کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ بالکل خدائی چیز تھی اور خود رسول اللہ کے فہم و فراست اور عزم و ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہ تھا تو رسول کی ذاتی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور ان کی حیثیت محض ایک ایسے

پیام رساں یا قاصد کی سی رہ جاتی ہے جو خود کوئی انفرادیت نہیں رکھتا اور جس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔

اگر رسالت کا منصب کوئی ایسی چیز ہے جو بالکل خدا کے انتخاب پر منحصر ہے (اور خدا کے انتخاب کی کوئی نہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے اور نہ اس سے اس باب میں کوئی سوال ہو سکتا ہے) جس میں خود انسانی سعی و عمل یا غور و فکر کو مطلق دخل نہیں ہے۔ تو پھر یہ بالکل قسمت کی چیز ہوئی اور ممکن تھا کہ محمدؐ کے علاوہ کسی اور کا انتخاب ہو جاتا

رسول کی جو عظمت میرے دل میں ہے (اور میں چاہتا ہوں کہ یہی عظمت ہر مسلمان کے دل میں پیدا ہو جائے) اس کا تعلق خدا اور رسول دونوں کی ذات سے ہے جس کی وضاحت یہاں ضروری ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہر شخص اپنی فطرت اپنے ساتھ لاتا ہے اور یہ اس کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ جو چاہے بن سکے۔ ہر چند دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ محض اپنی کوشش سے انسان نے ایسی راہ اختیار کی جس کے لئے وہ وضع نہ ہوا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اس میں زیادہ کامیاب ہوا ہو اور ایسا ہمیشہ ہوا ہے کہ جس نے اپنی فطری اہلیت کو سامنے رکھ کر اپنا دائرہ عمل قائم کیا سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا اور اسی چیز کو میں خدا کا عطیہ کہتا ہوں۔ کیونکہ "فطری اہلیت" قدرت یا خدا ہی کا عطیہ ہے اور اسی اہلیت کو مذہبی زبان میں بعثت و منصب رسالت کہتے ہیں۔ قرآن میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ "رسول اللہ" مامور من اللہ تھے، یعنی اللہ کی طرف سے انھیں حکم دیا گیا تھا یا متعین کئے گئے تھے ــــ ہدایت و اصلاح کے لئے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ صحیح تعبیر رسالت و بعثت کی اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی شخص کا فطرت کی طرف

سے کوئی خاص اہلیت یا ملکہ لے کر پیدا ہونا گو یا خدا کی طرف سے ماموری ہے کہ وہ اپنے اس فطری ودیعت سے کام لے اور چونکہ رسول اللہ نے اس ماموری یا اہلیت سے فائدہ اٹھایا اس لئے وہ بہت کامیاب رسول ثابت ہوئے۔

میرے اس بیان سے غالباً یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ منصب رسالت میں خدا یا قدرت کا کتنا دخل تھا اور خود رسول کی سعی و عمل کا کس قدر اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے کیا تعلق تھا۔

اب آیئے رسول اور قرآن کے تعلق پر غور کریں۔

رسول اور قرآن کا باہمی تعلق

جنھوں نے تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ رسول اللہ کی پیدائش کے وقت اہل عرب کی اخلاقی حالت کتنی گری ہوئی تھی، اور دنیا کی کوئی غیر انسانی و غیر شریفانہ حرکت ایسی نہ تھی جس کے وہ مرتکب نہ ہوتے ہوں، آپ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی قوم کی اس گری ہوئی حالت کا بہت اثر لیا اور یہ اثر لینا صرف اس بناء پر تھا کہ قدرت نے آپ کے دل و دماغ میں غیر معمولی صلاحیت سوچنے سمجھنے کی ودیعت کر دی تھی جسے ہم مذہبی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو خدا نے منصب نبوت کے لئے چن لیا تھا۔

آپ نے سوچا کہ قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان برائیوں کی اصلاح کریں اور قوم کے تمام افراد کو اس پستی سے نکالیں، چنانچہ آپ نے اس مسئلہ پر رات دن کی تنہائیوں میں غور کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ آپ کے تاثرات اس قدر شدید ہو گئے کہ انھوں نے ایک آہنی عزم کی صورت اختیار

کھلی اور آپ نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وہ اپنی قوم کے اصلاح کی کوشش ضرور کرینگے

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ایسے خراب ماحول میں پیدا ہونے کے بعد آپ میں ایسا پاکیزہ جذبہ کیونکر پیدا ہوا۔ لیکن اس کا جواب میں وہی دوں گا جو ابھی ظاہر کر چکا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت نے آپ کے دماغ ہی میں پاکیزہ بات سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ علاوہ اس کے تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ماحول سے جنگ کرنے والی ہستیاں قدرت نے ہمیشہ پیدا کی ہیں کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو انسان کے قوائے ذہنی کبھی نشو ونما نہ پاتے، اسی کے ساتھ اگر ہم توارث نسلی کے اصول کو سامنے رکھیں تو علمی حیثیت سے بھی یہ بات بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ نہایت ہی شریف و معزز خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور آپ کے آباؤ اجداد میں بعض ایسے نفوس بھی گذر چکے تھے جنھیں اس قسم کا مرتبہ رشد و ہدایت مل چکا تھا۔

بہر حال اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہنی صلاحیت لے کر آئے تھے، اور سالہا سال کی غور و فکر کے بعد آپ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کر کے رہیں گے اور دنیا کی کوئی مخالفت انھیں اس ارادے سے باز نہ رکھ سکے گی۔ آپ کے اس عزم کا ثبوت آپ کے واقعات زندگی سے بخوبی مل سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی جسمانی و ذہنی تکلیف ایسی نہ تھی جو آپ کو نہ پہنچائی گئی ہو۔ بڑی سے بڑی رشوت ایسی نہ تھی جو آپ کے سامنے پیش نہ کی گئی ہو لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی آپ کا قدم متزلزل نہیں ہوا۔ وہی کر کے رہے جو سوچ چکے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی جد و جہد کی ایسی غیر معمولی مثالیں ہم کو تاریخ کے صفحات میں اور بھی ملتی ہیں لیکن ان میں اکثر کا تعلق مادی خواہشات سے تھا اور

اسی لئے جب یہ خواہشیں پوری ہوگئیں تو آخر کار دنیا کے لئے عذاب بن کر رہ گئیں، چنگیز، ہلاکو، ہنی بال، سکندر، نپولین ان میں سے ہر ایک بڑے پختہ ارادے کا انسان تھا اور ان کی کامیابیاں اس میں شک نہیں تنہا انہیں کے ذاتی جدوجہد اور عزم صمیم کا نتیجہ تھیں لیکن ان کوششوں کا مقصود صرف مال وجاہ کا حاصل کرنا تھا۔ اور ان کا یہی پست مقصد زندگی ان کے زوال کا باعث ہوا۔

انسان کے ذہن کا بلندی کے اس درجہ پر پہونچ جانا کہ ذاتی یا خاندانی مفاد کا خیال تک کبھی اس کے دل میں نہ آئے انتہائی کامیابی کے وقت بھی جذبۂ انتقام اس میں پیدا نہ ہوا۔ دشمنوں پر قابو پا جانے کے بعد بھی لطف ومحبت وعفو ودرگذر سے کام لے اور پھر با وجود ان تمام روحانی بلندیوں کے دنیا میں اسباب زندگی بسر کرنے کی بھی ایسی راہیں بتا جائے جو واقعی دنیا کی نجات کی ضامن ہوں، یقیناً بہت بڑی چیز ہیں اور اگر ان تمام خصوصیات کا کسی ایک ہستی میں اجتماع قدرت کا معجزہ ہو سکتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس معجزہ کا ظہور محمدؐ کی ذات پر ختم ہوگیا اور اگر دنیا نے کبھی انسانیت کبریٰ کا مجسمہ تیار کیا تو وہ محمدؐ ہی کا ہوگا کسی انسان کا نہیں کسی انسان اعلیٰ (Superman) کا نہیں، بلکہ ایک ایسے انسان اور انسان کا جس کے حدود انسانیت، حدود الوہیت سے ٹکر کھاتے ہیں اور ازل سے ابد تک فضائے فطرت کو معمور کئے ہوئے ہیں ؎

جوہر اعتبار غیب شہود — اصل کیفیت خفا ونمود
ازل افسانۂ بدایت او — ابد اندیشۂ نہایت او

ظاہر ہے کہ جو شخص اتنے بلند مقصد کو لے کر اٹھا ہوگا اور جس نے اپنے جسم و جان کو اس کی تکمیل کے لئے تج دیا ہوگا۔ اس کے انہماک کا کیا عالم رہا ہوگا اس کے دل و دماغ کیسی والہانہ کیفیت سے معمور رہے ہوں گے۔ رسول اللہ کی سیرت کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب آپ غار حرا کے سکون و تنہائی میں اپنے ابنائے وطن کی دردناک حالت پر غور کر کے باہر تشریف لاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ پر کوئی نہایت گہری کیفیت طاری ہے اور آپ کا سینہ جذبات کی شدت سے پھٹا جا رہا ہے، لیکن آپ ضبط سے کام لیتے اور پھر غور و فکر میں مصروف ہو جاتے یہاں تک کہ زندگی کا بڑا حصہ اسی عالم میں گذر گیا اور آخرکار وہ وقت آیا کہ یہ سیلاب اُبل پڑا یہ چشمے پھوٹ نکلے اور جذبات و تاثرات کے طوفان نے الفاظ کی صورت اختیار کر لی اور انھیں الفاظ کا مجموعہ "قرآن" ہے، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ الفاظ معمولی انسان کے الفاظ تھے۔ یہ الفاظ دراصل کیفیات روحانی کی مسموعی صورت تھے، ولولۂ رشد و ہدایت کی روح القدس کا مظہر تھے، جذبۂ اصلاح و تزکیۂ اخلاق کے جبرئیل کی زبان تھے۔ یعنی وہ نطق ہمایونی تھا جو بغیر مرتبۂ نبوت ملے ہوئے محمدؐ کو عطا ہی نہ ہو سکتا تھا اور اس لئے یقیناً وہ خدا کا الہام تھا۔ اس کی وحی تھی، اس کا کلام تھا جسے محمدؐ نے سنایا اور جس کو سُن کر دنیا محوِ حیرت ہو گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی نئی زبان تھی۔ نئے الفاظ تھے بلکہ اس لئے کہ ان کے اندر نئی روح تھی، نیا اثر تھا۔ ایک قوت تھی سر تسلیم خم کرا دینے والی، ایک اعجاز تھا۔ حیران و مبہوت بنا دینے والا۔

قرآن کے اسالیب بیان

اگر آپ قرآن کا بغور مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ کے تاثرات کے لحاظ سے

اس کا انداز بیان بھی بدل گیا ہے، کہیں تو بالکل (SOLILOQUY) ہے یعنی رسول اللہ نے خود اپنے نفس سے خطاب کیا ہے۔ کہیں انھوں نے خدا کو مخاطب کر کے اپنے جذبات فدویت و تشکر کا اظہار کیا ہے کسی جگہ اپنے ابناء قوم و اپنے اعزہ و احباب اور اپنے دشمنوں کو مخاطب کیا ہے اور کہیں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے گویا خدا خود کچھ فرما رہا ہے اور ان مختلف اسالیب بیان سے صرف یہی نہیں کہ ہم رسول اللہ کے ذہنی تاثرات کی صحیح تاریخ مرتب کر سکتے ہیں بلکہ اس نتیجہ پر بھی پہونچتے ہیں کہ رسول اللہ کا تنہا مقصود کسی نہ کسی طرح لوگوں کی درستی اخلاق کی طرف متوجہ کرنا تھا اور اسی مقصود کو مختلف طریقوں اور مختلف اسالیب بیان سے پورا کیا گیا ہے۔

جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں اس سے پہلے ہی عرب میں فن خطابت و شاعری پورے عروج پر پہونچ چکا تھا، کاہنوں کی فصیح و بلیغ تقریریں صرف ادب و انشاء بلکہ اپنے اثرات کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ اہل عرب جاہل فرور تھے لیکن ملک کی جغرافی خصوصیات، وہاں کے ریگزاروں کوہستانوں اور ان کی صحرائی طرز معاشرت نے انھیں دنیا کی تلخ ترین حقیقتوں کو بھی برداشت کرنے اور ان پر غور کرنے کا اہل بنا دیا تھا اور ان کے ذہن و فکر کی تمام راہیں ایک پتھریلی قسم کی ٹھوس کیفیت اپنے اندر رکھتی تھیں اور چونکہ تہذیب و تمدن کے غیر حقیقی تکلفات سے وہ آشنا نہ تھے اس لئے زندگی کی سچی سادگی ان کے شعر و ادب میں بھی منتقل ہو گئی تھی اور اسی سے وہ متاثر ہوتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسے زمانہ میں ایسی قوم کی اصلاح کے لئے کوئی ایسا لٹریچر پیش نہیں کیا جا سکتا تھا جو ان کی ذہنی رفتار کے مطابق نہ ہوتا اور حقائق علمی و تاریخی

سے تعلق رکھتا خطابت ہی سے وہ متاثر ہو سکتے تھے اور ان کی اصلاح کے لئے یہی طریقہ اختیار کرنا ضروری تھا۔ پھر چونکہ رسول اللہ ایسے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت اور پاکیزگی زبان کے لحاظ سے بہت شہرت رکھتا تھا۔ اس لئے آپ کے تمام اقوال و ارشادات کو عربوں کے ذوق کے لحاظ سے یوں بھی بہت بلند ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن قرآن کی زبان میں چونکہ علاوہ آپ کے خاندانی فصاحت و بلاغت کے آپ کے وہ بلند تاثرات بھی شامل تھے جو خدا کے منزہ تصور میں ڈوب جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتے ہیں، اس لئے قرآن کا انداز خطابت اس وقت کی عام مروجہ خطابت سے کہیں زیادہ بلند چیز تھا اور اسی لئے اس وقت کے بڑے بڑے کاہنوں، خطیبوں اور شاعروں نے اس کو ادبی معجزہ سمجھا جیسا کہ ابھی میں نے ظاہر کیا۔ قرآن کا انداز بیان ہر جگہ ایک سا نہیں ہے بلکہ وہ رسول اللہ کے تاثرات کے لحاظ سے ہر جگہ بدلتا گیا ہے لیکن کسی جگہ ان لوگوں کے ذہن و عقل سے متجاوز نہیں ہوا جن سے خطاب کیا گیا ہے اور قرآن کی سب سے بڑی بلاغت یہی ہے۔

نزول قرآن کا حقیقی مقصود

اس سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ رسول اللہ کا مقصود انسان کے اخلاق درست کرنا بھی تھا اور ذہنی ترقیوں کی طرف مائل کرنا بھی۔ لیکن زیادہ اہم اخلاق کی درستی ہی تھی کیونکہ بغیر اس کے ذہنی ترقیاں بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے یقیناً اسلام ہی دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے روح و مادہ دونوں کی ترقی کی تعلیم ایک ساتھ پیش کی (اور ان دونوں کے صحیح امتزاج کی وہ صورتیں بتائیں جو اس سے قبل کسی مذہب میں نہ پائی جاتی تھیں) اور اس نے ان کی تعلیمات کا بڑا حصہ

اسی کے لئے وقف ہے پھر ان حالات میں، قرآن کا مطالعہ کسی اور نقطۂ نظر سے کرنا یقیناً اصولی غلطی ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں بہت جگہ انسان کو تعقل و تدبر، غور و فکر تعلیم و تعلم اور کسب فضل و کمال کی ہدایت کی گئی ہے لیکن خود کوئی مخصوص علمی تاریخی یا فنی نظریہ اس نے پیش نہیں کیا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ علمی تحقیقات اور جستجو نے حقائق کے ساتھ ساتھ علمی و فنی نظریئے بدلتے رہتے ہیں اور ان کے متعلق کسی زمانہ میں کوئی لٹریچر اس دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا کہ وہ "حرف آخر" کی حیثیت رکھتا ہو اور قرآن کو "حرف آخر" ہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ اور وہ یقیناً یہی حیثیت رکھتا ہے بشرطیکہ ہم ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام لے کر اس کے صحیح مقاصد و اصول سے ہٹ کر اس کا مطالعہ نہ کریں۔

بعض حضرات اس اعتقاد کے زیر اثر کہ قرآن "جامع الکل" کتاب ہے، موجودہ علمی مسائل کا حل بھی اس میں تلاش کرتے ہیں، عہد حاضر کے فنی نکات بھی اس میں ڈھونڈ نکالتے ہیں، یہاں تک کہ فلکیات کی پیچیدہ ریاضی بھی انھیں قرآن میں مل جاتی ہے، لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ اگر کل یہ نظریئے بدل گئے جو ایک حد تک یقینی امر ہے تو وہ پھر کیا تاویل کریں گے اور قرآن آخر کب تک اس دماغی و ذہنی ورزش کا شکار رہے گا۔

اس لئے میری رائے میں قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ دنیا کے تمام مسائل اور ان کے جزئیات سے بھی بحث کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ قرآن اور رسول دونوں کی توہین بھی ہے۔

"رطب و یابس" دونوں کا "کتاب مبین" میں ہونا بالکل درست ہے، لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ روحانی و مادی دونوں قسم کی صحیح ترقی کے جو اصول ہو سکتے ہیں وہ سب اس میں پائے جاتے ہیں

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے دین و دنیا دونوں کو یکساں اہمیت دی ہے اور کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ انسان کار و بار عالم سے منہ موڑ کر عضو معطل ہو کر رہ جائے اس نے انسان کو سراپا سعی و عمل بننے کا درس دیا، اس نے ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے کے لئے غور و فکر تعقل و تدبر کی تاکید کی یہاں تک کہ اس نے اسلام کا معیار ہی یہ قرار دے دیا کہ اس کا ماننے والا کبھی پست حالت میں نہیں رہ سکتا (انتم الاعلون ان کنتم مومنین) لیکن اسی کے ساتھ چونکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ محض دنیاوی ترقی کو مقصد حقیقی قرار دینا کبھی نوع انسانی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے اخلاق بھی بلند نہ ہوں اس لئے اس نے دنیاوی ترقی کی ضروری شرط یہ قرار دی کہ انسان پہلے یہ سمجھ لے کہ وہ دنیا میں فساد برپا کرنے نہیں آیا ہے بلکہ اس کا فرض تمام انسانی برادری میں رشتۂ اخوت و مساوات قائم کر کے امن و سکون کی اشاعت کرنا ہے اور اس کی صداقت روز بروز زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے،

آج دنیا ترقی کی جن راہوں سے گزر رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اب آدمی انسان ہونے سے زیادہ کچھ کچھ خدا بھی ہو چلا ہے لیکن یہ خدا یزداں نہیں ہے بلکہ اہرمن ہے اور اس کی ذہنی ترقیاں بجائے اس کے کہ عالم میں امن و سکون پھیلائیں اس کو فتنہ و فساد کی آگ سے تباہ کرتی

جارہی ہیں۔ برخلاف اس کے اسلام نے جس ترقی کا درس دیا وہ کرۂ ارض کو "جنات عدن" بنادینے والا تھا اور اسی لئے رسول اللہ کو اس تعلیم کا صحیح مظہر قرار دیکر "رحمۃ للعالمین" کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور آپ نے دین و دنیا کی فلاح و ترقی میں جو توازن پیدا کرنا چاہا اس کے سمجھنے کے لئے آپ کا صرف ایک ارشاد کافی ہے اور وہ یہ کہ "دنیا کے کاموں کو اس طرح انجام دو گویا تمہیں کبھی مرنا ہی نہیں اور دین (یعنی روح و اخلاق) کے کام اس طرح کرو گویا تمہیں ابھی مرجانا ہے"

الغرض قرآنی تعلیمات کا اوّلین مقصد اخلاق کی درستی تھی اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسی مدعا کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے لیکن چونکہ کسی قوم کی اصلاح آسان کام نہیں، خصوصیت کے ساتھ عرب جیسی جاہل و متشدد قوم کہ ان کو سمجھانا گویا پتھر میں جونک لگانا تھا اس لئے اس مقصد کی تکمیل میں آپ نے وہ طبعی اصول اختیار کئے جن کی ناکامی کا امکان ہی نہ تھا۔

قرآنی تعلیم نفسیاتی نقطۂ نظر سے

نفسیات کا مسلّمہ نظریہ ہے کہ تعلیم و تربیت میں رجحانات کی رعایت بہت ضروری ہے کیونکہ رجحانات تاریخی و جغرافی ماحول کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں اور ماحول کے نتائج میں ردعمل پیدا کر کے کسی متضاد کیفیت کو عرصہ تک قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ اگر ذہنی رواداری سے کام نہ لیا جائے اور آہستہ آہستہ اس کا عادی نہ بنایا جائے۔ اب آپ تعلیمات قرآنی کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بالکل اسی اصول سے کام لیا گیا ہے

عربوں میں بت پرستی کی شدّت نے ایسا ذہنی جمود و تعطل پیدا کر دیا تھا کہ ان کی انسانی "انفرادیت" اور "اجتماعی ہئیت" دونوں محو ہو چکی تھیں اور ان کی

حالت بالکل بہائم کی سی تھی جو بتوں کے وہمی و فرضی چابک سے ہانکے جا رہی تھی۔ ان کی پست حالت کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ نے انھیں توحید کی طرف لانا چاہا جسے وہ بالکل بھول چکے تھے لیکن اس کی ترکیب یہ نہ تھی کہ ان کے سامنے توحید کا فلسفہ پیش کیا جاتا بلکہ اس کے لئے ایک سخت ضرب کی ضرورت تھی تاکہ ان کی ذہنی رفتار کا رخ دفعتاً بدل جائے اور اسی لئے رسول اللہ نے نہایت صاف الفاظ میں بتوں کی برائی شروع کر دی اور آخرکار ان کو توڑے بغیر باز نہ رہے لیکن چونکہ نفسیاتی حیثیت سے یہ بات ان لوگوں کے لئے سخت ردعمل پیدا کرنے والی تھی اور اس کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے کفار و مشرکین کے رجحانات کی کوئی نہ کوئی رعایت ضروری تھی اس لئے ان کے عظیم بتکدہ کی عزت و اہمیت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا اور پرستش گاہ ہونے کی حیثیت سے، کعبہ کعبہ ہی بنا رہا۔ ورنہ خدا اور توحید کا جو پاکیزہ و بلند تصور اسلام نے پیش کیا ہے وہ کعبہ و حطیم کعبہ سب سے بے نیاز ہے۔ جب رسول اللہ اپنے اس بنیادی مقصد کو حاصل کر چکے تو اپنے ابناء وطن کی معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کے لئے انھوں نے ہمیشہ نفسیاتی اصول اختیار کیا، اور کبھی کوئی ایسا طریقہ کام میں نہیں لائے جو لوگوں کے عقول و اذہان اور ان کی اہلیت تاثر کے لحاظ سے غیر مفید ثابت ہوتا۔ شادی کے باب میں عربوں کے اصول اس قدر ناپسندیدہ تھے کہ انھوں نے عورتوں کو بازار کی جنس سے بھی زیادہ کمتر حیثیت کی چیز بنا دیا تھا اور اس طرح گویا انسانیت کا نصف حصہ بالکل تباہ و برباد ہوا جا رہا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس میں ان کی غیر محدود آزادی کو چار تک

محدود کرکے اس اخلاقی ناسور کو بہت کچھ بھر دیا، ممکن تھا کہ آپ بیک وقت صرف ایک ہی بیوی رکھنے کی اجازت دیتے۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ اس وقت کے مصالح کے لحاظ سے یہ مناسب ہوتا یا نہیں اتنی شدت شاید لوگوں کو گوارا نہ ہوتی اور پھر مطلق اصلاح نہ ہوسکتی۔ لونڈی غلاموں کے باب میں رسول اللہ کی بلند تعلیم کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آزاد اور غلام کے درمیان بحیثیت انسان ہونے کے آپ نے کوئی فرق باقی نہیں رکھا اور گو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے آپ کلیتاً اس کا استیصال نہ کرسکے لیکن اپنے قول و عمل سے یہ ضرور بتلا گئے کہ دنیا میں کوئی انسان غلام بننے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے اور اس رسم کو دنیا سے بالکل اٹھ جانا چاہیئے۔

شراب کا استعمال عرب میں نہایت بدتمیزی سے جاری تھا لیکن اس کا استیصال بھی آہستہ آہستہ تدریج کے ساتھ کیا۔ پہلے صرف شراب کی برائیاں ظاہر کیں اور کچھ لوگوں نے اس سے متاثر ہوکر اسے ترک کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ نشہ کی حالت میں نماز ادا نہ کرو، یہ سن کر کچھ اور لوگوں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ جب حالات اور زیادہ موافق ہوگئے تو ترک مےخواری کا حکم نافذ کر دیا۔ الغرض رسول اللہ نے اصلاح اعمال و تزکیۂ اخلاق کے لئے جو کچھ اور جس طرح کیا وہ اس وقت کے ماحول، اہل عرب کی فطرت اور اپنے ذرائع و مصالح کو سامنے رکھ کر کیا اور اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔

قرآن کی تقسیم مطالب کے لحاظ سے

قرآن اپنے مطالب کے لحاظ سے کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک حصہ عبادات یا تعلیم اخلاق سے متعلق ہے، دوسرا معاملات سے، تیسرے میں قصص

حکایات درج ہیں اور چوتھے میں اعتقادات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز پہلے دو حصے ہیں اور باقی دو حصے محض تدبیر و ذرائع اور امورِ کار کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اگر ایک شخص قصص قرآنی اور معتقدات کو صحیح ماننے کے بعد عبادات و معاملات میں ہدایات قرآنی کا پابند نہ ہو تو وہ کبھی سوسائٹی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر قصص و معتقدات کو نہ مانتے ہوئے وہ عبادات و معاملات میں احکام الٰہی کا پابند ہے تو ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن میں یقیناً وہ ایک عضو مفید کی حیثیت رکھنے والا سمجھا جائے گا۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے وہ تمام اجزاء جو اسرائیلیات اور حیات بعد الموت سے تعلق رکھتے ہیں، اصل مدعا کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اخلاق کی درستی کی طرف مائل کیا جائے اور اس اصلاح پر انھیں مضبوطی سے قائم رکھا جائے۔

انسان فطرتاً طامع و خود غرض واقع ہوا ہے اور اسی کے ساتھ وہ ان معاملات و واقعات سے بھی بہت متاثر ہوتا ہے جو اس کی ذاتی اغراض کے منافی یا معاون ہوتے ہیں۔

بعثت نبوی کے وقت عرب میں یہود و نصاریٰ کی بہت سی روایات رائج تھیں اور مابعد الطبیعیاتی عقائد بھی قریب قریب وہی پائے جاتے تھے جو قرآن میں مذکور ہیں لیکن ان روایات و معتقدات سے جو اعتبار و بصیرت یا ولولۂ عمل پیدا ہونا چاہیے وہ بالکل مفقود تھا۔ لوگ سنتے تھے اور انھیں اساطیر الاولین کہہ کر ٹال دیتے تھے، تاہم یہ ضرور تھا کہ ان کی یہ بے پروائی جحود و انکار نہیں، بلکہ محض غفلت و سہل انگاری کا نتیجہ تھی۔ انھیں اپنی بدمستیوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان روایات

ومعتقدات کی روح پر غور کرتے اور ان کے اخلاق کی پستی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ وہ اپنی موجودہ حالت و زندگی میں کسی بلند تغیر کا امکان ہی نہ پاتے تھے۔

پھر ان حالات میں یہی مناسب تھا کہ بھولی ہوئی باتیں یاد دلاکر ان کو اصلاح کی طرف مائل کیا جائے اور کوئی ایسی نئی چیز ان کے سامنے نہ لائی جائے جس کو ان کے دماغ کسی طرح قبول ہی نہ کر سکتے تھے اگر ان روایات و معتقدات کی جگہ ان کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ اور نوامیس فطرت کا اصول سمجھایا جاتا یا اخلاق کے ان بلند نظریوں کو پیش کیا جاتا، جو انفرادی فائدہ اور اجر و ثواب کے خیال سے ہٹ کر، محض اجتماعیت اور خالص احساس فرض شناسی سے تعلق رکھتے ہیں تو یقیناً ان پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ ہرگز تعلیمات اسلامی کی طرف مائل نہ ہوتے۔

عرب قوم اپنے جذبات کے لحاظ سے بڑی متشدد قوم تھی، وہ اگر کسی کی دشمن ہو جاتے تھے تو بیرحمی کا کوئی طریقہ ایسا نہیں جو انتقام لینے کے لئے صرف نہ کر دیتے ہوں اور ذرا سی بات پر سالہا سال تک لڑتے جھگڑتے نہ رہتے ہوں۔ الغرض افادی حیثیت سے ان کے مشاغل زندگی کچھ نہ تھے اور سوا اس کے کہ وہ اپنی قوتیں صرف جسمانی و شہوانی لذتوں کے حصول میں صرف کر دیں، کچھ نہ جانتے تھے۔

ان کے عیش و مسرت کا انتہائی تخیل، دودھ، شہد، شراب اور عورت سے آگے نہ بڑھتا تھا اور ان کی ایذا پسندی کا ابتدائی تخیل بھی اس سے کم نہ تھا کہ دشمن کو ویسی ہی تکلیف پہونچائی جائے جیسے آگ میں ڈال دینے سے کسی کو پہونچ سکتی ہے اس لئے اگر انھیں اچھی باتوں کی طرف یہ کہہ کر مائل کیا جاتا کہ اس کے عوض میں انھیں ایک دائمی ابدی راحت حاصل ہوگی اور بری باتوں سے انھیں یہ کہہ کر ہٹایا جاتا کہ اس کی سزا انھیں

روحانی کرب و تکلیف کی صورت میں ملے گی تو وہ اس بیان سے قطعاً متاثر نہ ہوتے کیونکہ ان کے ذہن و عقل نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ وہ لذّت و الم کے اس بلند فلسفہ کو سمجھ سکتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلام اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔

عذابِ قبر، نکیرین، حشر و نشر، میزان و صراط، ہاویہ و جہنم، طوبیٰ و فردوس، کوثر و سلسبیل، حور و قصور وغیرہ کا بیان جس انداز سے قرآن میں کیا گیا ہے، وہ سب عربوں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے جن مذاہب نے اس نوع کا اندازِ بیان اختیار کیا تھا انھوں نے بھی انسان کی اسی عام ذہنیت کو سامنے رکھ کر حساب و کتاب اور سزا و جزا کی یہی ساری صورتیں پیش کی تھیں۔

اس سلسلہ میں یہ سوال فوراً سامنے آتا ہے کہ انبیاء نے جو مابعدالطبیعیاتی عقائد پیش کئے تھے وہ ان کو واقعی ویسا ہی سمجھتے تھے جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا یا صرف اصلاح کی غرض سے مصلحتاً یہ اندازِ بیان اختیار کیا تھا۔

اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں، اگر ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی سے کام نہ لیا جائے۔

اس سے تو شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ انسان کی ذہنی و عقلی ترقیاں تدریج کے ساتھ ہوئی ہیں اور انبیاء و مصلحین قوم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو علمی حقائق آج دریافت ہوئے ہیں وہ آج ہی دریافت ہو سکتے تھے۔ اس سے قبل ان کا علم ناممکن تھا اس لئے رسول اللہ سے قبل انبیاء نے جن عقائد کی تعلیم دی تھی، وہ یقیناً ان کو حقیقت سمجھتے تھے اور کوئی مصلحت ـــــ ان کے سامنے نہ تھی لیکن قرآن و احادیث میں البتہ بعض بیانات ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ کے ذہن میں دوزخ و جنّت کا مفہوم ادیانِ سابقہ کے سمجھے ہوئے مفہوم سے مختلف تھا۔ یہ موضوع ایک بسیط گفتگو چاہتا ہے تاہم اجمالاً

بعض تصریحات کا ذکر یہاں بھی ضروری ہے۔

جنت اس میں شک نہیں کہ فردوس کے بیان میں قرآن بھی بہت سی باتیں ایسی پیش کرتا ہے جن کا تعلق مادی دنیا اور جسمانی لذتوں و راحتوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ انداز بیان یقیناً تمثیلی ہے اور جس کا ثبوت قرآن و حدیث دونوں سے ملتا ہے۔

سورۂ سجدہ میں بُرے اور اچھے اعمال کی سزا و جزا کا ذکر کرتے ہوئے نعائم جنّت کی حقیقت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی ہے۔

"فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین جزآء بما کانو یعملون۔"

یعنی کوئی اس حقیقت کو نہیں جان سکتا کہ اچھے کام کرنے والوں کی جزا کس کس طرح ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچائے گی۔

ظاہر ہے کہ آنکھوں کی ٹھنڈک سے یہاں ظاہری آنکھ کی ٹھنڈک مراد نہیں بلکہ اس سے مقصود دل و دماغ اور قلب و روح کے سکون کو ظاہر کرنا ہے۔

سورۂ محمدؐ میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جنت کے متعلق جو بیانات پیش کئے جاتے ہیں وہ سب تمثیلی ہیں۔

"مثل الجنۃ التی وعد المتقون، فیہا انہار من ماء غیر آسن وانہار من لبن لم یتغیر طعمہ، وانہار من خمر لذۃ للشاربین وانہار من عسل مصفی ولہم فیہا من کل الثمرات۔"

یعنی پرہیزگاروں کے لئے جو وعدہ کیا گیا ہے کہ اُن کے لئے جنت میں دودھ شراب اور شہد کی نہریں ہوں گی لیکن یہ سب تشبیہات ہیں۔

رسول اللہ کی ایک حدیث جسے بخاری نے نقل کیا ہے اس مسئلہ کو اور زیادہ صاف کر دیتی ہے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ نعایم جنت کی حقیقت کیا ہے تو آپ نے

جواب دیا کہ وہ لذتیں ایسی ہیں کہ:۔

"مالا عین رأت ومالا اذن سمعت وما خطر علی قلب بشر"

نہ کسی آنکھ نے آج تک ان کو دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان کا ذکر سنا ہے اور نہ انسان ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔

تلاش سے متعدد ایسی آیات واحادیث پیش کی جا سکتی ہیں جن سے جنت کا صحیح مفہوم متعین ہو سکتا ہے۔

دوزخ جنت کی طرح دوزخ کا مفہوم بھی قرآن میں مادیات سے تعلق نہیں رکھتا اور اس کے ثبوت میں غالباً قرآن میں صرف ایک آیت کو پیش کرنا کافی ہوگا جس میں آتش دوزخ کی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ"

"یعنی دوزخ کی آگ وہ خدائی آگ ہے جو انسان کے دلوں پر مستولی ہوتی ہے"

اگر دوزخ کی آگ سے یہی دنیا کی آگ مراد ہوتی تو اس کو خدا سے منسوب کر کے نار اللہ نہ کہا جاتا، اور نہ یہ کہ وہ دلوں سے تعلق رکھتی ہے، ظاہر ہے کہ دل کی آگ وہی ہو سکتی ہے جو انسان کو روحانی کرب میں مبتلا کر دے اور ظاہری آگ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔

دیگر معتقدات دوزخ وجنت کی طرح اور تمام عقائد جو میزان، صراط، حشر ونشر اور ملائکہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی سب دوآتشہ سے علیحدہ اپنا مفہوم جداگانہ رکھتے ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات خود قرآن

سے ثابت ہو سکتی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام میں حیات بعد الموت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ ادیان سابقہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور اس سلسلہ میں تقریباً تمام انھیں عقائد کو پیش کیا گیا ہے جو اسلام سے قبل رائج تھے لیکن جیسا کہ میں اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں قرآن میں ان کو حقائق کی صورت سے نہیں بلکہ تمثیل و تعبیر کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ عام ذہن انسانی مادیات سے ہٹ کر کوئی روحانی تصور جزا و سزا کا قائم نہیں کر سکتا اس لئے اس کو سمجھانے کے لئے ضروری تھا کہ مثال میں دنیا کی وہی چیزیں پیش کی جاتیں جن کو انسان روز دیکھتا رہتا ہے اور وہ جانتا تھا کہ جب کوئی شخص جرم کرتا ہے تو حکومت اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے گرفتار کراتی ہے۔ اس کے اعمال کا احتساب کرتی ہے اور جب جرم ثابت ہو جاتا ہے تو نوعیت جرم کے لحاظ سے سزا دی جاتی ہے اور اگر آپ مذاہب کے مابعد الطبیعیاتی عقائد کا تجزیہ کریں گے تو وہ سب اسی دنیاوی طریق احتساب و سزا کی مختلف صورتیں نظر آئیں گی۔

پھر اگر رسول اللہ بزرگوں کی اس عام ذہنیت کا خیال نہ کر کے عذاب ثواب یا لذت و الم کا وہ فلسفہ پیش کرتے جس کا تعلق روحانی زندگی سے ہے تو یقیناً کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوتا۔

یہی حال قصص و روایات کا ہے کہ قرآن قطعاً اس سے بحث نہیں کرتا کہ وہ صحیح ہیں یا غلط، بلکہ انھیں محض اعتبار و بصیرت کے لئے پیش کرتا ہے تاکہ لوگ انھیں سنیں اور عبرت حاصل کریں۔

احادیث

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ نے اپنے دوران رسالت میں لوگوں سے خدا جانے کتنی باتیں کہی ہوں گی لیکن چونکہ قرآن کی طرح آپ کے اقوال کو محفوظ رکھنے کا طریقہ رائج نہ تھا اس لئے آج ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے کس سے کب، کیا فرمایا۔ اور اگر کوئی آپ کے کسی قول کی کوئی نقل بھی کرے تو یہ اعتبار کیونکر آسکتا ہے جو بات بیسوں آدمیوں کی وساطت سے نقل در نقل ہو کر ہم تک پہونچی ہے وہ واقعی وہی ہے جو رسول اللہ نے فرمائی تھی۔

احادیث کے نقل و جمع کرنے کا رواج بہت بعد میں ہوا ہے اور ہرچند جامعین احادیث نے اس باب میں بڑی چھان بین کی ہے اور "اسماء الرجال" کا استقادی فن ہی اس سلسلہ میں علیحدہ قایم ہو گیا، پھر بھی کتب احادیث میں "خرافیات" کا بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

رسول اللہ کی رحلت کے بعد جب حکومت اسلام کے سامنے نئے نئے مسائل آئے تو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق رسول اللہ کے اقوال و ہدایات معلوم کئے جائیں اور ایسے لوگوں کی جستجو ہوئی جن کو آپ کے ارشادات کا علم ہو۔ پھر چونکہ اسلام کی حیثیت اب خالص مذہبی نہ رہی تھی بلکہ اس میں سیاسی مصالح اور ذاتی و جماعتی اغراض بھی شامل ہو گئے تھے اس لئے خلفاء چاہتے تھے کہ انھیں کی خواہشوں کے مطابق احادیث میسر آئیں۔ اور اس طرح بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں وضع احادیث کی ٹکسالیں قائم ہو گئیں اور لوگوں نے طمع و خوف کے زیر اثر لاکھوں حدیثیں اپنی طرف سے گھڑ کر رسول اللہ سے منسوب کر دیں، اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ خلفاء وقت کے اغراض پورے ہو گئے لیکن اسلام کے صحیح خط و خال بالکل چھپ گئے اور لوگ اسلام کا مطالعہ بجائے قرآن کے احادیث سے کرنے لگے اور پھر انھیں حدیثوں کی بنیاد پر مذہبی کتابیں تصنیف ہونے

گئیں، یہاں تک کہ لغویات و مزخرفات کا ایک انبار لگ گیا اور اسی انبار کو سامنے رکھ کر اسلام پر اعتراضات ہونے لگے۔

ٹسڈل کے اعتراضات

جن حضرات نے میرے نوٹ اور استدراکات کو ملاحظہ فرمایا ہے ان سے یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ عبادات، معاملات و اخلاقیات کے متعلق ٹسڈل نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب میں اسی وقت دے چکا ہوں اور اب ان سے اعتناء کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اسرائیلیات و معتقدات کے متعلق جو کچھ اس نے کہا ہے اس پر ٹسڈل کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ علمی و عقلی حیثیت سے غور کرنا ضروری ہے تاکہ اسلام کی منقح صورت سامنے آئے۔

ٹسڈل کو خاموش کرنا تو بہت آسان بات ہے کیونکہ انجیل و توراۃ کے محرف ہونے سے تو خود عیسائیوں کو بھی انکار نہیں اور ان کو تو صرف یہ کہہ کر خاموش کیا جا سکتا ہے کہ تحریف شدہ کتابوں کو سامنے رکھ کر قرآن کے بیانات پر نکتہ چینی کرنا، جن کے غیر محرف ہونے کا ساری دنیا کو اعتراف ہے کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن اس سلسلہ میں قطع نظر اس سے کہ ٹسڈل یا کوئی اور کیا کہتا ہے، خود قرآن کے بیانات خواہ وہ کہیں سے ماخوذ ہوں یا نہ ہوں عقلی نقطۂ نظر سے ضرور زیر بحث آجاتے ہیں اور انھیں پر ہم کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، قرآن کے قصص و روایات یقیناً قدیم اسرائیلیات سے لئے گئے ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف لوگوں میں کیفیت اعتبار و بصیرت پیدا کرنے کے لئے اور اس لئے ان کے ماخوذ ہونے یا نقل کئے جانے یا خلاف عقل ہونے کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہی حال معتقدات کا ہے کہ وہ بھی در اصل سب تمثیلی حیثیت سے بیان کئے گئے

ہیں اور اس باب میں اسلام کا امتیاز یہی ہے کہ اسی نے سب سے پہلے ادیان سابقہ کے ان معتقدات کی حقیقت کو ظاہر کیا۔

لیکن اگر علماء اسلام کے نزدیک قرآن کے قصص و حکایات واقعی تاریخی حقیقت رکھتے ہیں اور معتقدات کا تعلق مادیات سے ہے تو اس کے ثبوت کی ذمہ داری انھیں پر عائد ہوتی ہے۔

روحانی تاثرات

اس سلسلہ میں مجھے ایک بات اور عرض کرنا ہے وہ یہ کہ یہ سلسلۂ معتقدات میں عذاب ثواب وغیرہ کو ذہنی یا احساسی چیز سمجھتا ہوں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ میں بقاء روح اور حیات بعد الموت کا اسی معنی میں قائل ہوں جس معنی میں عام طور پر لوگ اسے سمجھتے ہیں۔

روح و روحانیات کا تعلق بھی میرے نزدیک اسی دنیا سے ہے جو انسان کے اعمال کے لحاظ سے دوزخ بھی بن جاتی ہے اور جنت بھی جہاں ہمارے اعمال آئندہ نسلوں کے لئے اچھا یا بُرا نقش چھوڑ کر ہم کو مرنے کے بعد بھی نہیں مرنے دیتے۔

سامی مذاہب کی روایات

(علمی و تاریخی نقطہ نظر سے)

تخلیق انسان کتاب پیدائش کے باب ۱ آیت ۲۷ میں لکھا ہے کہ "خدا نے چھٹے روز انسان کے نر و مادہ دونوں کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔" اس کے بعد آیت ۲۲ میں الہام درج ہے کہ "خداوند اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔" اور پھر اس کتاب کے باب ۲ آیت ۷ میں تحریر ہے کہ "خدا نے زمین کی مٹی سے آدم کو پیدا کیا" آدم کا مٹی سے پیدا ہونے کا خیال تمام سامی مذاہب (موسوی عیسوی اور اسلام) میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مٹی کی چیزیں بنانے کا فن عہد قدیم میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ اول اول وہ لوگ صرف ایسی چیزیں مٹی سے بناتے تھے جن کی ضرورت ہوتی پھر انسانوں اور بعد از ان دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیں مٹی سے بنانے لگے۔

پروفیسر کلیفورڈ ایچ فار لکھتے ہیں کہ جب ان قدیم زمانے کے کاریگروں کا خیال زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا تو ان کی قوت شعور نے ان میں یہ عقیدہ پیدا کیا کہ خود انسان کو بھی کسی اعلیٰ ہستی نے ازل میں مٹی ہی سے بنایا تھا۔

چنانچہ اہل بابل اپنے صنم کبیر کو "بعل" یا "بعل" کہا کرتے تھے جس کے معنی ہیں "کمہار" اور اہل مصر بھی اپنے بڑے دیوتا کو خنومنو کہا کرتے تھے اس مصری لفظ کے معنی بھی "کمہار" کے ہیں۔ عبرانیوں میں انسان کو "آدم" کہتے ہیں، "ۃ" ان کے یہاں لاحقۂ تانیث ہے۔ "ادمۃ" کے معنی ان کے ہاں مٹی کے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خود عبرانی زبان ہی اس عقیدے کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔

پروفیسر فار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی زبان میں جو قصہ آفرینش آدم کا پایا جاتا ہے، خود عبرانیوں کی جودت طبع کا نتیجہ ہے، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ یہ خیال بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔

آفرینش و ہبوط آدم

توریت میں آفرینش عالم کے متعلق جو بیان دیا گیا ہے اس میں اس قدر تناقض و اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہرگز کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔

آفرینش آدم سے لے کر واقعۂ ہبوط تک کی تمام وہ تفصیلات لیجئے جو توریت میں پائی جاتی ہیں اور جن سے تقریباً ہر شخص واقف ہے یہ ہیں: خدا کا چھ دن میں کائنات کی مختلف مخلوقات کو پیدا کرنا۔ ساتویں دن آرام کرنا آدم و حوّا کی پیدائش باغ عدن میں ان کا قیام، شجر ممنوع کے پاس نہ جانے کا حکم، سانپ کا

اغوا اور پھر آدم کا اس درخت کے پاس جا کر پھل کھانا وغیرہ وغیرہ"

توریت کو الہامی کتاب ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ تمام واقعات ذریعہ وحی خدا کی طرف سے بتائے گئے یعنی دوسرے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ سے قبل کسی کو ان حقیقتوں کا علم نہ تھا، حالانکہ جس وقت ہم آثار قدیمہ اور باقیات عہد عتیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب کے سب یا اکثر اعتقادات وہ ہیں جو حضرت موسیٰ سے بہت قبل دنیا میں پائے جاتے تھے۔ کیونکہ جب آشوریوں نے فلسطین کو فتح کیا اور غیر ملکی لوگ وہاں آباد ہوئے تو اپنے ساتھ وہ تمام افسانے بھی لائے جو اُن کے یہاں رائج تھے چنانچہ فسانۂ عدن ہی کو لیجئے جو مصر، جنوبی ھندوستان، چین ایران، فنیقیہ اور قدیم میکسیکو تک میں پایا جاتا ہے۔

فرنیکلسن نے اپنی کتاب "بدھ مت والے اور جینی" میں لکھا ہے کہ "ہمارے اوّلین والدین (آدم وحوا) کے ہبوط کے واقعہ کی ایک نہایت دلچسپ تصویر پتھر پر کھدی ہوئی ملک توبہ میں مقام السپا ہبول کے ایک شاندار مندر میں سیاح ولسن نے دیکھی تھی۔ سیاح موصوف بیان کرتے ہیں کہ اس غار میں آدم وحوا کی تصویر ٹھیک اسی زندگی کی ہے جو باغ عدن میں بتائی جاتی ہے۔ اس میں سانپ کو درخت کے گرد لپٹا ہوا نہایت خصوصیت کے ساتھ دکھایا ہے" ایسی ہی ایک تصویر کرنیل کو مبس بھی لائے تھے۔ یہ تصویر جنوبی ھندوستان کے ایک مندر میں ایک سنگین ستون پر کندہ تھی۔ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ آدم وحوا بہشتی درخت کے نیچے کھڑے ہیں اور درخت کی گنجان شاخوں میں لپٹا ہوا ایک سانپ چھپا ہے جو اپنے منہ میں اس درخت کا پھل لئے ہوئے ہے اور آدم وحوا کو کھانے کی ترغیب دے رہا ہے!

مجوسیوں میں جو باغ عدن کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ "ایرانیوں کے خدائے خیر ہورا مزدا نے زمین اور انسان کو پیدا کیا اور اس کے لئے آرام و راحت کے جملہ سامان بہم پہونچائے یعنی جس طرح بائبل کی کتاب پیدائش کے مطابق ایلوہیم نے تکوین عالم کے کام کو چھ دن میں ختم کیا تھا اسی طرح ہورا مزدا نے تکوین کے کام کو چھ اوقات میں درجۂ تکمیل تک پہونچایا اور مرد عورت کو اس نے بھی چھٹے روز پیدا کیا۔ مرد کا نام اس نے "آدمہ" اور عورت کا نام "ایوۃ" (EVAH) رکھا تھا۔ ساتویں دن ہورا مزدا نے آرام کیا۔ یہ دن سنیچر یعنی زحل کا تھا۔ قدیم ملک اتروریہ (اطالیہ) کی روایت آفرینش بھی قریب قریب مجوسیوں کی روایت سے ملتی جلتی ہے ڈاکٹر طامس انمان لکھتے ہیں کہ ایرانیوں کے ساتھ میل جول ہونے سے پیشتر عبرانیوں کے یہاں ہفتہ کا دن یوم السبت نہیں مانا جاتا تھا۔ دوسری قومیں اس دن کو اپنا مقدس دن خیال کرتی تھیں چنانچہ انھیں دیگر اقوام و ملل کے لوگوں سے لے کر عبرانیوں نے بھی یہ رسم اختیار کی۔

مجوسیوں کی روایت میں ہے کہ اہرمن نے ہورا مزدا کے خلاف بغاوت کی اور وہ دنیا کی تمام برائیوں کا بانی "خدائے شر" بن گیا (بائبل میں اسی کا نام "شیطان" رکھا ہے) ایک خاص قسم کا پھل کھا کر اہرمن نے اپنی ہیئت سانپ کی سی بنالی اور زمین پر لوگوں کو بہکانے لگا۔ وہ لوگوں کو عیش پرستی، انتقام، ظلم و ستم اور دروغ گوئی اور افترا پردازی وغیرہ کی ترغیب دیتا تھا۔ سب سے پہلے مرد عورت کو ایک عجیب و غریب درخت "ہسوم" (یہی سنسکرت میں "سوم" ہے) کا پھل کھلا کر اس نے ان کے دلوں میں برے خیالات پیدا کر دئے جس کے باعث وہ گرا دئے گئے۔

اس کے بعد انھوں نے جانوروں کو مارا اور ان کی کھالوں سے تن پوشی کی۔ ہورمزد اور اہرمن کی اس جنگ کی وجہ سے اب دنیا کے ہر حصہ میں خیر و شر پائے جاتے ہیں، مگر مجوسیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ پرستاران ہورمزد کو فتح حاصل ہوگی، اہرمن مغلوب ہوگا اس وقت امن و صلح، اخوت و مسرت دنیا میں قائم ہو جائے گی۔ اہل میدیا (MEDIA) اور ایرانیوں میں تقریباً سنہ ق م ایک نبی بنام زردشت (زرتشت) مبعوث ہوا جس نے ایرانیوں کے قدیم مذہب کی اصلاح کی۔ اس کے زمانہ کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ عہد سائرس (CYRUS) سے لے کر جو ۵۵۰ برس قبل مسیح گذرا ہے، اسکندر اعظم کے ہاتھوں ایران فتح ہونے تک تمام مغربی ایشیا میں دین زردشت ہی کا غلبہ تھا۔ تکوین عالم کے متعلق مجوسیوں کے یہاں جو کچھ روایات ہیں ان کا علم ہم کو خاص طور پر پارسیوں کی کتاب "زند اوستا" سے حاصل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فان بر لیین لکھتے ہیں کہ "بائبل کی کتاب پیدائش کے تصور اور ژند کے بیان میں نہایت ہی گہری تعلق اور مطابقت پائی جاتی ہے۔"

مسٹر جارج اسمتھ نے (جن کا تعلق برٹش میوزیم کے شعبہ مشرقیہ سے ہے) ایسی آشوری الواح گلی کھود نکالی ہیں جو ۵۰۰۰ سے لے کر دو ہزار سال قبل مسیح تک کی ہیں (یعنی حضرت موسیٰ کی پیدائش سے بھی صدیوں قبل کی) ان الواح گل پر آفرینش عالم، ہبوط آدم، برج بابل، انتشار اقوام و ملل اور طوفان نوح کا حال بالکل ایسا ہی لکھا ہے جیسا کہ بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ خط میخی کے یہ کتبے مکمل نہیں ہیں یعنی ان قصص کا کچھ اہم حصہ ضائع ہو گیا اور جس حصہ میں درخت، سانپ اور طوفان نوح کے حالات درج ہیں اس کا

کچھ حصے ضائع ہوگیا ہے مگر سرزمین بابل سے بعض ایسے جواہرات دستیاب ہوئے ہیں جن پر باغ عدن کے واقعات کی تصویریں کندہ ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں ان کی روایات میں شامل تھیں۔

بائبل کی کتاب پیدائش میں جس "شجرۃ الحیوٰۃ" کا ذکر کیا ہے وہ بالکل ویسا ہی جیسا کہ خداوند انو (ANU) کا مقدس باغیچہ تھا جس کی نگہبانی "تلوار کے ذریعے ہوتی تھی" جو چاروں طرف گھومتی تھی۔ اس مقدس درخت کی تصویر مع "محافظ فرشتوں" کے مسٹر اسمتھ نے ایک آشوری اسطوانے نقل کرکے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۵ پر دی ہے اور اسی صفحہ پر ایک دوسری تصویر بھی ہے جس میں دو آدمی درخت کے ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ہیں اور پھل توڑنے کے لئے ہاتھ پھیلائے ہیں۔ ان آدمیوں میں جو عورت ہے اس کی پشت پر سانپ کی تصویر کھنچی ہوئی ہے۔ اصل تصویر برٹش میوزیم میں دیکھی جاسکتی ہے مسٹر اسمتھ لکھتے ہیں کہ :۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ان قدیم کتبوں میں اس قسم کی تصویریں خیالی یا اتفاقی نہیں ہوسکتیں بلکہ وہ واقعات گذشتہ یا مفروضہ واقعات کے مناظر ہیں اور یہ واقعات ان کی قدیم روایات سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہبوط آدم کا جو قصہ بائبل کی کتاب پیدائش میں دیا گیا ہے وہی قصہ قدیم زمانے کے اہل بابل میں بھی رائج تھا۔

جو اشوری کتبے مسٹر اسمتھ نے برآمد کئے ہیں اگرچہ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو آشور بنی پال (۶۶۸ لغایۃ ۶۲۶ ق م) کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ الواح گلی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اصلی نہیں ہیں بلکہ قدیم الواح کی نقلیں ہیں جو اور بھی زیادہ پرانی ہوں گی۔ اہل آشور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لٹریچر ان کے یہاں بابلی

ذرائع سے آیا تھا اور خط میخی کی ان تختیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۵۰۰ اور ۱۵۰۰ ق م کے درمیانی زمانہ میں اہل بابل بھی انھیں عقائد کے ماننے والے تھے جو بائبل کی کتاب پیدائش میں بیان کئے گئے ہیں۔

مسٹر پیرپانٹ مارگین کے پاس قدیم کتبے یا نقوش کے ٹکڑے ایسے موجود ہیں جن میں طوفان نوح کا حال درج ہے اور یہ انیس سو برس قبل مسیح کے ہیں مگر ان کے ٹکڑوں کی نسبت بھی یہ خیال ہے کہ وہ اصلی نہیں ہیں بلکہ اور زیادہ قدیم کتبوں کی نقلیں ہیں۔

۱۸۴۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ موسیو امیلی بوٹا نے نینوا کے قریب ایک ترکی گاؤں خورس آباد میں کھدائی شروع کی۔ یہاں مزدور کھودتے کھودتے ایک اشوری محل کے کھنڈر تک پہونچ گئے جو کسی زمانے میں شاہ سارگون دوم (۷۲۲، لغایۃ ۷۰۵، ق م) کا قصر شاہی تھا۔ اس واقعہ کے بعد ایک جوشیلے نوجوان انگریز مسمی آسٹن ایچ لیسارڈ نے مزدور کے بڑے ٹیلے کے نیچے قدیم شہر قلاہ کھود نکالا، اس کے بعد اس نے قصر شاہی برآمد کیا جو نینوا میں سناحریب (۷۰۵، لغایۃ ۶۸۱ ق م) نے تعمیر کیا تھا اور ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ سنگ موسیٰ کی چند لوحیں برآمد ہوئی تھیں جو اس وقت ییل یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود ہیں ان کی سطح پر ایک پیغام ایسے رسم الخط میں تحریر ہے جو مسیح سے غالباً ۶ ہزار سال پیشتر رائج تھا۔

۱۹۲۴ء میں خرابۂ شہر کش عراق کے ایک قدیم سلطنت کے پایۂ تخت میں کچھ اینٹیں دستیاب ہوئی تھیں اور ایک بہت بلند برج کے کھنڈر دریافت ہوئے تھے جس کی تعمیر جیسا کہ اینٹوں سے ظاہر ہوتا ہے زائد از چار ہزار سال قبل ہوئی تھی تو قع

کی جاتی ہے کہ جب اس تعمیر کے تمام حصّوں کو صاف کیا جائیگا تو سات ہزار برس قبل مسیح کے زمانے کی لکھی ہوئی تاریخ برآمد ہوگی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج غالباً وہی ہے جو قدیم روایات میں برج بابل کے نام سے پکارا گیا ہے اور اس کا تعلق طوفان نوح سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ شمس ایلو کے زمانہ کی بھی کچھ اینٹیں برآمد ہوئی ہیں، جو بابل کے اوّل شاہی خاندان کا ساتواں بادشاہ تھا (اس کا زمانہ ۲۰۸۰ لغایۃ ۲۰۴۳ ق م ہے) اینٹوں کی تحریر کا ترجمہ بھی کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسی خاندان شاہی کے دوسرے بادشاہ شمس الایلو (۲۲۱۱ لغایۃ ۲۱۷۶ ق م) کی سلطنت کے زمانہ کی بھی منقوش اینٹیں برآمد ہوئی ہیں اور ایک قدیم مندر بھی برآمد ہوا ہے جو شمس الایلو نے جنگ کے دیوتا، ایل بابل کے نام پر بنایا تھا۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ اب کھودتے کھودتے مزدور مٹی کی اس تہ تک پہونچ گئے ہیں جہاں سے قدیم ترین بابلی تمدّن کی باقیات برآمد ہوں گے اور توقع کی جاتی ہے کہ بہت جلد ایسے آثار دستیاب ہوں گے جن سے عراق کی قدیم ترین تاریخ پر روشنی پڑے گی۔

بہت عرصہ ہوا پروفیسر اگناز گولڈزیہر نے اس امر کے نہایت قوی ثبوت پیش کئے تھے کہ عبرانیوں نے آفرینش عالم کے حالات قدیم اہل بابل سے لئے تھے پروفیسر موصوف نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "بورے" (BORE) اور "یوسر" (YOSER) یعنی "خالق" کی صفات کا خیال سب سے پہلے ان عبرانیوں نے ظاہر کیا تھا جو اسیر ہو کر بابل گئے تھے یا جو وہاں بحالت اسیری پیدا ہوئے تھے اسی طرح باغ عدن کا قصہ جو تاریخ آفرینش کا ضمیمہ ہے خاص بابل میں لکھا گیا تھا۔ یہی باعث ہے کہ توریت کی کسی دوسری کتاب یا عہد نامہ عتیق کے کسی دوسرے صحیفہ میں کتاب پیدائش کے قصہ کا ذکر کہیں نہیں

ہے۔ مسٹر لنکان لکھتے ہیں کہ عبرانیوں کی قدیم کتب مقدسہ میں ہبوطِ آدم کے قصہ کا مطلق کہیں ذکر نہیں آیا۔ آدمؑ، حوّا، سانپ، عورت کا اپنے شوہر کو ورغلانا وغیرہ یہ سب وہ باتیں ہیں جن کا اسرائیلی کتب میں کہیں بھی ذکر نہیں۔ پروفیسر جان فسکے تحریر کرتے ہیں کہ باغِ عدن میں سانپ کا قصہ مع تمام اپنی تفصیلات کے آریہ قوم سے لیا گیا ہے شیطان کے "خالقِ شر" ہونے کا خیال صرف بعد کی لکھی ہوئی کتابوں میں آتا ہے اور یہ کتابیں اس وقت تصنیف ہوتی تھیں جبکہ یہودیوں میں ایرانی خیالات بکثرت رائج ہو گئے تھے۔

باغِ عدن اور آدم

اس باب میں اسفارِ موسیٰ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ خدا نے آدم و حوّا کا جوڑا پیدا کر کے کہا کہ "ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاؤ، نسل بڑھاؤ، زمین کو رونق دو اور اس پر حکومت کرو"۔

دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف آدم کو پیدا کیا اور باغِ عدن میں اسے متمکن کر کے حکم دیا کہ "اس کی حفاظت اور آراستگی کر"۔

اوّل بیان کے مطابق اس کو وہ تمام پودے دیئے گئے جو زمین پر پائے جاتے ہیں اور ان کے پھل کھانے کی اجازت دے دی گئی، دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان درختوں میں سے ایک درخت مستثنیٰ کر دیا گیا جو "علم کا درخت" تھا کیونکہ یہ بہت زہریلا تھا۔

اگر کہا جائے کہ "درختِ علم" صرف کنایہ ہے کسی اور حقیقت کی طرف تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خصوصیت کیا ہے اور اس اشارہ کنایہ کے استعمال کی کیا ضرورت تھی لیکن اگر اس درخت کو واقعی درخت سمجھا جائے تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اس درخت کو پیدا ہی کیوں کیا، اگر اسے پیدا کرنا تھا تو عدن سے باہر خدا کی خدائی

پڑی ہوئی تھی کہیں اور پیدا کیا جاتا اور اگر پیدا کرکے اسے "ممنوع" قرار دینا تھا تو آدم کو اس سے علیحدہ رکھا ہوتا۔ ان تمام سوالات کا جواب اسفار موسیٰ میں صرف اس قدر ملتا ہے کہ:۔

"خدا نے کہا دیکھو، انسان اس درخت کا پھل کھا کر نیک و بد سے واقف ہو گیا اور ہم جیسا بن گیا۔ پس ہو سکتا ہے کہ اب وہ "شجر حیات" کا پھل کھا کر غیر فانی بھی ہو جائے اس لئے اس کو عدن سے نکال دینا چاہئے چنانچہ وہ وہاں سے علیحدہ کرکے زمین پر پھینک دیا گیا تاکہ جوتے اور بوئے۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان "شجر علم" کا پھل کھا کر نیک و بد سے واقف ہو جائے گویا وہ انسان کو ہمیشہ جاہل، کندۂ ناتراش اور بے وقوف رکھنا چاہتا تھا۔

اسفار خمسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو "شجر حیات" کی حفاظت کا بہت زیادہ خیال تھا، چنانچہ آدم کے نکالے جانے کے بعد بھی اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا کہ اس کے چاروں طرف فرشتے مامور کردئے گئے جو شعلہ فشاں تلواریں لئے ہوئے اس کی نگرانی کرتے تھے۔

مفسرین میں باغ عدن کی جائے وقوع کے متعلق بہت اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ تیسرے آسمان میں تھا۔ بعض چوتھا آسمان بتاتے ہیں کوئی چاند میں اس کا واقع ہونا ظاہر کرتا ہے اور کوئی جو سما میں (کشش زمین کی حدود سے بلند) بعض اس کا موقع زمین ہی بتاتے ہیں اور بعض زیر زمین، کوئی قطب شمالی میں اس کا سراغ پاتا ہے کوئی قطب جنوبی میں، اسی طرح یہ اختلاف روایات چین

تاتار، لنکا، آرمینا، افریقہ، عراق، شام، ایران، عرب، بابل، اسیریا، فلسطین اور یورپ وغیرہ میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

انسان کے عدن سے نکالے جانے کے سلسلہ میں سانپ کا ذکر بھی سفرِ خمسہ میں پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سانپ نے حوّا کو ترغیب دلائی تھی کہ وہ "شجرِ ممنوع" کا پھل کھائیں اور حوّا نے اپنے شوہر کو بھی آمادہ کیا۔ اس پر خدا نے سانپ کو تو یہ سزا دی کہ اسے رینگنے والا جانور بنا دیا اور آدم و حوّا کو زمین پر اٹھا کر پھینک دیا۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس وقت سانپ کہا جاتا ہے وہ عدن کے اندر کسی اور صورت و ہیئت کا تھا چنانچہ ڈاکٹر آدم کلارک کہتے ہیں کہ "سانپ پہلے آدمیوں ہی کی طرح چلتا تھا۔ باتیں کرتا تھا، عقل و فہم بھی رکھتا تھا" گویا جس جانور کی مدد سے شیطان نے آدم و حوّا کو بہکایا وہ سانپ نہ تھا جسے ہم اس وقت دیکھتے ہیں بلکہ بندر کی قسم کا کوئی حیوان تھا۔

ڈاکٹر ہنری کہتے ہیں کہ "سانپ سے مراد شیطان ہے جو کسی وقت نہایت معزز فرشتہ تھا اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے مردود قرار دیدیا گیا تھا۔ اسی نے حوّا کو دھوکہ دیکر وہ پھل کھلایا اور ان کے نکلے جانے کا باعث ہوا۔ سانپ کی شکل اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ جانور اپنی صورت و ہیئت کے لحاظ سے عورتوں کے لئے بہت زیادہ جاذبِ توجہ ہے، پھر ہو سکتا ہے کہ اس نے اڑنے والے سانپ کی صورت اختیار کی ہو اور اوپر فضا سے اس کی آواز سن کر حوّا نے اسے ارشادِ خداوندی سمجھا ہو۔

اب یہاں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ سانپ کہاں سے آیا۔ ایامِ تخلیق کے چھ دنوں میں کسی دن اور کس نے اس کو پیدا کیا۔ اگر خدا نے پیدا کیا تو کیا اس کے علم میں

یہ بات نہ تھی کہ وہ آدم و حوا کو بہکائے گا اور نوع انسانی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گی،

وہ انسان نہیں تھا، چوپایہ نہیں تھا، طائر نہیں تھا، مچھلی نہیں تھا اور نہ رینگنے والا جانور کیونکہ پیٹ کے بل چلنے کا عذاب تو اس پر بعد کو مسلّط کیا گیا ہے پھر وہ کیا تھا اس کی کیا غذا تھی۔ اس کے پیدا کئے جانے کا کیا سبب تھا۔ آدم کو دھوکہ دینے کی تحریک اس میں کیوں پیدا ہوئی ۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے سوالات اس ضمن میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کا جواب نہ اسفارِ خمسہ میں کہیں ملتا ہے اور نہ دوسری مذہبی کتابوں میں۔

اگر کہا جائے کہ شیطان ہی کو سانپ سے تعبیر کیا گیا ہے تو بھی اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ باوجود اس علم کے کہ وہ انسان کا دشمن ہے کیوں اسے عدن کے اندر داخل ہونے اور حوا کو بہکانے کی اجازت دی گئی۔ اگر خدا کا منشا یہی تھا کہ وہ انسان کو جنت میں پیدا کرے اور پھر مصیبت بھری دنیا میں اٹھا کر پھینک دے تو تخلیق ہی کی کیا ضرورت تھی۔ اگر مدعا یہی تھا تو کیا اس کی بہتر صورت یہی ہو سکتی تھی کہ اسے پہلے "شجرِ علم" سے دور رہنے کا حکم دیا جائے اور پھر جب وہ اس تک پہنچ جائے تو صرف اس بناء پر کہ کیوں اس نے علم و شعور حاصل کرنے کی کوشش کی کہ نکال باہر کیا جائے

اسی سلسلہ میں اسفارِ خمسہ کا ایک اور بیان قابلِ ملاحظہ ہے، لکھا ہو کہ :-

"جب آدم و حوا جنت سے نکالے جانے لگے تو خدا نے ایک چرمی قمیض ان کو مرحمت فرمائی" یہ سُن کر قدرتاً یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ چمڑا کہاں سے آیا۔ کیا خدا نے کسی جانور کو ہلاک کرکے اس کی کھال کھینچی تھی؟ چمڑے کی دباغت کس نے کی اور قمیض کیونکر تیار ہوئی؟

پھر ایک بات اور یہ ہے کہ ان کو لباس کی ضرورت ہی کیا تھی، کیا وہ اپنی عریاں حالت پر جنت میں مطمئن نہ تھے اور اگر یہ لباس اس خیال سے دیا گیا تھا کہ زمین کی موسمی حالت سے متاثر نہ ہوں تو بھی بے کار تھا کیونکہ زمین کا موسم بدلتا رہتا ہے۔

طوفان نوح

اسفار خمسہ میں طوفان نوح کی نوعیت اور اس کے اسباب پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ اس سے زیادہ عجیب غریب ہے اس میں لکھا ہے کہ جب آدم و حوا جنت سے نکالے جانے کے بعد زمین پر آ کر بسے تو ان کی نسل بڑھی لیکن یہ نسل نہایت بدعمل تھی اس لئے خدا پچھتایا کہ میں نے کیوں انسان کو پیدا کیا، اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ انسانوں اور جانوروں سب کو تباہ کر دے۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عدن سے آدم و حوا کا اخراج نوع انسانی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ مضرت رساں نکلا۔ کیونکہ اس کی اخلاقی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس خرابی کا ذمہ دار انسان کیونکر ہو سکتا تھا جبکہ اس وقت تک اصلاح نوع انسانی کے لئے نہ خدا نے کسی نبی کو بھیجا نہ کوئی صحیفۂ الہامی نازل کیا، اور نہ کوئی دوسری صورت اس کے اخلاق درست کرنے کی اختیار کی گئی۔

یقیناً خدا جانتا تھا کہ انسان روز بروز گناہگار ہوتا جائیگا اور سوائے نوح و خاندان نوح کے وہ سب کو غرق آب کر دے گا پھر کیا یہ مناسب نہ تھا کہ وہ بجائے آدم و حوا کے (جنہوں نے نافرمانی کی تھی) پہلے نوح ہی کو پیدا کرتا جو اولاد آدم میں سب سے پہلے مطیع و فرمانبردار بندے خدا کے تھے

دوسری عجیب و غریب بات یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی تباہ کرنے کا ارادہ کیوں کیا، غلطی تو انسان کی تھی نہ کہ جانوروں کی۔ پھر انھیں کس قصور میں

مبتلائے عذاب کیا گیا۔ شجر ممنوعہ کا پھل کھائیں آدم و حوا، گناہ میں مبتلا ہوں ان کی نسل اور غصہ آتا ہے جانوروں پر۔ یہ کیسا انصاف تھا؟

طوفان لانے سے قبل خدا نے نوح کو حکم دیا کہ وہ ایک کشتی تیار کریں۔ ۳۰۰ ہاتھ (۵۵۰ فٹ) لمبی، ۵۰ ہاتھ (۹۱ فٹ ۸ انچ) چوڑی اور ۳۰ ہاتھ (۵۵ فٹ) اونچی۔

اس کشتی کے تین درجے تھے اور چوٹی پر ایک کھڑکی ۲۲ مربع انچ تیار کی گئی تھی ایک دروازہ بھی اس میں تھا جو باہر سے بند ہوتا تھا۔ جب کشتی تیار ہو گئی اور سامان خورد و نوش اس میں رکھ دیا گیا تو خدا نے سات دن کی مہلت دی کہ وہ جانوروں کو اس کے اندر جمع کر لیں۔

بعض تاویل کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ طوفان زمین کے ایک حصے کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے بہت زیادہ جانور اس میں جمع نہیں کئے گئے لیکن اسفار کی عبارت اس تاویل کی اجازت نہیں دیتی کیونکہ خدا نے ہر متنفس کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ آسمان و زمین کے درمیان جتنی مخلوق تھی سب کو غرق آب کرنا چاہا تھا ——— علاوہ اس کے اسفار کے صاف الفاظ یہ ہیں کہ :- "ہم نے نوح کو حکم دیا کہ ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لیں۔ دوسری جگہ یہ تحریر ہے کہ تمام پاک جانوروں میں سے سات سات جانور نر و مادہ اور ناپاک جانوروں میں سے دو دو نر و مادہ طیور میں سے بھی سات سات نر و مادہ لے لئے جائیں"

اب غور کرنا چاہیے کہ نوح نے کتنے وحوش و طیور جمع کئے اس وقت تک پرندوں کی قسمیں کم از کم ۱۷۵۰۰ دریافت ہوئی ہیں اور چین، جنوبی امریکہ اور افریقہ کے تمام طیور کی ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی۔ اس لئے حسب بیان توریت کم از کم ۱۷۵۰۰ پرندے حضرت نوح نے فراہم کئے ہوں گے۔ اسی طرح کم از کم ۵۹۰۰ قسمیں چوپایوں کی دریافت ہوئی ہیں اور ۲۵۰۰ رینگنے والے جانوروں کی، کیڑے مکوڑوں کی قسمیں تقریباً دس لاکھ ہیں اس لئے

کم از کم ۲۰ لاکھ جانور نوح نے اپنی کشتی میں جمع کئے ہوں گے اس لئے اب بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب طوفان نے تمام پہاڑوں کو ڈبو دیا ہوگا اور سارا کرۂ ارض کرۂ آب ہو کر رہ گیا ہوگا تو تمام سمندروں اور دریاؤں کا پانی ایک ہو گیا ہوگا۔ اور یہ پانی اتنا شور و نمکین ہوگا کہ اس سے پیاس کا بجھنا ناممکن رہا ہوگا پس ظاہر ہے کہ حضرت نوح نے ان سب کے لئے شیریں پانی بھی اپنی کشتی میں رکھا ہوگا۔ ہر ایک قسم کے جانوروں کی مخصوص غذا فراہم کی ہوگی۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ۳۰۰ ایام کے لئے جو طوفان نوح کے قیام کا زمانہ بتایا جاتا ہے) ۲۰ لاکھ جانوروں کے لئے پانی اور چارہ کتنا درکار ہوا ہوگا بتایا جاتا ہے کہ کشتی میں صرف آٹھ آدمی تھے تو گیا ۱۰۸۰۰۰ چڑیوں، ۳۶۱۶ چوپایوں، ۱۳۰۰ رینگنے والے جانوروں اور ۲۰ لاکھ کیڑے مکوڑوں کی دیکھ بھال صرف آٹھ آدمیوں کے سپرد تھی۔

سال بھر میں ایک جانور جتنی غذا کھاتا ہے وہ اس کے وزن کی دوچند ہوجاتی ہے یعنی ایک جوڑے ہاتھی کے لئے ۵ ٹن چارہ ضروری ہے جمتھ کے لئے اس سے دوچند ہونا چاہئے۔ اسی طرح اور بہت سے جانور نوح کی کشتی میں ایسے ہوں گے جو سال بھر کے اندر جنگل کے جنگل صاف کر جاتے پھر کیا ممکن ہے کہ ۵۰۰ فٹ لانبی اور ۹۰ فٹ چوڑی کشتی میں اتنے طیور و وحوش سماگئے ہوں گے اور عقل اسے باور کر سکتی ہے کہ ان سب کی غذا بھی پورے ایک سال کے لئے کشتی کے اندر ذخیرہ کر لی گئی ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف آٹھ آدمیوں نے کیونکر اتنے حیوانات کا انتظام کیا ہوگا اور جو غلاظت پھیلی ہوگی اس کی صفائی کی کیا صورت اختیار کی گئی ہوگی۔

کشتی میں تمام دنیا کے جانور تھے اور چونکہ کرۂ زمین کے مختلف حصوں کا درجۂ

حرارت مختلف ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہر حصہ زمین کے جانور کے لئے اُسی درجۂ حرارت کی ضرورت رہی ہوگی جس میں وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ قطب شمالی کے جانوروں کے لئے انتہائی سردی کی ضرورت ہے اور صحرائے افریقہ کے جانوروں کے لئے انتہائی گرمی کی۔ بعض جانور معتدل موسم چاہتے ہیں۔ اس لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کشتی کے اندر ایک ہی وقت میں مختلف موسم اور مختلف درجہ ہائے حرارت پیدا کرنا کیونکر ممکن ہے؛

وہ جانور جو نباتات پر زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے تو خیر چارہ کا ذخیرہ ممکن ہے لیکن جن جانوروں کی غذا گوشت یا کیڑے مکوڑے ہیں اُن کے لئے کیا انتظام ہوا ہوگا۔ کیا علاوہ ان جانوروں کے جو نوح کے مہمان تھے بہت سے اور جانور ایسے بھی کشتی میں موجود تھے جو غذا کا کام دے سکیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مہمان جانوروں سے زیادہ غذا کے جانور فراہم کئے ہوں گے جن کی تعداد ایک سال کی مدت کے لحاظ سے اتنی بڑی ہوتی ہے کہ ہزاروں میل کی وسعت بھی ان کے لئے کافی نہیں چہ جائیکہ معمولی کشتی؛

کہا جاتا ہے کہ متواتر ۴۰ دن تک بارش ہوتی رہی اور بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی ڈوب گئی گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ پانی ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی تک پہونچ گیا تھا اس حد تک پہنچنے کے بعد پانی کا دباؤ فی مربع فٹ ۸۰۰ ٹن ہونا چاہیئے اور یہ دباؤ اتنا زبردست ہے کہ پانی کے اندر کوئی جاندار، کوئی درخت اور پودھا باقی نہیں رہ سکتا اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب طوفان ختم ہونے کے بعد تمام جانور کشتی سے باہر نکلے ہوں گے ان کو غذا کیونکر ملی ہوگی جب وہاں نہ کوئی درخت باقی رہا تھا نہ گھاس، نہ کوئی جاندار، موجود تھا۔ نہ کیڑا مکوڑہ، نباتات کے نشو و نما کے لئے کم از کم ۶ ماہ کی مدت درکار ہے؛

تو کیا اتنی مدت تک جانور بھوکے رہے ہوں گے،

جب طوفان ختم ہو کر خشک زمین نمودار ہوئی ہو گی اور تمام جانور کشتی سے باہر نکلے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کی طرف روانہ ہوئے ہوں گے بعض جانور قطب شمالی کی طرف گئے ہوں گے بعض قطب جنوبی کی طرف، بعض افریقہ کی جانب بعض ایشیا کی جانب۔ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصلی مستقر پر پہنچنے کی مدت تک زندہ کیونکر رہے ہوں گے، جبکہ ان میں سے ہر ایک ناموافق موسم کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کشتی کوہ اراراط پر جا کر ٹھہری تھی۔ پس سوا اس حصۂ زمین کے دوسرے جانوروں کے لئے یہاں کا موسم ناموافق رہا ہوگا جسے وہ کسی طرح برداشت نہ کر سکے ہوں گے۔

علاوہ اس کے بعض جانور ایسے ہیں جو نہایت سست رفتار ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے مستقر تک کیونکر پہونچے ہوں گے۔ فرض کیجئے کہ ایک گھونگھا جو دن بھر میں ایک فٹ چلتا ہے اپنے مستقر تک روانہ ہوا جو بارہ ہزار میل دور ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ایک ہزار سال میں وہاں پہونچا ہوگا۔

اسفار موسیٰ کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ ساتویں مہینے کے سترھویں دن نوح کی کشتی کوہ اراراط پر جا کر ٹھہری۔ پہاڑ کی چوٹیاں دسویں مہینے تک نظر نہیں آئیں، اس کے بعد بھی نوح نے ۴۰ دن کا انتظار کیا اور پھر ایک کوّے کو روانہ کیا کہ خشکی کا پتہ چلائے لیکن وہ واپس نہ آیا۔ اس کے بعد فاختہ کو روانہ کیا جو واپس آگئی اس کے بعد پھر سات دن انتظار کیا اور فاختہ کو مکرّر روانہ کر دیا۔ اس مرتبہ وہ واپس نہ آئی اور اس سے حضرت نوح نے سمجھا کہ خشکی کا حصہ نمودار ہو گیا ہے اس کے بعد وہ خشکی

پر اترے، قربان گاہ تیار کی، قربانی چڑھائی اور خدا اتنا خوش ہوا کہ نوح اور ان کی اولاد کو اجازت دے دی کہ دنیا میں جو چاہیں کھائیں پیئیں اور وعدہ کیا کہ آئندہ پھر کبھی طوفان لا کر نوع انسانی کو ہلاک نہ کرے گا چنانچہ قوس قزح اسی وعدہ خداوندی کی یادگار ہے۔

منجملہ دیگر داستانوں کے جو حسب روایات توریت موسیٰ پر بذریعہ وحی نازل ہوئیں، ایک یہ بھی تھی کہ :-

> جب روئے زمین پر آدمی بہت ہوگئے اور ان سے بیٹیاں پیدا ہوئیں تو خدا کے بیٹوں نے "آدمیوں کی بیٹیوں کو" دیکھا کہ وہ خوبصورت ہیں، اور ان میں سے جو پسند آئیں ان کو اپنی بیوی بنا لیا۔ اس مواصلت سے جبابرہ پیدا ہوئے جنھوں نے بہت فساد پھیلایا۔ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا (کتاب پیدائش باب ۶ آیت ۱-۶) اور اس نے یہ ارادہ کر کے کہ وہ انسان کو مار ڈالے گا، کہا کہ :-
>
> "میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے مٹا دوں گا نہ صرف انسان، بلکہ حیوانوں کو بھی، پرندوں کو بھی، حشرات الارض کو بھی۔ کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں" (پیدائش باب ۶ آیت ۷)

بہر حال جب کتاب پیدائش کے بیان کے مطابق انسان نے دنیا کو ظلم سے بھر دیا، (پیدائش باب ۶ آیت ۱۳) تو خدا نے انسانوں کو غرق کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور نوح کو حکم دیا گیا کہ :

> "تو اور تیرے بیٹے اور تیری اور تیرے بیٹوں کی بیویاں تیرے ساتھ کشتی میں

جائیں گے اور سب جانوروں میں سے ہر جنس کے دو دو جوڑے اپنے ساتھ
کشتی میں لے لے تاکہ وہ بچے رہیں۔ اسی طرح پرندوں اور حشرات میں سے
بھی ہر ایک دو دو جوڑے لے لے۔ اور تو اپنے پاس کھانے کی چیزیں جمع کر تاکہ
وہ تیری اور ان کی خوراک ہوں۔ (پیدائش باب ۶ آیات $\frac{15}{12}$)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوح کی تمام مخلوقات میں سے دو دو جوڑے لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور ساری دنیا کو تباہ کرنا مقصود نہ تھا لیکن کتاب پیدائش باب ہفتم آیات میں یہی واقعہ ان الفاظ میں درج ہے کہ :۔

"اور خدا نے نوح سے کہا کہ تو اپنے خاندان سمیت کشتی میں آ، کیونکہ میں تجھی
کو اپنے حضور میں اس زمانے کے درمیان صادق دیکھا۔ سب پاک جانوروں میں
سے سات سات نر اور مادہ اور ان میں سے جو پاک نہیں ہیں دو دو جوڑے
اپنے پاس لے لے اور آسمان کے پرندوں میں سے جو پاک ہیں سات سات
جوڑے لے لے تاکہ زمین پر ان کی نسل باقی رہے کیونکہ سات کے بعد میں زمین
پر چالیس دن اور چالیس رات پانی برساؤں گا۔ تمام موجودات کو جنھیں میں
نے بنایا زمین پر سے مٹادوں گا۔"

یہاں ہر چیز کا جوڑا جوڑا لینے کا حکم نہیں بلکہ سات سات کا حکم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تمام موجودات کو تباہ کیا جائے گا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

دوسرے مہینے کی سترھویں تاریخ کو اسی دن بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ
نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات تک

زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی اسی دن نوح اور سام اور یافت نوح کے بیٹے
اور نوح کی بیوی اور اس کے بیٹوں کی تینوں بیویاں کشتی میں داخل ہوئیں
اور تمام جانور جوڑے جوڑے کشتی میں داخل ہوئے اور خدا نے اس (نوح) کو
باہر سے بند کر دیا" (کتاب پیدائش باب ۷، آیات ۱۱/۱۶)

یہاں پھر "جوڑے جوڑے" نوح کے پاس آتے ہیں۔ اس اختلاف بیان کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کتاب پیدائش کے یہ قصے لکھے ہیں اس کے سامنے دو قسم کی قدیم داستانیں تھیں لیکن ان میں وہ ربط پیدا نہ کر سکا۔

کشتی بند کر دینے اور "دوسرے مہینے کی سترھویں تاریخ" کے بارہ میں ڈاکٹر یونیک کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال قدیم مصر کی روایات سے عبرانیوں میں آیا ہوگا کیونکہ ہر سال ماہ ایثر کی سترھویں تاریخ کو مصر قدیم کے پجاری اپنے بڑے دیوتا اوسیرز کے بت کو ایک مقابس کشتی میں بند کر دیا کرتے تھے اور جس زمانہ میں نوح کا کشتی میں بند ہونا بتایا جاتا ہے وہ ایثر ہی کا مہینہ ہوتا ہے اور وہی تاریخ پڑتی ہے۔ لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ طوفان نوح اور برج بابل کا قصہ عبرانیوں نے بابلیوں یا کلدانیوں سے لیا تھا نہ کہ مصریوں سے۔

چنانچہ مسٹر بارنگ گولڈ پادری کا بھی خیال یہی ہے کہ :۔

جب یہودیوں کو اسیر کر کے بابل لے جایا گیا وہاں انھوں نے بہت سی ایرانی
اور کلدانی داستانیں سنیں اور اپنے مذہبی لٹریچر میں داخل کریں۔"

مسٹر جارج اسمتھ نے نینوا کے کھنڈر سے جو کتبے سنہ ۱۸۷۲-۷۳ء میں برآمد کئے تھے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طوفان کا قصہ اہل بابل کو اڑھائی ہزار برس مسیح سے پیشتر معلوم تھا۔
کلدانی مورخ بیروسوس نے طوفان کا جو حال لکھا ہے وہ بھی کتاب پیدائش کے

بیان کے مطابق ہے۔ اور اس کتبہ کے بھی مطابق ہے ـــــ جو مسٹر اسمتھ نے برآمد کیا ہے۔

دونوں قصوں میں ایک متقی و پاکباز آدمی کو خداوند کی طرف سے مطلع کیا جاتا ہے کہ ایک ایسا طوفان آنے والا ہے جو تمام بنی نوع انسان کو غرق کر دے گا اور دونوں قصوں میں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایک کشتی یا جہاز بنائیں اور اس میں جانور اور پرندے وغیرہ بھی مع سامان خورد و نوش کے رکھ لیں۔ دونوں قصوں میں لکھا ہے کہ کشتی سے ایک پرندہ تین مرتبہ باہر بھیجا جاتا ہے اور تیسری مرتبہ واپس نہیں آتا۔ دونوں قصوں میں کشتی ایک پہاڑ پر ٹھہرتی ہے اور کشتی سے باہر نکلنے کے بعد دیوتاؤں کی قسم قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ بیروسس کے قصہ کا ہیرو زیسوطرس (XISUTWARUS) ہے جو ملک کا دسواں بادشاہ تھا۔ اور کتاب پیدائش کے ہیرو نوح ہیں جو دسویں سردار قبیلہ تھے، پھر جس طرح زیسوطروس کے تین بیٹے (۱) زیروفانوس (۲) طیطن (۳) یافتوسیتھس بتلائے جاتے ہیں اسی طرح نوح کے بھی تین بیٹے تھے (۱) حام (۲) سام (۳) یافث[2] ان میں سے یافتوسیتھس اور یافث دونوں کی شخصیت غالباً ایک ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش

---

[1] اگرچہ بعض جگہ دونوں بیانات کچھ مختلف ہیں۔ لیکن یہ اختلافات اہم نہیں ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی کسی روایت کو بیان کرے گی تو اس میں کچھ نہ کچھ زیب داستان کے لئے ضرور اضافہ کر دے گی۔

[2] ہندوؤں کی روایات قدیمہ میں بھی منوجی کشتی کے ذریعہ سے بچتے ہیں اور ان کے بھی تین صاحبزادے تھے (۱) سام (۲) کام (۳) پریاپتی ان میں سے سام کا نام تو بجنسہ وہی ہے اور تیسرا نام پریاپتی سے بہت ملتا جلتا ہے ۱۲

کی اس روایت کا ماخذ قدیم کلدانی یا بابلی روایات ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ یہ روایت قدیم مصریوں سے لی گئی ہو لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ قدیم مصریوں میں طوفان نوحؑ کے متعلق کوئی روایت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ٹھیک اسی وقت جبکہ بقول بائبل طوفان نوحؑ سے تمام روئے زمین کو غرق کر دیا تھا۔ بادشاہ فرعون خوفو اپنا ہرم اعظم تعمیر کرا رہا تھا۔ علاوہ اس کے قدیم مصریوں کی کتاب مقدس "کتاب الموتیٰ" میں طوفان کا حال درج نہیں ہے۔

مسٹر جارج اسمتھ نے جو مٹی کی تختیاں زمین سے برآمد کی ہیں ان میں سے ایک لوح پر حسب ذیل روایت در بارہ طوفان کندہ ہے:۔

(۱) سطح زمین زیر آب ہو گئی۔ اس نے روئے زمین کی تمام جاندار چیزوں کو ہلاک کر دیا۔ شدید طوفان جو لوگوں پر نازل ہوا وہ آسمان تک پہونچا۔ بھائی نے بھائی کو نہ دیکھا اور آدمیوں نے ایک دوسرے کو نہ پہچانا۔ آسمانوں میں دیوتا طوفان سے خوف کھا رہے تھے انھوں نے پناہ کی جگہ تلاش کی اور وہ آنو دیوتا کے آسمان پر چڑھ گئے۔ دیوتا کتوں کی طرح (حروف مٹ گئے ہیں) سجدہ میں گر پڑے چھ دن اور رات گذر گئے، ہوا، طوفان اور سیلاب نے غلبہ کر لیا۔ ساتویں دن طوفان اور سیلاب بند ہوا جس نے زلزلہ کی طرح ہلاکت ڈالدی۔ سکون ہو گیا۔ سمندر کو اس نے خشک کر دیا اور ہوا اور بارش ختم ہو گئی۔ میں نے سمندر متلاطم دیکھا اور تمام بنی آدم ہلاک ہو گئے۔ لاشیں نرکلوں کی طرح تیرتی تھیں۔ میں نے کھڑکی کھولی اور میرے منہ پر روشنی پڑی وہ گذر گئی اور میں بیٹھ گیا اور رونے لگا میں نے ایک فاختہ بھیجی اور وہ چلی گئی۔ فاختہ گئی اور وہ واپس آگئی۔

میں نے ایک ابابیل بھیجی۔ وہ چلی گئی اور واپس آ گئی

میں نے ایک کوّا بھیجا اور وہ روانہ ہو گیا۔ کوّا گیا اور اس نے پانی اترا دیکھا اور اس نے کھایا اور وہ تیرا اور آوارہ ہو گیا اور واپس نہ آیا۔ میں نے جانوروں کو ہر سمت روانہ کیا اور میں نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قربان گاہ بنائی۔

افسوس ہو کہ اس کتبہ میں سے ۵ سے ۱۰ تک کی سطریں ضائع ہو گئی ہیں اگر وہ سطریں گم نہ ہو جاتیں تو یقیناً یہ معلوم ہو جاتا کہ کشتی کس طرح بنائی گئی تھی اور کس طرح زیسو طروس اور اس کے تینوں بیٹوں کی جانیں بچی تھیں۔

کلدانی مورخ بیر دسوس نے جو روایت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ زیسو طروس کو خواب میں کلدانی دیوتا کرونس نظر آیا اور آنے والے طوفان سے مطلع کیا۔ زیسو طروس نے ایک بہت بڑی کشتی بنائی جس میں اس نے اپنے اہل و عیال اور عزیز دوستوں اور زمین کے تمام جانوروں اور پرندوں کے نمونے کشتی میں رکھے وغیرہ وغیرہ۔ یہی بیان قریب قریب کتاب پیدائش کا ہے اور اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ کلدانی یا بابلی روایات سے لیا گیا ہے۔

برج بابل

جب طوفان ختم ہو گیا اور نوح کی کشتی خشکی پر آ کر ٹکی تو وہ اترے اور انگور کی کاشت شروع کی جب انگور پختہ ہو گئے تو اس کو شراب بنائی اور خوب پی۔ اپنے کو بدُعا دی۔ تمام دنیا کنث کو دعا دی اور وہ ۳۵۰ سال تک زندہ رہے گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ جس وقت نوح کا انتقال ہوا ہے وہ اس وقت کے تمام انسانوں سے عمر میں ۵۰۰ سال بڑے تھے لیکن نہ ان کے مرنے کا ذکر کہیں پایا جاتا ہے نہ یہ کہ وہ کہاں دفن کئے گئے اور ان کی یادگار کوئی قائم کی گئی یا نہیں اسی طرح آدم

وحوّا کی وفات اور اُن کے دفن کا کوئی ذکر توریت میں نہیں پایا جاتا؛

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ برج بابل کی تعمیر کے وقت چونکہ خدا نے انسانی زبان کو خلط ملط کر کے اسے ایک دوسرے کے لئے ناقابل فہم بنا دیا تھا اس لئے آدم و نوح کے متعلق جو روایات پائی جاتی تھیں وہ محو ہو گئیں اور ان کی اولاد نہ طوفان کا صحیح حال یاد رکھ سکی نہ نوح کی وفات کا، پھر جب دوسری زبان رائج ہوئی تو از سرِ نو ذریعۂ الہام یہ داستان سنائی گئی۔

اس جگہ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم وحوّا کی وہ زبان کیا تھی جسے سانپ بھی سمجھ سکتا تھا، زبان ایسی چیز ہے جو ایک دن یا ایک سال میں تیار نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے بہت کافی زمانہ درکار ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ابتدائی حالت میں زبان صرف چند مخصوص آوازوں پر مشتمل ہوتی ہے جن سے صرف مسرت و غم یا محبت و نفرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن پیچیدہ خیالات کے ظاہر کرنے کی صلاحیت زبان میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ خیالات کا تعلق صرف تجربہ سے ہے اور ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا نے ان کو دفعتاً پیدا کر کے انسان کے دماغ میں بھر دیا تھا۔ آدم وحوّا کی زبان عبرانی رہی ہو یا کچھ اور بہر نوع وہ دفعتاً پیدا ہو جانے والی چیز نہ تھی اور ایک زمانہ اس کی تشکیل میں صرف ہوا ہوگا اب رہا سانپ کا حوّا سے گفتگو کرنا سو یہ اور زیادہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس نے آدم و حوّا کی زبان کب اور کیونکر سیکھی؟

الغرض اوّل تو زبان کے باب میں یہی معمہ حل نہیں ہو سکتا کہ آدم وحوا دفعتاً کوئی زبان کیونکر ایجاد کر سکے۔ اور دوسرے اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ برج بابل کی تعمیر سے قبل تمام انسانوں کی وہی ایک زبان تھی جو عدن میں آدم وحوا کو سکھائی گئی تھی تو پھر یہ بات اس

سے زیادہ ناقابل فہم ہے کہ برج بابل کی تعمیر کے وقت خدا نے زبان کو خلط ملط کر دیا تھا تاکہ کوئی دوسرے کی بات سمجھ نہ سکے۔

بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ برج کی تعمیر کے وقت تک تمام باشندگان کرۂ ارض کی ایک ہی زبان تھی اور ایک ہی رہتی اگر انسان برج بابل کی تعمیر کا ارادہ کر کے آسمان تک پہونچنے کی کوشش نہ کرتا۔ خدا انسان کی اس گستاخی سے برہم ہو گیا اور اس نے زبان کو گڑبڑ کر دیا تاکہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکے اور برج تعمیر نہ ہو سکے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ زبان کے مسخ ہونے کے بعد سب منتشر ہو گئے۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا کو تعمیر برج میں کیا اعتراض تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح انسان آسمان تک نہیں پہونچ سکتا۔ اگر کہا جائے کہ یہ خیال انسانی گستاخی کی سزا تھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے زبان کو خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی کیا وہ ایسا نہ کر سکتا تھا کہ جتنا برج وہ دن میں تعمیر کرتے تھے رات کو اسے ڈھا دیا کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ زبان کی گڑبڑ سے تعمیر برج پر کیا اثر پڑ سکتا تھا اور وہ کیونکر عمل میں آئی۔

زبان اسی وقت مسخ ہو سکتی تھی جب قوت حافظہ مٹ جائے تو کیا خدا نے انسان کی قوت حافظہ محو کر دی تھی یعنی دماغ کے اس حصہ کو مفلوج کر دیا تھا جو اعصاب گویائی پر حکمراں ہے یا یہ کہ قوت سلب کر لی تھی؟ اس کا کوئی ذکر توریت میں نہیں۔

اسی کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ زبان کے مسخ ہو جانے سے انسانوں میں انتشار کیوں پیدا ہوا اور الگ الگ ہو جانے کا سبب کیا تھا۔ کیا وہ ایک ہی جگہ قیام کر کے اس وقت تک انتظار نہ کر سکتے تھے کہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے لگے۔ مصیبت کے وقت

میں تو تمام افراد قدرتاً ایک ساتھ زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں نہ کہ منتشر ہو جانا۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے جب مسخ زبان کے بعد مختلف جماعتیں مختلف مقامات پر چلی گئی ہوں گی تو وہاں انھوں نے کیا کیا ہوگا جبکہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتا تھا۔

بائبل کی کتاب پیدائش باب ۱۱ آیت ۱ تا ۹ میں لکھا ہے کہ :-

> تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور جب وہ پورب سے روانہ ہوئے تو انھوں نے سنعار کے ملک میں ایک میدان پایا اور وہاں بس گئے۔ آپس میں کہا کہ آؤ ہم اینٹ بنائیں اور آگ میں پکائیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بنائیں اور ایک برج بنائیں جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام روئے زمین پر پریشان ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور اس برج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے اترا اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ ایک ہی ہیں اور ان سب کی ایک ہی بولی ہے اب وہ یہ کرنے لگے سو وہ جس کام کا ارادہ کریں گے اس سے رک نہ سکیں گے۔ آؤ ہم اتریں اور بولی میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں تب خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے اس لئے اس کا نام بابل ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کر دیا۔"

بائبل کی اس الہامی روایت کا ماخذ بھی بابلی روایت ہے۔ بیروسوس مشہور کلدانی مورخ نے بھی قریب قریب یہی بیان در بارۂ برج بابل لکھا ہے، وہ لکھتا ہے کہ :-

> زمین کے پہلے باشندے اپنے زور و قوت پر گھمنڈ کرتے ہوئے دیوتاؤں کو

حقیر و جلیر سمجھنے لگے اور انھوں نے اس مقام پر جہاں اب شہر بابل ہے ایک برج بنانا
شروع کیا جب اس کی چوٹی آسمان تک پہونچی تو ہواؤں نے دیوتاؤں کی مدد کی
اور انھوں نے اس سر بفلک برج کو اکھاڑ پھینکا۔ نیز ان لوگوں میں اختلاف لسانی
پیدا کر دیا۔ اس وقت تک ان تمام آدمیوں کی ایک ہی زبان تھی۔ کہتے ہیں کہ
اس برج کے کھنڈر اب بھی بابل میں موجود ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ برج کی حقیقت کیا ہے۔ اس باب میں جوزیفس کا قول یہ ہے کہ یہ برج نمرود نے بنوایا تھا اور دیودورس کا بیان ہے کہ اس برج کو اہل کلدانیہ نے رصدگاہ کی صورت سے بنایا تھا اور اس کا نام "ہفت منازل سیارگان" رکھا تھا۔

اس رصدگاہ کی منزلیں علی الترتیب، آفتاب، قمر، زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد سے منسوب تھیں۔ لیکن بادشاہ بخت نصر کے عہد کے کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برج شہر بورسیپا (بابل) کا برج تھا اور اس نے اس کے پشتے خام اینٹ سے اور حلقہ خشت پختہ سے بنایا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان بیانات میں "اختلاف لسانی" کا کہیں ذکر نہیں۔

"اختلافات لسانی" کے بارہ میں قدیم آرمن روایت بے شک عبرانی روایت سے ملتی ہے اور قدیم میکسیکو میں بھی ایسی ہی ایک روایت دربارہ "اختلاف السنہ" پائی جاتی تھی اور وہ لوگ اسی سلسلہ میں اپنے ملک کا برج چولولا دکھایا کرتے تھے۔ میکسیکو کی روایت یہ تھی کہ طوفان سے سات نفر دیوزاد بچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک دیو نے جس کا نام زیلہوا تھا آسمان پر حملہ کرنے کے لئے چولولا کا برج تعمیر کیا مگر دیوتاؤں نے اس برج کو آگ لگا کر تباہ کر دیا اور بنانے والوں کی بولی میں اختلاف ڈال دیا۔ اسی قسم کی ایک روایت شمالی ہندوستان کی تھلرو قوم میں بھی پائی جاتی ہے جو مغل نسل سے ہے۔ مشہور انگریزی سیاح ڈاکٹر لونگسٹن

کا بیان ہو کہ ایسی ہی روایت در بارہ اختلاف السنہ افریقہ کے قبائل میں بھی پائی جاتی ہو جو جھیل نگامی کے سواحل پر آباد ہیں اور قدیم المیتھوتیہ میں بھی ایسی ہی ایک روایت مشہور تھی۔ اسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں بھی اس قسم کی روایت در بارۂ اختلاف السنہ پائی جاتی ہو۔

جارج اسمتھ کی آثاری تحقیق سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان میں برج بابل کا جو حال لکھا ہے وہ بائبل کے بیان سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہو ان کتبوں میں درج ہو کہ :-

> بعض لوگوں نے ایک شخص کی سیادت میں جس کے خیالات اچھے نہیں تھے اور جس نے تمام دیوتاؤں کے باپ سے کفر کیا تھا بابل میں ایک ٹیلہ یا پہاڑی کی وضع کا ایک برج تعمیر کرنا شروع کیا لیکن ہواؤں نے اس کا کام خراب کر دیا اور انو دیوتا نے اس ٹیلہ پر چڑھنے والے تمام لوگوں میں گڑبڑ ڈال دی ان کی بولی بھی بدل دی اور ان کے اصطلاح وغیرہ میں بھی اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ بعل دیوتا، دیوتاؤں کا باپ ہے، جس کا غیظ و غضب ان نابکار معماروں پر مشتمل ہوا اور وہ دیوتا آنو ہے جس نے ان لوگوں کو ہلاک کیا۔"

اب رہی یہ بات کہ برج بابل کہاں تھا، اس کے متعلق بجز اس کے کچھ معلوم نہیں کہ وہ بابل میں تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ برج وہاں تھا جہاں آجکل بیرو نمرود کا ٹیلہ پایا جاتا ہو یہ نواح بابل میں شہر سے آٹھ میل کے فاصلہ پر بمقام بورسیپا واقع ہے۔ اور اسے "ہیکل ہفت ادوار" کہتے تھے۔ سر ہنری رالنسن نے جب اس برج کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایک مٹی کے چبوترے پر اینٹوں سے سات منزلیں تعمیر کی گئی تھیں اور ہر منزل کا رنگ جدا جدا تھا۔ اس برج کی بلندی اس وقت بھی میدان سے ۱۵۳ فٹ بلند ہے۔ برج مذکور عرصہ دراز سے نامکمل چلا آتا تھا حتی کہ بادشاہ بخت نصر نے اس کی مرمت کرکے اسے درجۂ تکمیل

تک پہونچایا۔

ان تمام روایات اور بیانات سے ایک شخص اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے کہ برج بابل دراصل ایک رصدگاہ تھا جس میں ہیئت داں لوگ رصد کیا کرتے تھے۔ اس رصدکو آسمان پر حملہ یا خدا کی دشمنی سے تعبیر کیا گیا چونکہ وہ قدیم رصدگاہ عرصۂ دراز سے نامکمل چلی آتی تھی۔ اس لئے یہ روایت پیدا ہوگئی کہ چونکہ بانیان برج نے خدا کی شان میں گستاخی کی تھی اس لئے وہ ہلاک کردئے گئے اور برج نامکمل رہ گیا۔ عراق کے میدانوں میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں جن کی بولیاں الگ الگ ہیں اور اسی کو اختلاف السنہ کہا گیا۔

مصنفین بائبل نے لفظ بابل کو عبرانی مصدر "بلل" سے مشتق سمجھا ہے جس کے معنی ہیں "پراگندہ" کرنا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دو آشوری لفظوں "باب" اور "ایل" سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں "خدا کا دروازہ"

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی روایات میں دیوتاؤں کے رہنے کا مقام "میرو پربت" بتایا جاتا ہے۔ اس پہاڑ کی نسبت بھی یہ خیال تھا کہ وہ سات درجوں کے تعمیر کئے جاتے تھے۔ میرو پربت کے درجۂ اعلیٰ میں "برہما" کا مقام تھا اور ہیرو ووطس نے لکھا ہے کہ برج بابل کے ساتویں ہی درجہ میں "بیلس" دیوتا رہا کرتا تھا۔ یہ مماثلت بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

حضرت ابراہیم

برج بابل کی تعمیر اور مسخ زبان کے بعد سے ابراہیم کی پیدائش تک جو طویل زمانہ گذرا ہے اس کا کوئی ذکر توریت میں نہیں پایا جاتا۔ کہ اتنا زمانہ انسان نے کہاں اور کیونکر بسر کیا۔ اس میں صرف اس قدر تحریر ہے کہ مسخ زبان اور انتشار آبادی کے بعد سرزمین کنعان میں ایک قوم عبرانیوں کی پیدا ہوئی جس کے سردار

ابرآہیم تھے، یہ لوگ خیموں میں رہتے تھے اور کچھ مویشی بھی رکھتے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرتے تھے اور ساری دنیا میں یہی ایک جماعت ایسی تھی جو خدا کی مہربانی کا مرکز تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیکڑوں شہر، ہزاروں محل اور بیشمار مندر آباد تھے۔ لاکھوں انسان اوتاروں کی پرستش کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی ترقی میں مصروف تھے لیکن خدا نے ان سب کو نظر انداز کر کے صرف ابرآہیم اور ان کے خاندان کو اپنی توجہ کے قابل سمجھا۔ کیوں؟ اس کا کوئی جواب توریت میں نہیں ملتا۔

اسفار خمسہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرآہیم اور خدا کے درمیان کافی بے تکلفی تھی اور مختلف امور پر آپس میں بہت کھل کر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ "میں تیری قوم کو بہت دوں گا اور جو کوئی تیرے خاندان کی مخالفت کرے گا اسے تباہ کر دوں گا۔

یہ خوشخبری سننے کے بعد حضرت ابرآہیم سرزمین کنعان میں پہنچے۔ یہاں پھر خدا نے اپنے کو ظاہر کیا اور حکم دیا کہ ایک گائے، ایک بکری، ایک بھیڑ، ایک فاختہ اور ایک کبوتر لے کر قربانی کرو۔ چنانچہ حضرت ابرآہیم نے ان جانوروں کے دو ٹکڑے کر کے رکھ دیئے بیچ شام کو غروب آفتاب کے بعد ایک شعلہ گوشت کے ان ٹکڑوں کے درمیان پھرتا ہوا نظر آیا۔ گویا یہ علامت تھی اس امر کی کہ خدا نے قربانی قبول کر لی۔

اس کے بعد خدا نے ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کریں چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گئے لیکن عین اس وقت جب کہ یہ خون کرنے والے تھے بجائے بیٹے کے مینڈھے کی قربانی کا حکم ہوا۔

اس تمام بیان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقل سلیم قبول کرےگو خدا کا ابراہیم سے بے تکلفانہ گفتگو کرنا چند مخصوص جانوروں کو ذبح کرکے ان کے خون آلود ٹکڑوں کے درمیان روشنی کا نمودار ہونا۔ پھر انسان کی قربانی طلب کرنا اور بعدازاں مینڈھے پر راضی ہوجانا ایسی باتیں ہیں کہ خدا کی حقیقی عظمت اور اس کے بلند تصور کے لحاظ سے کسی طرح قبول نہیں کی جاسکتیں۔

خدا نے حضرت ابراہیم سے بہت وعدے کئے تھے لیکن جیسا کہ اسفار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سے کوئی پورا نہیں کیا گیا۔ خدا نے ابراہیم کو ایک بڑے قوم کا مورث اعلیٰ ہونے کی بشارت دی تھی۔ مگر پوری نہیں ہوئی۔ ایک وسیع خطۂ زمین کے مالک ہونے کی خبر دی تھی (جس میں دریائے نیل اور دریائے فرات کے درمیان کا حصہ بھی شامل بتایا گیا تھا) لیکن یہ وعدہ بھی ایفا نہ ہوا۔

جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اسحاق جانشین ہوئے پھر یعقوب اور اس کے بعد یوسف جو مصر میں صاحب اقتدار ہو گئے لیکن اس وقت یوسف اور ان کی تمام اولاد کو ملا کر کل ستر عبرانی موجود تھے۔ جو مصر میں دو سال تک رہے لیکن اس مدت میں ان کی تعداد تقریباً۔ ۳ لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ اس تعداد کا اندازہ یوں اس طرح ہوسکتا ہے کہ حسب بیان موسیٰ اس وقت۔ ۳ لاکھ جنگجو سپاہی ان کی قوم کے موجود تھے اس لئے بہ لحاظ آبادی ہر چھ آدمیوں میں سے ایک آدمی فوجی خدمت کا اہل قرار دیا جائے تو آبادی کا اندازہ کم از کم۔ ۳ لاکھ ہوتا ہے۔

اس لئے اب غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ستر آدمیوں کی مختصر آبادی ۲۱۵ سال میں ۳ لاکھ تک پہونچ سکتی ہے اور اگر اسے معجزۂ خداوندی قرار دیا جائے تو پھر یہ

بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غلاموں کی اتنی بڑی آبادی بڑھانے سے کیا فائدہ مقصود تھا اور خدا نے اتنا انتظار کیوں نہ کیا کہ یہ جماعت آزاد ہو جاتی اور اس کے بعد آبادی بڑھانے کا یہ معجزہ صادر کیا جاتا۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ ہر صدی میں چار مرتبہ دو چند ہو جاتے تھے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ستر آدمیوں کی آبادی ۲۰۰ سال کے بعد بڑھ کر زیادہ سے زیادہ ۱۷،۹۲۰ نفوس تک پہونچ سکتی تھی۔ اب باقی ۱۵ سال میں اگر یہ دو چند ہو جائیں تو بھی ۳۵،۸۴۰ سے زیادہ نہیں بڑھ سکتے تھے چہ جائیکہ ۳۰ لاکھ،

اسی زمانہ میں عبرانیوں نے مردم شماری بھی کی تھی تو معلوم ہوا تھا کہ ۲۲۲۷۳ پہلوٹی کے مرد ان کے یہاں موجود تھے۔ اگر پہلوٹی کی لڑکیاں بھی اتنی ہی فرض کر لی جائیں تو یہ تعداد ۴۴۵۴۶ تک پہونچ جائے گی۔ پھر ظاہر ہے کہ مائیں بھی اتنی رہی ہوں گی اسی لئے ۳۰ لاکھ کی آبادی کے لحاظ سے اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ پیدائش کا اوسط فی عورت ۶۷ قرار پاتا ہے جو کسی طرح قرین عقل نہیں۔

حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو غلامی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہوئے تقریباً ۲۱۵ سال کا زمانہ گذر گیا تو فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے آئندہ جو لڑکے پیدا ہوں وہ ہلاک کر دئے جائیں لیکن اتفاق سے ایک لڑکا بچ گیا جس کو فرعون کی لڑکی نے نیل میں بہتا ہوا دیکھ کر بچا لیا اور اسکی پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا۔ ایک دن اس جوان نے کسی مصری کو ہلاک کر ڈالا۔ اور بھاگ کر مدین پہونچا۔ یہاں ایک مقدس راہب سے ملاقات ہو گئی جس کی سات لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کر لی اور راہب کی بھیڑیں چرانے لگا،

اس تمام بیان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقل سلیم قبول کر سکے۔ خدا کا ابراہیم سے بے تکلفانہ گفتگو کرنا چند مخصوص جانوروں کو ذبح کرکے ان کے خون آلود ٹکڑوں کے درمیان روشنی کا نمودار ہونا۔ پھر انسان کی قربانی طلب کرنا اور بعد ازاں مینڈھے پر راضی ہو جانا ایسی باتیں ہیں کہ خدا کی حقیقی عظمت اور اس کے بلند تصور کے لحاظ سے کسی طرح قبول نہیں کی جا سکتیں۔

خدا نے حضرت ابراہیم سے بہت وعدے کئے تھے لیکن جیسا کہ اسفار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سے کوئی پورا نہیں کیا گیا۔ خدا نے ابراہیم کو ایک بڑے قوم کا مورث اعلیٰ ہونے کی بشارت دی تھی۔ مگر پوری نہیں ہوئی۔ ایک وسیع حصۂ زمین کے مالک ہونے کی خبر دی تھی (جس میں دریائے نیل اور دریائے فرات کے درمیان کا حصہ بھی شامل بتایا گیا تھا) لیکن یہ وعدہ بھی ایفا نہ ہوا۔

جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے اسحاق جانشین ہوئے پھر یعقوب اور اس کے بعد یوسف جو مصر میں صاحب اقتدار ہو گئے لیکن اس وقت یوسف اور ان کی تمام اولاد کو ملا کر کل ستر عبرانی موجود تھے۔ جو مصر میں دو سو سال تک رہے لیکن اس مدت میں ان کی تعداد تقریباً ۳۰ لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ اس تعداد کا اندازہ یوں بھی اس طرح ہو سکتا ہے کہ حسب بیان موسیٰ اس وقت ۶ لاکھ جنگجو سپاہی ان کی قوم کے موجود تھے اس لئے بہ لحاظ آبادی ہر چھ آدمیوں میں سے ایک آدمی فوجی خدمت کا اہل قرار دیا جائے تو آبادی کا اندازہ کم از کم ۳۰ لاکھ ہوتا ہے۔

اس لئے اب غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ستر آدمیوں کی مختصر آبادی ۲۱۵ سال میں ۳۰ لاکھ تک پہونچ سکتی ہے اور اگر اسے معجزۂ خداوندی قرار دیا جائے تو پھر یہ

بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غلاموں کی اتنی بڑی آبادی بڑھانے سے کیا فائدہ مقصود تھا اور خدا نے اتنا انتظار کیوں نہ کیا کہ یہ جماعت آزاد ہو جاتی اور اس کے بعد آبادی بڑھانے کا یہ معجزہ صادر کیا جاتا۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ ہر صدی میں چار مرتبہ دوچند ہو جاتے تھے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ستر آدمیوں کی آبادی دو سال کے بعد بڑھ کر زیادہ سے زیادہ ۱۷۹۲۰ نفوس تک پہونچ سکتی تھی۔ اب باقی ۱۵ سال میں اگر یہ دوچند ہو جائیں تو بھی ۳۵۸۴۰ سے زیادہ نہیں بڑھ سکتے تھے چہ جائیکہ ۳۰ لاکھ۔

اسی زمانہ میں عبرانیوں نے مردم شماری بھی کی تھی تو معلوم ہوا تھا کہ ۲۲۲۷۳ پہلوٹھے مرد ان کے یہاں موجود تھے۔ اگر پہلوٹی کی لڑکیاں بھی اتنی ہی فرض کر لی جائیں تو یہ تعداد ۴۴۵۴۶ تک پہونچ جاتی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ مائیں بھی اتنی ہی ہوں گی اس لئے ۳۰ لاکھ کی آبادی کے لحاظ سے اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ پیدائش کا اوسط فی عورت ۶۶ قرار پاتا ہے جو کسی طرح قرین عقل نہیں۔

حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کو غلامی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہوئے تقریباً ۲۱۵ سال کا زمانہ گذر گیا تو فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے آئندہ جو لڑکے پیدا ہوں وہ ہلاک کر دئے جائیں لیکن اتفاق سے ایک بچہ بچ گیا جس کو فرعون کی لڑکی نے نیل میں بہتا ہوا دیکھ کر بچا لیا اور اسکی پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا۔ ایک دن اس جوان نے کسی مصری کو ہلاک کر ڈالا اور بھاگ کر مدین پہونچا۔ یہاں ایک مقدس راہب سے ملاقات ہو گئی جس کی سات لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کر لی اور راہب کی بھیڑیں چرانے لگا۔

یہ نوجوان موسیٰ تھے

ایک دن بھیڑیں چرانے کے دوران میں ایک مشتعل جھاڑی کے اندر خدا ظاہر ہوا اور موسیٰ کو حکم دیا کہ فرعون سے جاکر بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرو اور اسی کے ساتھ ید بیضا اور عصا کا معجزہ عطا کیا۔ عصا کا معجزہ یہ تھا کہ جس وقت موسیٰ اسے زمین پر ڈال دیتے تھے تو سانپ بن جاتا تھا اور اٹھا لیتے تھے تو پھر وہی عصا کا عصا۔ ید بیضا یہ کہ جب وہ اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تھے چمکنے لگتا تھا۔

الغرض موسیٰ ان معجزات کے حربہ سے آراستہ ہوکر مصر چلے۔ ان کے بھائی ہارون بھی ان کی اعانت کے لئے مامور کئے گئے۔ مصر پہونچکر بنی اسرائیل کو جمع کیا اور معجزے دکھا کر پیام خداوندی سنایا۔ جب سب نے ان کو پیغمبر تسلیم کرلیا تو یہ فرعون کے پاس گئے اور خدا کا پیام سنا کر بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا لیکن فرعون نے اور زیادہ سختی شروع کردی۔ موسیٰ نے خدا سے عرض کیا کہ فرعون نہیں سنتا۔ حکم ہوا کہ پھر جاؤ۔ چنانچہ یہ گئے اور اس مرتبہ اپنے عصا کا معجزہ دکھایا۔ فرعون نے اپنے جادوگروں کو بلایا انھوں نے اپنی اپنی لکڑیاں سانپ بنا کر پیش کیں جنھیں موسیٰ کا عصا نگل گیا لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ فرعون نے موسیٰ کو ایک بڑا جادوگر سمجھ کر ان کا مطالبہ رد کردیا۔

حیرت ناک امر یہ ہے کہ موسیٰ و ہارون نے فرعون کے پاس جاکر کوئی ایک لفظ بھی آزادی کی حمایت اور غلامی کی مذمت میں نہیں کہا۔ انھوں نے مطلقاً بحث نہیں کی کہ نوع انسانی اپنی محنت کی پیداوار سے پورا فائدہ اٹھانے کی مستحق ہے اور ایسے مالک و آقا جو فرصت اور غلاموں کے منھ سے نوالہ چھین لیتے ہیں عرصہ تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتے اور وہ قوم جو دوسروں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی ہے خود بھی غلام ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں لیکن فرعون کے پاس پہونچکر کوئی ایک لفظ بھی پند و نصیحت کا نہیں کہتے اور فوراً عصا کو سانپ بنا کر خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا کسی مصلح یا پیغمبر کے اس طرز عمل کو مستحسن سمجھا جا سکتا ہے کہ درستی اخلاق کا درس دینے کے بجائے وہ صرف ایسے مظاہروں سے کام لے جنھیں فریق ثانی بھی شعبدے سے زیادہ کوئی حیثیت نہ دے سکے۔ اس لئے اگر فرعون نے عصائے موسیٰ کا معجزہ دیکھ کر مطالبہ آزادی کو پورا نہیں کیا تو تعجب نہ کرنا چاہئے کیونکہ خرق عادات کی نمائش اصلاح اخلاق کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے دوسرا معجزہ دکھایا کہ اپنے عصا کی ضرب سے نہ صرف دریائے نیل بلکہ تمام چشموں، جوہڑوں، کنوؤں حتیٰ کہ گھر کے اندر ظروف میں رکھے ہوئے پانی کو بھی خون میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کے ساحروں نے بھی ایسا ہی شعبدہ دکھایا درآنحالیکہ پانی باقی ہی نہ رہا تھا جسے وہ خون میں بدل دیتے۔ اس معجزۂ قہر و غضب کا یہ نتیجہ ہوا کہ دریائے نیل کی تمام مچھلیاں مر کر سڑنے لگیں اور تمام مصر پانی کے لئے تڑپنے لگا آخر کار انھوں نے نئے کنوئیں کھودے اور اپنی پیاس بجھائی۔ اس واقعہ کے بعد سات دن تک موسیٰ و ہارون نے انتظار کیا لیکن فرعون نے بنی اسرائیل کو آزاد نہ کیا۔ خدا نے اس مرتبہ مینڈکوں کا عذاب نازل کیا اور زمین کا چپہ چپہ ان جانوروں سے ڈھک گیا۔ ساحران فرعون نے خود بھی اس معجزہ کا جواب اسی طرح دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مینڈکوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا فرعون اس عذاب سے گھبرا اٹھا اور اس نے موسیٰ کو بلا کر کہا کہ اس مصیبت سے مجھے نجات دلاؤ میں بنی اسرائیل کو آزاد کر دوں گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کی دعا سے یہ عذاب مرفوع ہو گیا مگر فرعون پھر اپنے وعدے سے پھر گیا۔

اس کے بعد خدا نے کلینوں کا عذاب مسلط کیا مگر فرعون نے وعدہ خلافی کی، مکھیوں کا عذاب نازل کیا لیکن وہ نہ مانا۔ مری میں مصر کے تمام مویشی ہلاک کر دئے وہاں کے تمام باشندوں کو جلدی امراض میں مبتلا کر دیا۔ ژالہ باری سے تباہ کیا، ٹڈیوں کو مسلط کیا نہایت شدید قسم کی تاریکی پھیلائی لیکن فرعون وعدے کر کر کے پھر گیا آخر کار خدا نے موسیٰ کے ذریعہ سے فرعون کو کہلا بھیجا کہ مصر میں جتنی اولادیں پہلوٹی کی ہیں وہ آج کی رات فنا کر دی جائیں گی۔ چنانچہ اس خیال سے بنی اسرائیل کے گھرانے اس عذاب سے بچے رہے۔ ان کے گھروں پر خون کے چھاپے لگ گئے تاکہ خدا کا فرشتۂ عذاب غلطی سے کہیں بنی اسرائیل کے لوگوں کو ہلاک نہ کر دے۔ آخر کار رات کو یہ عذاب نازل ہوا اور مصریوں کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس سے صبح کو جنازہ نہ نکلا ہو، اور اس مرتبہ فرعون نے بمشکل تمام بنی اسرائیل کو آزاد کیا۔

اس تمام بیان کو پڑھنے کے بعد یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ فرعون کو راہ راست پر لانے کے لئے پے در پے اتنے عذاب اہل مصر پر کیوں نازل کئے جب کہ اسے معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی عذاب کارگر نہ ہوگا۔ اگر خدا جانتا تھا اور یقیناً جانتا ہوگا کہ جب تک مصر والوں کی پہلوٹی کے لڑکے فنا نہ ہوں اس وقت تک فرعون بنی اسرائیل کو آزاد نہ کرے گا تو پہلے ہی یہ عذاب کیوں نہ مسلط کر دیا گیا اور درمیانی متعدد عذاب نازل کرنے کی زحمت کیوں گوارا کی گئی۔

علاوہ اس کے سب سے زیادہ عجیب غریب بات یہ ہے کہ گناہ تو فرعون کا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد نہ کرتا تھا لیکن مصیبت میں مبتلا کیا گیا مصر کی تمام آبادی کو جس میں معصوم عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی شامل تھے اور وہاں کے تمام جانوروں کو جنھوں نے کوئی قصور نہ کیا تھا کیا خدا یہ نہ کر سکتا تھا کہ صرف فرعون کو شدائد میں مبتلا کر کے نافرمانی

کی سزا دیتا یا اگر بنی اسرائیل کی آزادی یا فرعون کی اصلاح مقصود تھی تو وہ اسکے خیال کو بدل دیتا اور اس کے دل میں رحم و نرمی پیدا کر کے مقصد حاصل کر لیتا۔ اسی کے ساتھ دوسرا تعجب خیز امر یہ ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے اندر لاکھوں کی تعداد میں پلائے جاتے تھے چھ لاکھ نبرد آزما جوان ان میں موجود تھے۔ ایک چھوڑ دو دو پیغمبر موسیٰ و ہارون ان کی حمایت کر رہے تھے۔ خدا کی طرفداری کا یہ عالم تھا کہ بار بار فرعون اور اہل مصر پر عذاب نازل کر رہا تھا لیکن خود ان کے اندر ظلم و استبداد کے مقابلہ کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا اور بے حس جانوروں کی طرح سر نیوالے تمام تکلیفیں غلامی کی برداشت کر رہے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی بزدل، ناکارہ، کم ہمت اور بے غیرت قوم کی طرفداری کا خیال خدا کو کیوں پیدا ہوا اور اگر ایسی ہی خاطر منظور تھی تو کیوں نہ ان کے اندر مردانہ جوش اور ولولۂ حریت پیدا کر دیا کہ وہ خود اپنی ہمت و پامردی سے آزادی حاصل کر لیتے۔

بنی اسرائیل کی ہجرت جب متعدد و پیہم عذاب نازل ہونے کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دیدی تو یہ سب کے سب مع اپنے گلوں اور اسباب کے خانہ بدوشوں کی طرح ایک رات مصر سے باہر نکلے۔ کہا جاتا ہے کہ روانگی کا وقت مقرر کر دیا تھا اور تمام افراد بیک وقت سب کے سب ایک ساتھ روانہ ہو گئے اور صحرائے سینا میں جا کر پناہ لی۔

اس بیان کو صحیح باور کرنے کے لئے عقل انسانی کو کتنی جگہ تامل کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ زیادہ دشوار نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ فرعون کی پروانگی حاصل کرنے کے بعد فوراً ۳۰ لاکھ افراد کا ایک ہی وقت میں

روانہ ہو جانا کیونکر قابل عمل تھا۔ اور حضرت موسیٰ نے کیونکر اپنی قوم کے ۲۰ لاکھ افراد کو اس قدر جلد وقت روانگی کی اطلاع دیدی کہ وہ سب دفعتاً تیار ہو کر ایک ساتھ روانہ بھی ہو گئے

اس زبردست جماعت میں ۶ لاکھ تو صرف وہ نوجوان تھے جو نبردآزمائی کر سکتے تھے۔ بچے، عورتیں اور بوڑھے ان کے علاوہ تھے اب غور کیجئے کہ یہ جا کہاں رہے تھے؟ صحرا سینا میں۔ یعنی اس صحرا میں جس کی خشکی و ویرانی کے سامنے صحرا اعظم گویا باغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں یہ ۴۰ سال تک رہے لیکن عقل حیران ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے لئے ایسے خشک و بے آب و گیاہ صحرا میں سامان خورد و نوش کہاں سے میسر آیا۔ ان کے ساتھ بھیڑیں اتنی کثرت سے موجود تھیں کہ ایک بار بنی اسرائیل نے ایک لاکھ پچاس ہزار پہلوٹی کے بچوں کی قربانی کی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بھیڑوں کے اتنے بڑے بے شمار گلوں کے لئے جن کو لاکھوں ایکڑ چراگاہ کی ضرورت تھی۔ اس ریگستان میں کیونکر زندہ رکھا گیا۔

خدا بنی اسرائیل کو ارض فلسطین کی طرف سے نہیں لے گیا۔ اس خوف سے کہ مبادا یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر وہ پھر مصر واپس چلے جائیں بلکہ صحرا کے راستہ کو بحر احمر تک لے گیا اور اس سفر کی شان یہ تھی کہ دن کو بادلوں کا ایک ٹکڑا ان کی رہنمائی کرتا تھا اور رات کو آگ کا ستون۔

جب فرعون کو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل بھاگ گئے تو اس نے ۶۰۰ رتھوں پر اپنے سپاہیوں کو بٹھا کر ان کا تعاقب کیا اور ساحل تک پہونچتے پہونچتے ان کو جا لیا۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب حضرت موسیٰ کی بد دعا سے وبا میں مبتلا ہو کر مصر کے تمام جانور فنا ہو چکے تھے اور طاعون نے وہاں کی بہترین آبادی کو ختم کر دیا تھا

تو ۶۰۰ رتھوں کے لئے گھوڑے اور سپاہی کہاں سے آ گئے؟

اسی کے ساتھ اسفار موسیٰ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مصریوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے (درآنحالیکہ ان میں ۶ لاکھ جنگجو نوجوان موجود تھے) اور یہ خوف اس درجہ غالب ہوا کہ آخر کار حضرت موسیٰ کو پھر معجزہ سے کام لینا پڑا۔ یعنی اپنے عصا کے اشارے سے پانی کے دو حصے کر دئے جس سے درمیان میں راستہ پیدا ہو گیا اور بنی اسرائیل اس سے عبور کر گئے لیکن جب مصری فوج عبور کرنے لگی تو خدا نے رتھوں کے پہئے الگ کر دیئے اور جس وقت وہ بیچ دریا میں پہونچے تو بٹا ہوا پانی پھر مل گیا، اور سب کے سب غرق ہو گئے۔

اول تو یہ بات نہایت عجیب و غریب ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی بنی اسرائیل کی بزدلی و کم ہمتی بدستور باقی رہی اور باوجود ۶ لاکھ نبرد آزما سپاہ رکھنے کے انکو مصریوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی (حالانکہ ۶۰۰ رتھوں میں زیادہ سے زیادہ ۵۰ یا ۶۰ ہزار سے زیادہ آدمی نہ رہے ہوں گے) اور حضرت موسیٰ کو اپنے معجزے کے دامن میں پناہ لینا پڑی علاوہ اس کے یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ عصا کے اشارہ سے پانی پھٹ کر دو دیواروں کی طرح علیحدہ علیحدہ کیونکر قائم ہو گیا اور خدا نے رتھوں کے پہئے علیحدہ کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کی؟

اب دیکھئے یہ لوگ جا کہاں رہے تھے۔ یا اس ارض موعودہ کی طرف جا رہے تھے جس کا رقبہ ۱۲ ہزار میل سے زیادہ نہ تھا اور جو سوا خشک چٹانوں اور بے آب و گیاہ ویرانیوں کے کچھ نہ تھا۔ یہاں پہلے سے کتنے لوگ آباد تھے اس کے متعلق حضرت موسیٰ کا بیان ہے کہ یہاں سات قومیں یہودیوں سے زیادہ قوی آباد تھیں۔ اس کے معنی یہ ہیں

کہ یہودیوں کی ۳۰ لاکھ آبادی کے مقابلے میں ان کی تعداد کم از کم ۲ کروڑ رہی ہوگی جن کو خدا نکال کر یہودیوں کو بسانا چاہتا تھا لیکن خدا کا یہ مقصود نہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فوراً ادھر کنعان تک پہونچادے اس لئے انھیں ۴۰ سال تک برابر صحرا میں سرگرداں رکھا یہاں تک کہ سوا دو کے باقی سب فنا ہوگئے۔

جب بنی اسرائیل نے بحر احمر کو عبور کیا تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں غذا کا کوئی سامان فراہم نہیں ہوسکتا اور پانی اس قدر شور ہے کہ اس کا پینا محال ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ نے خدا سے دعا کی تو ایک درخت نمودار ہوا جس کو کاٹ کر حضرت موسیٰ نے پانی میں ڈال دیا اور پانی شیریں ہوگیا۔ غذا کے لئے خدا نے یہ تدبیر کی کہ رات کو چھوٹے چھوٹے اولوں کے برابر ایک گول سی چیز آسمان سے برسائی جو سورج کی گرمی سے تو پگھل جاتی تھی لیکن آگ میں اس کو بھون سکتے تھے اس کا نام مَن تھا۔ اس پر ۴۰ سال تک انہوں نے بسر کی یہاں تک کہ وہ اس سے بیزار ہوگئے اور گوشت وغیرہ طلب کرنے لگے جس پر خدا بہت برہم ہوا اور انھیں لوگوں کو جن سے دودھ اور شہد رکھنے والی سرزمین کا وعدہ کیا گیا تھا سانپوں سے ڈسوا دیا گیا۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے گوشت اور لہسن پیاز وغیرہ کی خواہش کی تو خدا نے نہایت زبردست آندھی چلائی جس سے ایک پرندہ جس کا نام (وہ) سلویٰ ہے خیموں پر آکر گرنے لگا اور ایک مہینہ تک اس قدر گوشت ان کو کھلایا کہ آخرکار وہ ان کے ناک منھ سے باہر آنے لگا اور پھر سانپ سے ڈسوا لینے کے بعد طاعون کی بلا ان پر نازل کی۔

اس بیان میں بعض باتیں نہایت عجیب و غریب ہیں اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ صحرا میں درخت کا نمودار ہونا۔ اس کی مدد سے شور پانی کا شیریں

ہو جانا، من وسلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا یہ سب کچھ معجزہ تھا تو بھی یہ امر کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ خدا اپنی اس برگزیدہ قوم سے (جس کی نجات کے لئے تمام مصریوں کو تباہ کرنا گوارا کیا گیا) صرف اس بناء پر کہ وہ ایک ہی قسم کی غذا ۴۰ سال تک کھاتے کھاتے اکتا گئی تھی کیوں برہم ہو گیا اور اس میں ان کا کیا قصور تھا۔ یہ بالکل فطرت انسانی ہے کہ مسلسل ہفتہ عشرہ تک ایک ہی غذا کھانے کے بعد اس سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے چہ جائیکہ مسلسل ۴۰ سال۔ اس لئے ان کے اس مطالبہ پر برہمی اور وہ بھی اس حد تک کہ انھیں سانپوں سے ڈسوایا گیا۔ طاعون میں مبتلا کیا گیا۔ کیونکر جائز و مناسب قرار دیا جا سکتا ہے؟

وہ خدا جو اپنے برگزیدہ بندوں کے لئے من وسلویٰ نازل کر سکتا تھا اس کی قدرت سے یہ امر باہر تھا کہ وہ غذا میں تنوع پیدا کرتا رہتا اور اس فطرت انسانی کی رعایت کرتا جو خود اس کی پیدا کی ہوئی ہے؟

اسفار موسیٰ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحرا کے دوران قیام میں بنی اسرائیل کا لباس بھی بوسیدہ نہیں ہوا اور جو جوتے وہ پہنے ہوئے تھے وہ بھی نہیں پھٹے۔ بعض مفسرین کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے لباس وغیرہ کی نگہداشت خدا نے محض مخصوص فرشتوں کے سپرد کر دی تھی جو ان کا لباس آکر درست کر دیا کرتے تھے اور پھٹے ہوئے جوتے ٹانک دیا کرتے تھے لیکن یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ اگر ۴۰ سال تک لباس وغیرہ وہی رہا تو کیا بچوں کی عمروں کے ساتھ ان کا لباس بھی بڑھتا رہا اور پاؤں کی درازی کے ساتھ ساتھ جوتوں کا سائز بھی بڑا ہوتا گیا۔

خدا نے بنی اسرائیل کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ صحرا میں درخت نصب کریں درآنحالیکہ وہاں اس سے قبل گھاس تک کا بھی وجود نہ تھا تو کیا بنی اسرائیل مصر سے اپنے درختوں

کے تخم بھی لائے تھے جو انھوں نے وہاں بوئے اور اگر بوئے تھے تو ان کے نشو ونما کی کیا صورت تھی جبکہ پانی کا وہاں وجود نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ بغیر پانی کے تخم یا درخت کو بارآور کردے تو کیا اس کی قدرت سے دور تھا کہ صحرا کو دفعتاً چمنستان میں تبدیل کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور ایک محال بات کے انجام دینے پر بنی اسرائیل کو مجبور کیا۔

حضرت موسیٰ کو ایک خاص قسم کا خوشبودار تیل بنانے کا بھی نسخہ خدا نے بتایا جو حنا و زیتون وغیرہ مختلف درختوں کے پھلوں پھولوں سے تیار ہوتا تھا اس تیل سے بپتسمہ دیا جاتا تھا اور اس نسخہ کو نہایت راز رکھا گیا تھا اور یہاں تک کہ اگر سوائے موسیٰ اور ہارون کے کوئی اور یہ تیل بنانے کی جرأت کرتا تو اس کے لئے خدا کا حکم یہ تھا کہ مار ڈالا جائے۔

اوّل تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس صحرا کی ویرانی و خشکی کا یہ عالم ہو کہ لوگوں کا سامان خورد و نوش فراہم نہ ہو سکے وہاں عطریات پیدا کرنے والے درخت کہاں سے آ گئے اور اگر حضرت موسیٰ نے کوئی تیل ایسا تیار کیا تھا تو دوسروں کو کیوں ممانعت کی گئی اور اس میں ایسی کیا خصوصیت تھی کہ سوائے حضرت موسیٰ کے کسی اور کو اس کی تیاری کی اجازت نہیں دی گئی۔ اسی صحرا کے دورانِ قیام میں یہودیوں کو یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ بطور کفارۂ گناہ ہر جننے والی ماں "فاختہ کا ایک جوڑا" موہدوں کے پاس لائے جس کا کھانا ان پر فرض تھا جس وقت خدا کا یہ حکم نازل ہوا ہے اس وقت یہودیوں کی آبادی ۲۰ لاکھ تھی اور موہدوں کی تعداد صرف تین تھی۔ اگر سب پیدائش کا اوسط روزانہ ________ ۳۰۰ رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر موہد کو روزانہ دو دو سو فاختہ یا کبوتر کھانے پڑتے تھے جو بالکل خلاف عقل ہے اس وقت ایک عورت بچہ جننے کے بعد بالکل ناپاک سمجھی جاتی تھی۔ اگر وہ لڑکا

جنتی تھی تو ۴۰ دن تک کسی مقدس چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی اور لڑکی جننے کی صورت میں پورے ۸۰ دن تک اس کی نجاست قائم رہتی تھی پھر کیا کوئی وجہ اس کی بتائی جا سکتی ہے کہ بچہ جننا گویا ایک عورت کو نجس و گناہگار بنا دیتا تھا اور یہ گناہ کبوتر یا فاختہ کے ذبح کرنے اور موبدوں کو شکم پری کے بعد کیوں دور ہو جاتا تھا اور لڑکے اور لڑکی میں کیا فرق تھا کہ ایک کی ولادت کے بعد تو وہ صرف ۴۰ دن تک نجس قرار دی جائے اور دوسرے کی ولادت کے بعد ۸۰ دن۔

الواح موسیٰ کے متعلق مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں ایک یہ کہ جب وہ خدا سے ہمکلام ہونے کو طور پر گئے تو وہاں دو تختیاں پتھر کی خدا کی طرف سے دی گئیں جن پر احکام عشرہ درج تھے۔ جب آپ واپس آئے تو دیکھا کہ لوگوں نے سونے کا بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ آپ بہت برہم ہوئے۔ تختیاں زمین پر پٹک کر توڑ ڈالیں۔ بچھڑے کو جلا کر اس کا سفوف پانی میں ملایا اور بنی اسرائیل کو اس کے پینے پر مجبور کیا۔

دوسری روایت میں نہ تختیوں کے توڑنے کا ذکر ہے نہ بچھڑے کا۔ تیسری میں احکام عشرہ کچھ اور بتائے گئے ہیں۔ آخری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جب کوہ سینا پر گئے تو بنی اسرائیل زیور ہارون کے پاس لائے اور انھوں نے اس زیور کو گلا کر سونے کا بچھڑا تیار کیا اور جب موسیٰ واپس آئے تو انھوں نے اس بت پرستی میں ان کو مبتلا دیکھ کر بہت غصہ کیا اور تین ہزار آدمی تہ تیغ کر دیئے۔

قطع نظر اس سے کہ خدا کے ہمکلام ہونے اور اپنے پاس پتھروں کی منقوش تختیاں دینے کا تصور بجائے خود ناقابل قبول ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اگر موسیٰ کے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی تو انھوں نے خدا کے کس حکم کی نافرمانی کی، اس وقت تک احکام عشرہ لے کر موسیٰ واپس نہ آئے تھے اور کوئی شریعت قائم

نہ ہوئی تھی اس لئے بنی اسرائیل کو ایسے جرم میں ماخوذ کرنا جو فی الحقیقت اس وقت تک جرم ہی قرار نہ پایا تھا، انصاف سے بالکل بعید تھا۔ ہمیشہ قانون کے نفاذ کے بعد جرم و سزا کی تعیین ہوا کرتی ہے اور نفاذ شریعت سے قبل کوئی فعل قابل سرزنش نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ احکام عشرہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ فلاں بات کرو اور فلاں بات نہ کرو اور اس میں یہ کہیں درج نہ تھا کہ اگر ان احکام کی خلاف ورزی کی تو سزا دی جائے گی۔ قانون صرف یہی نہیں بتاتا کہ یہ فعل اچھا ہے یا بُرا بلکہ وہ اس سے نافرمانی کرنے والوں کی سزا بھی متعین کرتا ہے اس لئے اگر احکام عشرہ کی تبلیغ کے بعد بنی اسرائیل سرتابی کرتے تو بھی وہ مستحق سزا نہ تھے کیونکہ سزا کی تعیین احکام عشرہ میں پائی نہیں جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ احکام عشرہ ہی تمام دنیا کے قانون و انصاف کی بنیاد ہیں لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ موسیٰ کی پیدائش سے ہزاروں سال قبل مصر میں جو قانون رائج تھا اس میں نہ صرف چوری، زنا، قتل، جھوٹ وغیرہ کی سزائیں مقرر تھیں بلکہ تمدنی تعلقات کے سلسلہ میں اور جتنے جرائم ہو سکتے ہیں ان سب کی صراحت اس میں موجود تھی اور وہ "احکام عشرہ" سے بدرجہا زیادہ مکمل تھا۔ قانون ہمیشہ انفرادی و اجتماعی احساس تحفظ کے تحت بنا کرتے ہیں اور ضروریات تمدن اور مخصوص واقعات و حالات کے لحاظ سے ان میں تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے اس لئے تمام شریعتیں یا قوانین حقیقتاً نتیجہ ہیں انسان کے احساس اجتماعی کا اور اس میں الہام و پیغمبر کے دخل کی توجیہہ ممکن ہی نہیں۔

بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی عظمت و صداقت کے اعلان کے لئے بنی اسرائیل کا انتخاب کیا تھا اور اسی لئے وہ متعدد بار ———— کوہ سینا کی بلندی پر آگ اور بادل کے ملبوس میں ظاہر ہوا اور ہزاروں معجزے بنی اسرائیل کی اصلاح و تعلیم کے لئے دکھائے

ان کی خاطر اس نے سمندر کے پانی کو شق کر دیا۔ آسمان سے روٹیاں برسائیں۔ ان کی پیاس بجھانے کے لئے خشک چٹانوں سے چشمے پیدا کئے۔ ان کے دشمنوں پر طرح طرح کے عذاب نازل کئے۔ الغرض چالیس سال تک ان کی حفاظت کی۔ پھر بھی بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ جب کوئی مصیبت ان پر نازل ہوتی تھی تو وہ پتھر اور لکڑی کے دیوتاؤں سے التجا کرتے تھے پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہی خدا جس نے بنی اسرائیل کے لئے یہ سب کچھ کیا وہ ان کے دلوں میں اپنی صحیح عظمت و جلالت پیدا نہ کر سکا اور کیا بنی اسرائیل کی انھیں نافرمانیوں کو دیکھ کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی برگزیدہ قوم تھی اور اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے اس نے اس قوم کا انتخاب کیا تھا۔

اگر کہا جائے کہ انھوں نے خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ موسیٰ کی پیدائش سے بہت پہلے یہ عقیدہ موجود تھا اگر دعوےٰ کیا جائے کہ انھوں نے حقوق ملکیت کی تعیین کی تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ چوری حضرت موسیٰ سے پہلے بھی جرم سمجھی جاتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ قربانیاں کرنا انھوں نے سکھایا تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہودیوں کے وجود سے ہزاروں سال قبل قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ اسی طرح قتل، جھوٹ وغیرہ کو بھی ہمیشہ برا سمجھا گیا اور اسفار خمسہ میں اگر ان کو برا بتایا گیا تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پس یہ دعویٰ کرنا کہ اسفار موسیٰ کی تحریر بغیر الہام خداوندی کے ممکن ہی نہ تھی اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ ذہن انسانی سے بہت بلند ہے کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

گلیلو سرعت جوہری VIRTUAL VELOCITY کے میکانکی اصول بتاتا ہے لیکن اسے الہامی نہیں کہتے۔ کوپرنیکس کرۂ زمین کی صحیح پوزیشن کو متعین کرتا ہے لیکن الہام سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ نیوٹن نظریۂ کشش ثابت کرتا ہے مگر اسے الہامی کوئی نہیں کہتا۔ اسی طرح [illegible] … [illegible] فرینکلن وغیرہ ریاضیات، میکانکیات

اور علم الکیمیا وغیرہ کے متعلق بیش بہا اختراعات واکتشافات پیش کرتے ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی الہامی نہیں مانی جاتی۔ لیکن اسفار خمسہ جن میں ایک کوئی بات بھی عقل سے تعلق نہیں رکھتی الہامی ہیں اور جو کوئی انھیں منجانب اللہ نہ سمجھے وہ بے دین اور کافر ہے۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ چین، ہندوستان، مصر، یونان اور روما کے قوانین جو اس قدر مکمل تھے دماغ انسانی کا نتیجہ سمجھے جائیں اور اسفار خمسہ جو نہایت نامکمل شریعت کو پیش کرتے ہیں۔ ان کو الہامی قرار دیا جائے۔

یونس اور مچھلی

بائبل کی کتاب "صحیفہ یونس نبی" میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"وہ حسب تعمیل کلام خداوند نینوا کو جا رہا تھا اور نبی یونس کو اسی کے کہنے پر طوفانی سمندر میں ڈال دیا گیا (صحیفہ یونس باب ۱ آیۃ ۱۲) مگر خدا نے نہ چاہا کہ یونس کو نینوا نہ جانے کی وجہ سے سمندر میں غرق کر دے۔ پس خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ وہ یونس کو نگل جائے اور یونس تین شب روز مچھلی کے پیٹ میں رہا (صحیفہ یونس باب ۱ آیت ۱۷) پھر یونس پاتال کی بطن میں سے چلایا (یونس باب ۲ آیۃ ۲) اور نجات کے لئے دعا مانگی۔"

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونان کے باشندے بھی اپنے دیوتا ہرقلیس کے متعلق یہی روایت بیان کرتے تھے کہ یافہ کے قریب (جہاں یونس کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ وہ بھی تین دن تین رات اس کے پیٹ میں رہا۔ دونوں روایتوں میں صرف اس قدر فرق ہے کہ یونس تو مچھلی کے پیٹ سے صحیح و سالم نکل آئے تھے مگر ہرقلیس کے سر کے بال گل گئے تھے (ملاحظہ ہو برنارڈ ڈی مونتفاکن کی کتاب (ANTIQUITE EOXPBICA) جلد اول صفحہ ۲۰۴ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۷۲۲ء۔

ڈاکٹر گاڈفرے ہگنس کا بیان ہے کہ یونس اور مچھلی کی داستان یونانی دیوتا ہرقلیس کی داستان کا ایک حصہ ہے جو "ہرقل نامہ" میں بیان کی گئی ہے (ملاحظہ ہو کتاب (ANACLYPSIS) جلد اول صفحہ ۶۳۸ نیز ٹائلر صاحب کی کتاب (PRIMITNE CULTURE) جلد اول صفحہ ۳۰۶ مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء)

عرصہ ہوا جرمنی کے مشہور سریآ وردہ پروفیسر دینیات روزنمیوگر نے لکھا تھا کہ صحیفہ یونس میں جو معجزہ درج ہے وہ محض ایک تمثیل ہے جس کی بنیاد ایک قدیم فنیقی روایت پر قائم ہے کہ ہرقلیس ایک حسینہ ہزیونی کو کسی عظیم الجثہ خونخوار بحری جانور سے بچانے کے لئے اس کے منہ میں کود پڑا تھا اور تین دن اور تین رات اس کا پیٹ پھاڑتا رہا۔

ہرقلیس اور یونس کی طرح کا ایک قصہ ہندوؤں کی کتاب "سوم دیو بھاڑ" میں بھی درج ہے، ملاحظہ ہو ٹائلر صاحب کی کتاب "بنی نوع انسان کی قدیم تاریخ" (EARBY HISTORY OF MAN KIND) صفحہ ۳۴۴/۳۴۵)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات درحقیقت تمثیلی ہیں جن سے مراد آفتاب کا طلوع و غروب ہے یا بالفاظ دیگر رات کا آفتاب کو نگل لینا اور صبح کو اگل دینا۔

قدیم زمانہ کی بہت سی قوموں میں آفتاب کو "جوناہ" کہا کرتے تھے قوم باسک میں آفتاب کا نام "جونا" جون یا جونا تھا۔ ٹرجن قوم بھی آفتاب کو "جونا" کہتی تھی اور پارسیوں میں آفتاب کا نام جوناہ تھا۔ ناروے اور سویڈن میں آفتاب کو "جان" کہتے ہیں۔ الغرض یونس ہوں یا ہرقلیس یا کوئی اور ان سب سے مراد آفتاب ہے اور مچھلی سے مراد زمین ہے چنانچہ جزائر بحر جنوبی کی روایات قدیمہ میں زمین کو ایک بہت بڑی مچھلی ہی سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اب رہا تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں

رہنا، سو اس سے مراد غالباً ۲۲ر دسمبر سے ۲۵ر دسمبر تک کا زمانہ ہے جب آفتاب سب سے نیچے کے درجہ میں ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ اس منزل سے گذر جاتا ہے (ملاحظہ ہو گولڈ زیہر کی کتاب (HEBEDS MYTHOLOGY) صفحہ ۱۰۲

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی نے اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا تھا

۵ قرص خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہان ماہی شد

شیطان

بجواب استفسار

شیطان، عفریت یا جن کے وجود کا خیال بہت قدیم خیال ہے اور انسان کے اس عہد وحشت کی یادگار ہے جب طبیعیات کے مناظر سے وہ حال ہی میں آشنا ہوا تھا۔ اور نظام فطرت کے رموز و نوامیس سے قطعاً اسے آگاہی نہ تھی۔ فطرت کے ان برکات کے ساتھ ساتھ جو اسے کاشتکاری و فراہمی غذا و لباس میں مدد کرتی تھیں جب وہ آفات ارضی و سماوی سے دو چار ہوتا تھا تو کبھی وہ خیال کرتا تھا کہ یا سی قوت کا عنصر ہے جو اس کی مسرت و نشاط کی ضامن ہے اور کبھی وہ اس کو کسی اور قوت سے منسوب کر کے سمجھتا تھا کہ یہ قوت ان دیوتاؤں کی قوت سے تو کمتر درجہ کی ہے جو اس پر مہربان ہیں لیکن انسان کے معاملات میں وہ ضرور دخیل ہو سکتی ہے۔ بعد کو رفتہ رفتہ یہ سمجھا جانے لگا کہ بعض روحیں ایسی ہیں جو دیوتاؤں اور

انسانوں کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں بعض انسان کی خیر خواہ و محافظ ہیں اور بعض اس کی دشمن۔

خیر و شر کے لئے دو علیحدہ علیحدہ قوتیں تسلیم کرنے میں قدیم ایرانی مذہب کو خاص شہرت حاصل ہے جس نے یہودی مذہب کو بھی متاثر کیا اور پھر اس سے عیسویت نے اسی خیال کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ جزو مذہب بنا لیا اور تو اس عالم کو اچھی اور بری روحانی قوتوں کے زیر اثر تسلیم کر کے فرشتوں اور شیطانوں کے وجود کے قائل ہو گئے۔

مسلمان چونکہ یہود و نصاریٰ دونوں کے مذاہب سے متاثر تھے اس لئے ان کے یہاں اس عقیدہ میں اور زیادہ غلو نظر آتا ہے ان کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم سے بھی دو ہزار سال قبل وہ جن کے وجود کو تسلیم کرتے تھے لیکن چونکہ جن نے خدا کی نافرمانی کی اس لئے وہ مردود قرار دیئے گئے۔ ان منکرین کا سردار ابلیس تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اور اس کی ذریات کا نام شیطان ہے عفریت کا مرتبہ ذرا کم ہے لیکن نہ اتنا کم کہ انسان اس سے بے خوف رہے اس طرح کے اور متعدد نام اسلامی روایات میں پائے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے عقیدۂ ابلیس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی اور ہزاروں قصے اس سلسلے میں گھڑ ڈالے گئے جو یکسر "خرافات" کے تحت آتے ہیں۔

انسان اپنے عہد وحشت میں بھی خبیث روحوں کے وجود کا قائل تھا اور اسے یقین تھا کہ اکثر بیماریاں انھیں روحوں کے حلول کر جانے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ آج بھی بہت سے لوگ عورتوں کے مرض اختناق الرحم (ہسٹریا) کو بھوت پریت کا اثر بتاتے

ہیں اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ سے اس کا ازالہ چاہتے ہیں۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے لٹریچر میں شیطان، عفریت، جن اور ارواح خبیثہ کا وجود نہ پایا جاتا ہو اور اس کا سبب یہی ہے کہ جب انسان اپنے عہد جاہلیت میں حقائق سے بے خبر تھا تو وہ بہت سی باتوں کو غیبی قوت کا مرکز سمجھا کرتا تھا۔ اور جب کوئی مصیبت اس پر نازل ہوتی تھی تو وہ اسے کسی غضبناک مخالف قوت سے منسوب کیا کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس عقیدہ میں اوہام انسانی نے عجیب عجیب اضافے کئے یہاں تک کہ وہ علم الاصنام کی ایک مستقل شاخ بن گیا جو تمام وحشی اقوام میں اب ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

سلافی قوم کا خون چوسنے والا عفریت (جسے انگریزی میں (Vamhire) کہتی ہیں) اسیریا کی عورتوں کا ہم صحبت والا شیطان، ہندوؤں کا راکشس جو مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے، جاپان کا اوتی جو طوفان لاتا ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے شیطان مختلف ممالک کے لٹریچر میں نظر آتے ہیں۔ اکثر قوموں میں شیطان کا تصور اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ لنگڑا تا ہے۔ اس خیال کا اصل یہ سبب یہ عقیدہ ہے کہ شیطان اوّل اوّل جنت سے باہر پھینک دیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ جو اتنی بلندی سے گرایا جائے گا وہ اگر مرے گا نہیں تو لنگڑا ضرور ہو جائے گا۔

یورپ کا شیطان پھٹا ہوا کھر رکھتا ہے کیونکہ وہ زیادہ تر جانوروں ہی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ ان جانوروں میں جن کی شکل وہ اختیار کرتا ہے خاص خاص یہ ہیں: سانپ (وہی جنت والا سانپ) خرگوش، بکرا۔ کوّا۔ کتّا۔ بلّی۔ چنانچہ آپ نے اب بھی ہندوستان کے بعض مسلمان گھرانوں میں دیکھا ہوگا کہ سیاہ کتّے اور سیاہ بلّی کو جن سمجھ کر

کچھ نہیں کہتے۔ ہمارے فاضل اسلاف میں سے بعض نے نصیحت کی ہے کہ جب سانپ نظر آئے تو اسے فوراً ہلاک نہ کرو بلکہ اس سے پہلے یہ کہو کہ اگر جن ہے تو چلا جائے ورنہ کھڑا رہے، اگر اس تنبیہہ کے بعد بھی وہ نہ جائے تو اس کے ہلاک کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

سفید اقوام میں شیاطین کو اکثر سیاہ فام دکھایا گیا ہے لیکن افریقہ میں اس کا رنگ سفید ہے کیونکہ جس طرح گورے رنگ کی قوموں میں سیاہ رنگ کو برا سمجھا جاتا ہے اسی طرح حبشیوں کے نزدیک سفید رنگ مکروہ ہے کیونکہ وہ گورے آدمیوں کو بہروپ سمجھتے ہیں

مسلمانوں میں دوزخ کا عقیدہ بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے جہنم کا اصل عقیدہ یہود کا تھا۔ جسے وہ شیاطین کے رہنے کی جگہ سمجھتے تھے اور جہاں سوا آگ کے اور کچھ نہ تھا، یہودیوں کے یہاں یہ خیال اس عہد قدیم کی یادگار تھا جب آگ کا ایک مستقل دیوتا علیحدہ قرار دیا جاتا تھا اور جو بعد کو اس منصب سے علیحدہ کر کے شیطان بنا دیا گیا۔

آگ اور شیطان کے تعلق کا پتہ اکثر اقوام کی روایات سے چلتا ہے۔ چنانچہ یوروپین اقوام کا یہ عقیدہ کہ شیطان پانی کو عبور نہیں کر سکتا اور مسلمانوں کا جن کو آتشی سمجھنا اور دھواں بن کر اس کا غائب ہو جانا اسی قدیم عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ الہ دین کا قصہ، الف لیلہ میں آپ نے پڑھا ہوگا۔ اس میں بھی جن کو چراغ ہی کا تابع بتایا جاتا ہے اور جب کسی آسیب زدہ کے سر سے بھوت پریت کا اثر دور کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے دھونی کی جاتی ہے اور فلیتہ جلایا جاتا ہے۔

الغرض جن، شیاطین، جہنم اور آگ یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جو انسان کے عہد جاہلیت میں تیار کی گئیں اور جن کی جھنکار اب بھی گاہے گاہے سننے میں آجاتی ہے۔

اس سلسلہ میں جو روایات اہل قلم نے پیش کیں ان میں سب سے بلند رتبہ گوئٹے کی فاؤسٹ (FAUST) کا ہے جس میں شیطان کے کیریکٹر کو نہایت باوقار ثابت کرکے آخر میں اس کی نجات کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مسلمانوں میں صرف محی الدین ابن عربی نے شیطان کو زیادہ مکروہ نہیں سمجھا بلکہ وہ اس کی انانیت کا ایک خاص رمز سمجھتے ہیں۔

معصیت اور مذہب و عقل

ایک استفسار کے جواب میں

آپ کا استفسار متعدد مباحث چاہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل مقصود آپ کا یہ ظاہر کرنا ہے کہ پوشیدہ گناہوں سے احتراز کرنے کے لئے بہشت و دوزخ اور وجود باری کا عقیدہ ضروری ہے۔ اور اس کے ثبوت میں آپ نے ابتداء اسلام کے عربوں کو پیش کیا ہے ——— مجھے اس کے جواب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا ان مذاہب و اقوام میں (مثلاً اسلام و پیروانِ اسلام ہی کو لے لیجئے) جو آپ کے نقطۂ نظر سے وجود باری کے بھی قائل تھے اور مرنے کے بعد فردوس و جہنم سے واسطہ پڑنے کو بھی ضروری خیال کرتے تھے، معصیت کرنے والے نہ پائے جاتے تھے۔ کیا وہ سب معصوم تھے آپ خیال کس معصیت کو کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کے بعد وجود باری پر یقین رکھنے اور بہشت و دوزخ کے قائل ہونے کے باوصف وہ علانیہ معصیت سے بھی باز نہ آتے تھے۔ پوشیدہ گناہوں کا کیا ذکر ہے۔ خیر اس عہد کو چھوڑیئے خود رسول اللہ اور عہد

خلفاء راشدین کو لے لیجئے اور تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے شراب بھی پی، زنا بھی کیا، قتل و غارتگری بھی کی، چوری سے بھی باز نہ آئے، مکر و فریب سے بھی ضرورت کے وقت کام لیا۔ الغرض وہ کون سی ایسی معصیت ہے جس کا ارتکاب وجود باری و اعتقاد بہشت و دوزخ کے بعد بھی انسان نے نہیں کیا اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خود خلیفہ ثانی نے اپنے بیٹے پر حد جاری کی۔

مجھے حیرت ہے کہ آپ نے بالکل خلاف حقیقت یہ لکھنے کی جرأت کیونکر کی کہ "شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں کو جب خدائی بہشت و دوزخ پر ایمان آگیا تو پھر انھوں نے خلوت و تنہائی میں بدیوں کے ارتکاب کا خیال ترک کر دیا۔ ان شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں نے تو وہ وہ گناہ کئے ہیں کہ باید و شاید۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہر مذہب اپنے ساتھ ایک شریعت لاتا ہے یعنی دینی عقاید کے ساتھ ساتھ وہ ایک دنیاوی قانون بھی بناتا ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا نظام قائم رکھا جاتا ہے اگر آپ کے خیال کے مطابق محض مذہبی عقائد گناہ سے باز رکھنے کے لئے کافی ہوں تو قانون و شریعت کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ دائما ایک شریعت کا نفاذ و اجراء ہمیشہ ضروری خیال کیا گیا۔ کیا اسلام سے آپ ان حدود شریعت کو علیحدہ کر سکتے ہیں جن کی صراحت کلام مجید میں پائی جاتی ہے۔

اس لئے اب سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آیا "مجرد عقل" معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے یا نہیں، مذہب کا تجربہ تو بہت کافی ہو چکا ہے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اس لئے اب سوال اس کے کہ ہم "کار گاہ عقل" سے مدد چاہیں اور کیا چارۂ کار ہے؟

میں یہ کہنے کے لئے تو تیار نہیں کہ عقل کا استعمال دجوباً انسان کو معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر عقل سے کام لیا جائے تو وہ بہ نسبت مذہب کے زیادہ اس میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

آپ غالباً گناہ کی حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے، یعنی آپ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ایک فعل کو معصیت قرار دینے کا کیا سبب ہے آپ کوئی فعل کیجئے اس کا اثر داسطہ یا بلا واسطہ ضرور سوسائٹی کے نظام پر پڑے گا اور یہی وہ تجربہ تھا جس کی بناء پر عہد قدیم میں اچھے اور بُرے افعال کے درمیان خط فاصل کھینچا گیا ——— انسان کے گناہ کا علم کسی الہام کے ذریعے نہیں ہوتا ہے بلکہ خود حیات دنیاوی کے تجربات نے اس کو بتایا ہے کہ یہ فعل بُرا ہے اور وہ اچھا۔

پھر جب انسان کو اوّل اوّل اس کی عقل یا اس کے تجربے نے یہ بتایا ہوگا کہ چوری کرنا بُرا ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جس فعل کو خود اُس نے بُرا قرار دیا تھا اس کے ارتکاب کے وقت اس کے دل نے ملامت نہ کی ہوگی اور کیا قلب و ضمیر کی بار بار ملامت نے اس کو اس حرکت سے متنفر نہ کر دیا ہوگا۔

فرض کیجئے آپ ایک شراب خوار سے کہتے ہیں کہ "دیکھو شراب نہ پیو، ورنہ خدا برہم ہو جائے گا اور تم کو جہنم میں پھینک دیگا" اب دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ واقعی خدا اور اس کے جہنم کا قائل تھا یا نہیں تھا۔ اگر تھا تو یہ عقیدہ اسے شراب خوری سے باز نہ رکھ سکا۔ لیکن اگر نہیں تھا تو بھی خدا و جہنم پر ایمان لانے کے بعد اس کا میخواری ترک کر دینا ضروری نہیں جبکہ بالکل یہی عقیدہ رکھنے والوں میں کبھی پوری طرح اس کا انسداد نہ ہو سکا۔ اس کے مقابلے میں دوسری صورت استمداد عقل کی اختیار کیجئے۔ یعنی ایک شراب خوار کو

بتائیے کہ اس کی یہ مذموم عادت خود اس کی صحت کے لئے بہت مضر ہے اور وہ اس کا عادی ہو کر اپنے قوائے عمل کو برباد کر رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اس نصیحت سے متاثر ہو کر یقیناً ترک میخواری پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن وہ اس فعل کی قباحت کو ضرور تسلیم کرنے لگے گا اور اس طرح ممکن ہے کسی وقت وہ اس سے باز آجائے۔

گناہ دوسرا نام ہے ترک فرائض کا اور ایک فرض کسی شخص پر اسی وقت عائد ہوتا ہے جب اس سے کوئی مفید نتیجہ مترتب ہو۔ اس لئے ایک شخص کا کسی طمع یا خوف کی مدد سے ادائے فرض کی طرف متوجہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے احساس فرض نہیں لیکن اگر وہ بغیر خیال مزد و اندیشۂ تعزیر اپنے فرض کو ادا کرتا ہے تو بے شک یہ سمجھا جائے گا کہ احساس فرض شناسی اس میں موجود ہے۔

دوزخ کا خوف یا بہشت کی لالچ دلا کر کسی کو اچھے کام کی طرف راغب کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ناسمجھ بچے کو مٹھائی کی لالچ یا مار کے خوف سے پڑھنے کی طرف مائل کرنا۔ اس لئے مذہب کا انسان سے یہ مطالبہ کہ وہ بہشت و دوزخ کا یقین کرے گویا اس کو حد درجہ احمق و بے وقوف قرار دینا ہے اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ واقعی ایسا ہی احمق ہے۔

اعمال انسانی کے مختلف مدارج ہیں۔ اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ کوئی کام صرف تعمیل حکم کی حیثیت سے کرے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بلا خیال احتساب، فرض کو محض فرض سمجھ کر انجام دے اس لئے اگر مذہب کسی شخص کو اچھے کام کی طرف مائل کر بھی سکتا ہے تو پہلے اس میں غلامی و محکومی کی اسپرٹ پیدا کر دیتا ہے، برخلاف اس کے عقل کی رہبری و ہدایت آزادیٔ ضمیر و حریت فکر و رائے پر قائم ہوتی ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے

یہاں تک تو صرف منطقی بحث تھی اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کچھ قیل و قال کر سکیں۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ امریکہ میں جو جدید نقشے ارتکاب جرائم کے مرتب کئے گئے ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ۹۰ فی صدی مجرم وہی ہیں جو کسی نہ کسی مذہب کے پابند ہیں اور ملحدین میں ارتکاب جرائم کا اوسط ۱۰ فی صدی بھی نہیں ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی ثبوت اور آپ کو درکار ہے۔

آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ امریکہ والے اسلام کے پابند نہیں ہیں اور آپ ذکر کر رہے ہیں اسلام کا کیونکہ جس حد تک وجود باری اور بہشت و دوزخ کے عقیدہ کا تعلق ہے وہ بالکل آپ ہی کے ہم آہنگ ہیں اور مرنے کے بعد عذاب و ثواب کی حقیقت کو بالکل آپ ہی کی طرح تسلیم کرتے ہیں۔

کیا شریعت اسلامی میں تغیّر و تبدّل درست نہیں؟

(بجواب استفسار)

کیا آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ اسلام و شریعت دونوں ایک چیز ہیں یا ان کا مفہوم جداگانہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر یہ ایک ہیں تو کیوں اور مختلف ہیں تو ان دونوں میں باہم کیا تعلق ہے،

آپ جس چیز کو لفظ شریعت سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الحقیقت فقہ اسلامی ہے. اور آپ نہیں اکثر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقہ اور مذہب اسلام دونوں ایک چیز ہیں اس لئے آیئے سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ فقہ کی حقیقت کیا ہے؟

اس میں کلام نہیں کہ شریعت یا فقہ نام ہے اس مجموعۂ قوانین کا جو مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہے اور جس کی حدود سے ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ہمارے اسلاف جو قوانین وضع کر گئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں یا یہ کہ ان سے ہٹنا

مذہبِ اسلام سے ہٹ جانا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس زمانہ میں فقہ کے مفہوم کو جو اتنی اہمیت دے دی گئی ہے وہ ابتداءِ عہدِ اسلام میں مفقود تھی۔

اگر آپ نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرونِ اولیٰ میں فقہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور چیز بھی پائی جاتی تھی جس کا اصطلاحی نام علم تھا۔ اور جو فقہ سے بالکل جدا حیثیت رکھتی تھی۔

علم سے مراد قرآن و تفسیر کا علم تھا۔ اور ان روایات کا جو رسول اللہ اور صحابہ سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن فقہ سے (جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ظاہر ہے) مراد عقل و رائے کے بعد کسی نتیجہ تک پہونچنا تھا۔ اسی لئے کبھی کبھی الفاظ فقہ اور رائے مترادف حیثیت سے استعمال کئے جاتے تھے۔ الغرض علم اور فقہ دو بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں تھیں اور اسی بنا پر مجاہد نے (من یوتی الحکمۃ) کی تفسیر میں ظاہر کیا ہے کہ صاحب حکمت سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن علم اور فقہ کا ماہر ہو۔ ہارون رشید اپنے گورنر ہرثمہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ "اولو الفقہہ فی الدین" اور "اولو العلم بکتاب اللہ" سے مشورہ کرتا ہے الغرض عالم اور فقیہہ دو بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بناء پر ابن عمر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جید الحدیث تھے لیکن "جید الفقہ" نہ تھے اور ابن عباس فقہ و علم دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر گویا یوں سمجھیے کہ عالم وہ شخص کہلاتا ہے جسے صرف قرآن اور روایات کا علم ہو اور فقیہہ وہ کہلاتا ہے جو جدید مسائل میں غور و فکر کے بعد خود اپنی رائے سے کام لے کر کوئی فیصلہ کرے۔

جب اسلام بالکل ابتدائی دور سے گذر کر ارتقاء کی دوسری منزل میں آیا

اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ اسی غیر قوموں کے تمدن اور نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑا تو بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں جن کا ذکر نہ کلام مجید میں تھا نہ رسول اللہ کے اقوال میں اس لئے جن علماء کو عدل و انصاف کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اپنی عقل و رائے سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو علم و رائے دونوں مل جائیں اسی کا نام تفقہ فی الدین تھا اور جو اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا اسی کو سب سے بڑا فقیہہ سمجھا جاتا تھا۔ الغرض شریعت اسلامی میں جو مرتبہ علم قرآن و حدیث کا تھا وہی بلکہ اس سے زیادہ رائے کا تھا۔ کیونکہ بغیر اس کے کام چلنا دشوار ہو جاتا۔ ایک بار امیر معاویہ نے جناب زید بن ثابت سے کسی امر میں قانونی مشورہ کیا لیکن "فلم یوجد عندہ او عندہم فیہا علم" (نہ وہ کوئی روایت پیش کر سکے نہ دیگر حضرات) آخر کار امیر معاویہ نے اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کیا۔ ایک بار مصر کے قاضی نے خلیفہ عمر ثانی سے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھ تک اس باب میں کوئی روایت نہیں پہونچی۔ اس لئے خود اپنی رائے سے کام لے کر فیصلہ کر دو۔

بنو امیہ کے زمانہ تک باقاعدہ تنظیم شریعت نہ ہو سکی تھی لیکن بنو عباس کے دور میں البتہ ـــــ قانون سازی کی ابتداء ہوئی اور اس کے چار اصول مقرر کئے گئے۔ قرآن، سنت، قیاس اور اجماع۔ چنانچہ ان اصول پر فقہ اہل سنت کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وہ مالک ابن انس کی مؤطا ہے اس وقت علاوہ مدینہ کے شام، عراق اور ہسپانیہ میں بھی مختلف حضرات اپنی اپنی فقہ مرتب کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت مؤطا ہی کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد بن ابی سلیمان نے سنبھالا اور پھر ابو حنیفہ نے اس کو چار چاند لگا دئے۔

ابوحنیفہ کو ان کے دو شاگرد ابو یوسف اور محمد کی خدمات تدوین شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انھیں کی مرتب کردہ فقہ پر آجکل اہل سنت عمل کررہے ہیں۔

یہ تھا نہایت مختصر سا بیان تدوین فقہ کی تاریخ کا لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مسائل شریعت میں تمام مسلم جماعتوں کا اتفاق کبھی نہیں ہوا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ قیاس ورائے سے کام لے کر قوانین و قواعد مرتب ہورہے تھے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی سخت مخالف تھی اور وہ کہتی تھی کہ قرآن وحدیث میں کیا چیز نہیں ہے کہ ہم کو قیاس ورائے سے کام لینا پڑے، بعد کو یہ اختلاف برابر بڑھتا ہی گیا اور کبھی کوئی ایسی شریعت قائم نہ ہوسکی جس پر تمام سنیوں نے بھی اتفاق کیا ہو چہ جائیکہ شیعہ اور خوارج وغیرہ کہ اگر ان کو بھی لے لیا جائے تو پھر اختلاف کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

اس بیان سے دو باتیں واضح ہوگئیں ایک یہ کہ جس چیز کو شریعت اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کوئی منصوص چیز نہیں ہے یعنی نہ خدا کی نازل کی ہوئی چیز ہے اور نہ رسول اللہ کی بنائی ہوئی۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی جس پر بالاتفاق سب کا عملدرآمد رہا ہو۔ اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ شریعت یا فقہ میں تغیر و تبدل کرا دینا اسلام کو خراب کرنا ہے کس حد تک درست ہوسکتا ہے۔

اس بحث میں آپ لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کردیتے ہیں کہ دین و مذہب دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ دین سے مراد وہ اصولی عقائد ہیں جو تمام افراد میں جزو مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا مثلاً یہ کہ

خدا ایک ہے۔ اور محمد اس کے رسول ہیں لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مذہب ہے اگر اس میں اختلاف بھی ہو تو اس کا اثر "وحدت فی الدین" پر نہیں پڑتا۔ اور اسی بناء پر ایک زمانے سے یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ شیعہ سنی کے جھگڑے دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا تعلق ان مسائل سے ہے جو ہماری دینی مرکزیت یا اسلامی اشتراک پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوسکتے۔

مذہب جس میں ہمارے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی قوانین سب شامل ہیں کبھی متفق علیہ چیز نہیں ہوسکتا اور نہ ایک جگہ قائم رہنے والی چیز ہے کیونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت۔ ہمارے عادات واطوار اور ہماری ضروریات میں تغیر ہونا ضروری ہے اور تہذیب یا کلچر کے اس تغیر کے ساتھ ہمارے اجتماعی نظام کا بدلنا بھی لازم ہے۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ آج خود ہمارے علماء کرام کی تہذیب ومعاشرت کیا ہے، کیا یہ بالکل وہی ہے جو عہد رسالت وخلافت میں پائی جاتی تھی۔ اگر نہیں ہے تو آپ ان سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی پابندی نہیں کی کیونکہ قانون اسلامی میں ہمارے لباس وغیرہ کے مسائل بھی شامل ہیں۔

اس سے تو آپ کو انکار نہ ہوگا کہ علوم وفنون کی ترقی نے اس وقت زمان ومکان دونوں کے مفہوم کو بدل دیا ہے اور تجارت نے ہر ملک وقوم کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کے مشاغل بہت وسیع ہو گئے ہیں اور ایسے ایسے مسائل ہمارے سامنے آگئے ہیں جن کا اب سے قبل وجود تو خیر کیا وہم وگمان بھی نہ تھا ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کے بعد ہی معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں لوگوں کو قرآن واحادیث سے ہٹ کر قیاس ورائے سے کام لینے کی ضرورت پڑی تو اب کہ زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے

اور ہزاروں نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہم قیاس ورائے سے کیونکر قطع نظر کر سکتے ہیں اور وہ شریعت جو اب سے صدیوں سال قبل مرتب ہوئی تھی وہ ہماری موجودہ زندگی میں کیا کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ قانون ہمیشہ اقوام کی زندگی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اگر کسی مذہب میں اتنا لوچ نہیں ہے کہ وہ ضروریات ملک وملت کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر سکے تو وہ قطعاً بے روح مذہب ہے اور زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ اسی مطالبہ کا اعادہ کرتا ہوں جو قرون اولیٰ میں اکابر دین کی طرف سے کیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ آپ کی موجودہ شریعت ہے۔

ظاہر ہے کہ سرزمین عرب میں جو قوانین مرتب کئے گئے تھے ان میں وہیں کی آبادی اور اسی زمانے کے مقامی ماحول کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آج چین میں بیٹھ کر لندن کے لئے قانون وضع کیا جائے اور لندن میں بیٹھ کر چین کا یا یہ کہ اس وقت ہم کوئی ایسی شریعت مرتب کر دیں جو ہزار سال بعد بھی کام دے سکے پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت فقہ حنفی تیار ہوئی ہے اس وقت اہل عرب کو اس کا علم حاصل تھا کہ ایک وقت ہندوستان میں بھی اسلام پھیلے گا اور ان کو اپنی ملکی ضروریات کے لحاظ سے فلاں فلاں امور رشد و ہدایت کی ضرورت لاحق ہوگی یقیناً نہیں۔ پھر آپ کیونکر اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ شریعت اسلامی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اتنی ہی مفید و کارآمد ثابت ہو سکتی ہے جتنی اب سے سیکڑوں سال قبل عرب کے باشندوں کے لئے تھی اور اس میں اب کسی تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قابل غور ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے لئے جو بہت زیادہ قدامت پرست

ہیں) وہ یہ کہ فقہ اسلامی میں بعض مسائل ایسے ہیں جن کی صراحت قرآن مجید میں موجود نہیں، بعض احادیث سے لئے گئے ہیں اور بعض قیاس و رائے سے کام لے کر اجتہاد کئے گئے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جو مسائل مذکور ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور وہ ایسے ہیں بھی نہیں جن میں تغیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جائے لیکن احادیث و قیاس کی مدد سے جو حصہ فقہ اسلامی کا مرتب ہوا ہے اس کو بدلا جا سکتا ہے اگر اس کی ضرورت محسوس ہو، ایسا کر لینے سے اصل دین کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قرون اولیٰ میں بھی برابر اسی اصول پر عملدرآمد ہوتا رہا ہے اور اس کو سامنے رکھے بغیر شریعت اسلامی ہر زمانہ اور ہر ملک کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ رہا یہ اعتراض کہ اب سے ایک ہزار سال قبل کا انسان تو اجتہاد سے کام لے سکتا تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ سو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ معترض کے سامنے بیل گاڑی اور ہوائی جہاز دونوں کو پیش کر کے خاموش ہو جاؤں ؟

درود شریف

بجواب استفسار

اس سے غالباً آپ کو انکار نہ ہوگا کہ درود شریف ہو یا اور کوئی دعا، ان سب کا تعلق عبادت سے ہے اس لئے سب سے پہلے مختصراً عبادت کی حقیقت کو سمجھ لیجئے:۔

پرستش یا عبادت سے مقصود کسی ایسی ہستی کے سامنے اظہار عجز، بطلب فلاح کرنا ہے جو انسانی ہستی سے بہت بلند واقع ہوئی ہے اور جس کا اصطلاحی نام خدا ہے اس لئے عبادت کا تعلق محض جذبات انسانی سے ہے اور الفاظ و حرکات کو اس میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خدا کا تصور جو عام طور پر مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ اتنا عجیب و غریب ہے کہ اس کے سامنے انسان اپنی انفرادیت، شخصیت اپنی رائے و تمیز، اپنی آزادی و خودداری سب کچھ کھو بیٹھتا ہے اور اپنے تمام قوائے ذہنیہ معطل کرنے کے بعد ہی وہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس نے "حق بندگی" ادا کیا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب معاملہ خدا ایسی عجیب و غریب ہستی کو خوش کرنے یا ناخوش رکھنے کا ہو تو ایک "بندۂ خدا" کے جذبات نیایش و پرستش کی شدت کا کیا عالم ہوگا اور

کس شدید تاثر کے ساتھ "حضوری" کا تصور اس پر مستولی ہونا چاہیئے۔

پھر چونکہ ایک مذہبی انسان یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا اپنی تمام لازوال و غیر متناہی قوتوں کے ساتھ ساتھ ہر وقت "گوش بر آواز" بھی رہتا ہے اور بصارت مطلق ہونے کی بھی صفت کا حامل ہے۔ اس لئے وہ اس کی تعریف میں کچھ الفاظ بھی اپنی زبان سے ادا کرتا ہے (جس کا نام حمد و ثنا ہے) اور اپنے حرکات سے اپنے عجز و تذلل کو بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے (جس کا نام رکوع و سجود وغیرہ ہے)

مذہب نے خدا اور بندے کے درمیان اس تعلق کا تصور چونکہ اسی دنیا کے شاہ و گدا کو سامنے رکھ کر کیا ہے اسی لئے وہی تمام باتیں جو یہاں کی ایک خود مختار فرمانروا ہستی کو خوش کرنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں، خدا سے بھی متعلق کر دی گئیں اور عبادت یا حمد و ثنا کی صورت بھی تقریباً وہی قرار دی گئی جو کسی دربار شاہی میں رعایا و خدام کی طرف سے زمین بوسی وغیرہ کی صورت میں نظر آتی ہے اور ان میں سوا اس کے کوئی فرق نہ رکھا گیا کہ خدا کی تعریف کا نام "حمد" اور بادشاہ کی تعریف کا (بہ تبدیلی حروف) "مدح" ہے اُس کو "خدا" کے لفظ سے یاد کرتے تھے تو اس کو اور چند حروف کے اضافے کے ساتھ "خداوند" کہنے لگے انھوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ اپنی تعریف سے خوش ہو کر انعام و اکرام کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا بھی خوش ہو کر بخشش و عطا سے کام نہ لے اور اگر بادشاہ بغاوت اور عدول حکم سے برہم ہوتا ہے تو یقیناً خدا کو بھی سرکشی و نافرمانی سے غضبناک ہونا چاہیئے۔

میں یہاں اس امر سے بحث نہ کروں گا کہ خدا کا یہ تصور اور عبادت کا یہ فلسفہ بجائے خود کس قدر لغو و مہمل ہے کیونکہ موضوع زیر بحث سے اس کو کوئی تعلق نہیں میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ درود شریف یا کسی اور طریق عبادت سے انسان کو تسکین

ہونا چاہیئے یا نہیں؟

جب خدا اور بندہ کا تعلق وہی قرار پایا جو آقا و خادم یا مولیٰ و غلام کا ہے، تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حصول مقصود کے لئے جو ذرائع یہاں موثر ہو سکتے ہیں وہی وہاں بھی کارگر سمجھے جائیں گے اور جس طرح یہاں انسان کو اپنی امیدوں کی تکمیل کے خیال سے تسکین پہونچتی ہے اسی طرح وہاں کی آرزوؤں کی تکمیل کے خیال سے بھی پہونچنا چاہیئے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ خدا کی عبادت کسی غرض پر مبنی نہیں ہے؟ دنیاوی ثروت و دولت نہ سہی، اخروی آسائش و راحت تو ہے" زہرۂ صبح و جام بلوریں " نہ سہی جنت کا " موتی محل " اور وہاں کی " اچھوتی حور " تو ہے۔ اور زیادہ بلند جائیے۔ قرب خداوندی کی تمنا تو ہے؟ اس سے زیادہ اور عمیق فلسفہ تراشی کیجئے۔ جیز اصلی میں گم ہونا تو ہے حدود و تعینات سے گذر کر لا متناہی میں جذب ہو جانا تو ہے؟ بہرحال عبادت کا خیال خواہ وہ کسی نہج و صورت سے ہو، غرض سے خالی نہیں ہے اور اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ ہماری کوئی غرض ہمارے کسی قول و فعل سے پوری ہو سکتی ہے تو اس قول یا فعل پر تسکین ہونا ضروری ہے۔

بنا براں اگر درود شریف کے ورد سے آپ کو تسکین ہوتی ہے تو اس کا کھلا ہوا نفسیاتی سبب موجود ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نفس درود شریف کے الفاظ میں کوئی خاص اثر پوشیدہ ہے۔ اور ہر شخص اس سے وہی تسکین حاصل کر سکتا ہے جو آپ کو حاصل ہوتی ہے۔

درود شریف کے ورد سے جو سکون قلب آپ کو میسر آتا ہے بالکل وہی ایک ہندو کو گائتری کے پڑھنے سے ایک عیسائی کو دعائے یسوع کے ورد سے حاصل ہوتا ہے

اور اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً نہ درود کے الفاظ میں کوئی ایسی اثر موجود ہے نہ گائتری اور دعائے یسوع میں، بلکہ اس کا تعلق خود اپنے اعتقاد و یقین سے ہے آپ ایک ہندو سے کہئے کہ وہ درود پڑھا کرے اور آپ گائتری کی جاپ کیجئے۔ نہ آپ کو تسکین حاصل ہوگی نہ ہندو کو۔

اگر آپ کو درود شریف اور نماز سے کوئی ذہنی فائدہ پہونچتا ہے تو یقیناً آپ کو اس کی پابندی کرنا چاہیئے اور تمام ایسے نفوس کے لئے جو بہ اس قسم کی تدابیر کے اپنی وحشت نہیں کم کر سکتے، علاج کی یہی صورت مناسب ہے آپ نے وہ قصہ پڑھا ہوگا کہ لومڑی ایک شیر کو ہلاک کرنے کے لئے کسی طرح اس کو ایک کنوئیں پر لے گئی اور وہاں پہونچ کر جب شیر نے اپنا عکس دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ کوئی دوسرا شیر جنگل میں آگیا ہے اس پر حملہ کرنے کے لئے کنوئیں کے اندر پھاند پڑا۔

اب رہا نفس درود شریف کے دعا ہونے کا مسئلہ، سو "درود شریف" ایک دعا والتجا تو ضرور ہے لیکن اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے۔ عام طور پر درود شریف میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں :-

"اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد واصحابہ" حضرات شیعہ آل محمد سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "اے خدا محمد، وآل محمد واصحاب رسول پر برکت نازل کر" کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ پر نزول برکات کی دعا سے خدا خوش ہوتا ہے اور دعا مانگنے والے کو بھی اس کا ثواب ملتا ہے۔ ثواب سے مراد یہی خوشنودی خدا اعمال سیئہ کی معافی اور آخرکار وہی بہشت ر کوثر یا قرب خداوندی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔

درود میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ درود پڑھنے والا خود

کوئی خواہش اپنی پیش کرتا ہے، بلکہ وہ رسول و آل رسول کے لئے دعا کرتا ہے درآنحالیکہ ایسی برگزیدہ ہستیوں کے لئے نزول برکات کی دعا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا یہ کہنا کہ

دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

میں نہیں سمجھتا کہ تحصیل حاصل کی اس سے زیادہ بہتر مثال کوئی اور پیش کی جاسکتی ہے،

مجھے نہیں معلوم کہ آپ درود کا ورد اس کو سمجھ کر کرتے ہیں یا بغیر سمجھے لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اس کے مفہوم پر غور کیئے بغیر یہ مشغلہ جاری رکھتے ہیں ورنہ یہ تسکین و سکین سب ختم ہو جاتی اور میری طرح آپ بھی گمراہ ہو جاتے،

عبادت

بہ جواب استفسار

آپ نے اپنے شکوک و اوہام کی وضاحت نہیں کی یعنی اگر آپ کو عبادت سے حقیقی سرور حاصل نہیں ہوتا تو کیوں؟ یہ بالکل صحیح ہے کہ اعمال کا مدار خلوص و صداقت ہے لیکن عبادت کا مدعا بھی تو اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو باوصف نماز روزہ کی پابندی کے افعال قبیحہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو یہ قصور عبادت کا نہیں بلکہ خود ان کا ہے۔ عبادت کا لازمی نتیجہ تصفیۂ قلب نہیں ہے لیکن جس ذریعہ سے تزکیۂ اخلاق ہو سکتا ہے وہ یقیناً عبادت ہے۔

فرض کیجئے کسی منزل تک پہونچنے کے لئے ایک شخص کے سامنے کئی راستے ہیں اور وہ ایک راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے لیکن اگر کچھ دور چل کر اس کو شک پیدا ہو جائے کہ یہ راستہ غلط ہے اور اسے چھوڑ کر وہ دوسرا غلط راستہ اختیار کر لے اور منزل تک پہونچ نہ سکے تو یہ قصور راستہ کا نہ ہوگا بلکہ خود راستہ چلنے والے کا ہوگا۔

عبادت کا صحیح مفہوم اپنے اندر وہ کیفیت پیدا کرنا ہے جو خلاق عالم و عالمیان کے تصور صحیح سے اسے قریب تر کردے اور خدا کا صحیح تصور صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ انسان اپنے مفہوم کلی کو سمجھنے لگے۔ مفہوم کلی سے میری مراد یہ ہے کہ وہ انفرادی طور پر صرف اپنی ذات کو سامنے رکھ کر "انسان" کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ تمام نوع انسانی کو "وجود واحد" قرار دے کر اپنے آپ کو اس کا جزو قرار دے اس صورت میں تمام افراد نوع انسانی سے رہی لگاؤ ہو جائے گا جو خود اپنی ذات سے ہے اور ایک جذبۂ لاذاتیت SELF LESSNESS پیدا ہو کر وہ سراپا ایثار و لطف بن جائے گا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے محدود صورت میں دنیا کی قوموں کو ابھارا اور جس کے فقدان نے انھیں دنیا سے محو کر دیا لیکن اب کہ علوم و فنون کی ترقی نے تمام کرۂ ارض کے باشندوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے اس جذبہ کو ملک و قوم کے تعینات سے گذر کر عام "انسانیت" کے حدود میں آ جانا چاہیئے اور انسانوں کا رشتہ بجائے رنگ و نسل کے صرف اس اصول پر قائم ہونا چاہیئے کہ وہ سب ایک ہی کرہ کے رہنے والے ہیں

وہ زمانہ جب کہ عرب کے لوگ سوا اپنے سب کو عجمی کہتے تھے ختم ہو چکا ہے اور وہ دور جب اہل عجم اپنی شان و شوکت کے سامنے ساری دنیا کو حقیر و ذلیل سمجھتے تھے باقی نہیں رہا وہ عہد جب خدا کی پوجا، اذان و ناقوس کے ذریعے ضروری قرار دی جاتی تھی، گذر گیا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ایشیا کا انسان یورپ کے انسان سے اور امریکہ کا باشندہ لنکا کے باشندے سے ناواقف تھا۔ اب زمین اتنی وسیع نہیں رہی جتنی ہمارے جہل و ناآگاہی کے زمانہ میں وسیع نظر آتی تھی اب وہ بہت تنگ ہو گئی ہے اتنی تنگ کہ ہم یہاں سے بیٹھے بیٹھے کرۂ ارض کے ہر ہر فرد سے باتیں کر سکتے ہیں اس لئے اب تمام تفریقات کو مٹ کر ایک وحدت میں تبدیل ہو جانا چاہیئے اور وہ وحدت صرف رشتۂ انسانیت ہے۔

دنیا میں مذاہب کا وجود اکثر و بیشتر اسی محدود نقطۂ نظر کے تحت عمل میں آیا جب انسان کلی کا مفہوم متعین نہ ہوا تھا اس لئے عیسائی مسلمان کا دشمن تھا اور مسلمان عیسائی کا اب کہ گبرو ترسا، ہندو مسلمان بحیثیت انسان ہونے کے ایک دوسرے سے قریب تر ہوگئے ہیں، مذہب کا قدیم مفہوم بدل جانا چاہیئے اور اس کی بنیاد اس حقیقت کو سامنے رکھکر استوار کرنا چاہیئے کہ سارا کرۂ ارض صرف ایک گھر ہے جس کے اندر تمام انسان ایکدوسرے کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب کا مدعا پہلے یہ ہوا کرتا تھا کہ وہ کسی ایک مخصوص عقیدہ کو پیش کرکے کسی قوم و ملک کو ابھارے اور اس وقت کی تنگیٔ علم کو دیکھتے ہوئے یہ خیال بُرا نہ تھا لیکن تاریخ مذاہب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس خیال نے رفتہ رفتہ ایک عسکری خود غرضی اختیار کر لی اور ان کا مقصود صرف ایک دوسرے کو بُرا کہنا اور ذبح کرنا رہ گیا۔ خدا کا مفہوم ہر مذہب نے جداگانہ قرار دے لیا۔ اور جنت و دوزخ عطا کرنے کی خدمت خدا سے چھین کر خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مذاہب محض امن و سکون کی تبلیغ کا دعویٰ لے کر نمودار ہوئے تھے وہ بھی اپنا ہاتھ خون سے رنگین کئے بغیر نہ رہ سکے اور آخر کار عقلی و اخلاقی حیثیت سے ان کی اہمیت رفتہ رفتہ اس قدر کم ہو گئی کہ مذہب کا وجود ہی امن و سکون کا منافی قرار پا گیا۔

بہرحال مذہب کسی زمانہ میں مفید ہوا ہو یا مضر، بحالات موجودہ اس کے نقصانات کھُلے ہوئے ہیں اور اس کو ذریعۂ نجات قرار دینا حماقت ہے۔ البتہ اگر ملتوں کا امتیاز مٹا دینے کے بعد کوئی ایسا دین رائج کیا جائے جو اپنا نصب العین وحدتِ مسجود مندر قرار دے تو بے شک چل سکتا ہے ورنہ مذاہب کی عمر اب ختم ہو چکی ہے اور

تجربے نے ان کو بہت ناکامیاب ثابت کیا ہے۔

اسلام مدعی ہے کہ وہ امن و سکون کا حامی ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس کا اخلاقی معیار بھی بہت بلند ہے لیکن تلوار چلائے بغیر وہ بھی نہ رہ سکا اور عمل تکفیر کا سہارا اس نے بھی ڈھونڈھا۔ اس لئے مسلمان رہنے میں تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ آپ غیر مسلم کو غیر انسان سمجھ کر اس سے نفرت نہ کریں اور اگر نماز روزے سے یہ کیفیت کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتی تو وہ بالکل بے معنی چیز ہے جس چیز کا نام "صبغۃ اللہ" ہے۔ وہ فی الحقیقت "انسان کلی" کے اسی مفہوم کو متعین کرتا ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا اور "خدائی رنگ" کائنات کی ہر ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں ہر ہر چیز محبوب ہونا چاہئیے لیکن عام طور پر مولویوں اور قائدین قوم کے نزدیک صبغۃ اللہ (خدائی رنگ) سے مراد وہ خون ہے جو شہید گنج کی مسجد کے لئے بہایا جائے۔ گویا خدا کو بُت سمجھ کر اس کا ایک استھان مقرر کر لیا گیا ہے کہ وہ وہاں کے علاوہ کہیں اور نہیں پایا جا سکتا پھر آپ اسلام کا یہ مفہوم کیوں قرار دیں اور خود کو محراب و منبر کا پابند کیوں سمجھیں۔ ایک وقت مسلمانوں کی ہمتوں کا تقاضہ یہ تھا کہ جہاں وہ قدم رکھ دیتے تھے سجدہ گاہ ہو جاتا تھا ساری دنیا خدا کا معبد تھا اور جس طرف وہ منہ کر لیتے تھے خدا بھی اپنا منہ اسی طرف پھیر لیتا تھا مگر اب ان کا خدا صرف اسی مسجد میں مقید نظر آتا ہے جو سب سے زیادہ ویران ہے اور جہاں انھوں نے صدیوں سے کوئی سجدۂ عبودیت ادا نہیں کیا۔

دیکھئے اسلام کا مطالعہ آپ کبھی مولویوں اور پیروں کی وساطت سے نہ کیجئے، یعنی ان کی زندگی کو سامنے رکھ کر اسلام کے سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ ان سب سے کٹ کر خود فیصلہ کیجئے کہ اگر اسلام کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ دنیا میں امن و سکون کی اشاعت

کے لئے آیا ہے تو اس کا مفہوم اور اس کی بتائی ہوئی طاعت و عبادت کا مدعا کیا ہونا چاہیئے نماز نام محض رکوع و سجود کا نہیں ہے، قعود و قیام کا نہیں ہے، مخصوص آیات کے پڑھ لینے کا نہیں ہے بلکہ اپنے اوپر اس کیفیت کے طاری کر لینے کا ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو استوار کرتی ہے اور اس تعلق کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ہر فرد کا خیال اپنے ابنائے جنس کیساتھ الہامانہ وسعت اختیار کرلے پھر اگر نماز سے یہ کیفیت آپ میں پیدا نہیں ہوتی تو آپ کی نمازیں بالکل بیکار ہیں اور اگر علاوہ نماز کے کسی اور طریقہ سے آپ میں یہ ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے تو آپ کے لئے وہی طریقہ صحیح عبادت کا ہے اور ممکن ہے کہ مولوی اس باب میں آپ سے برہم ہو لیکن خدا جو تمام تعینات سے بلند و ارفع ہے کبھی آپ سے مواخذہ نہ کرے گا۔

کوشش کیجئے کہ نماز آپ میں یہی وسعت خیال پیدا کرے لیکن اگر آپ کا ذوق اس سے پورا نہیں ہوتا تو یقیناً نماز آپ پر فرض نہیں ہے خدا کو کسی اور ایسے ذریعہ سے یاد کیجئے جو آپ کے قلب و روح کو مطمئن کر سکے ضمیر کوئی الہامی چیز نہیں ہے بلکہ وہ پیداوار ہے ماحول کی۔ اسی لئے ایک فعل جو ایک قوم کے نزدیک برا سمجھا جاتا ہے دوسری قوم کے نزدیک اچھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب جس نے اس کی تشکیل میں بہت مدد کی ہے لیکن چونکہ مذہب خود انسان کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اس لئے ضمیر کو کوئی مستقل بالذات شے قرار دینا درست نہیں اور اختلاف رنگ و نسل یا اختلاف ملک و قوم کے ساتھ اس میں بھی اختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ مسلمان بچے گہوارہ ہی سے یہ سنتے آئے ہیں کہ سؤر ناپاک ہے اس لئے وہ بڑے ہو کر بھی اس کو متنفر رہتے ہیں۔ وہ نہ کھا لیکن انگریز نہایت خوشی سے اسے کھاتے ہیں اور ان کا ضمیر مطلق سرزنش نہیں کرتا۔ ایک مسلمان اگر عیسائی ہو جائے تو بھی وہ سؤر کا گوشت نہ کھا سکے گا اور ہندو مسلمان ہونے کے بعد بھی گائے کے گوشت سے احتراز کرے گا الغرض ضمیر ہمیشہ مذہب اور سوسائٹی کے دباؤ سے پیدا ہوتا ہے اور ان اثرات سے ہٹ کر اس کا علیحدہ وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

مسجدیں اور سیاسی جلسے

بجواب استفسار

آپ نے بالکل صحیح فرمایا کہ بعض علماء کی ہدایت یہی ہے اور مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میرے زمانہ طالب علمی میں بعض اساتذہ کا یہی حکم تھا اور چند واعظین سے بھی میں نے یہی سنا تھا لیکن بعد کو مطالعہ و تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ یہ غلط کہتے تھے اور عہد اسلام میں مسجدیں نہ صرف عبادت، بلکہ تمام ملکی، قومی و تعلیمی مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے وقف رہی ہیں، تاریخ سے ثابت ہے کہ اسلام میں سیاست و مذہب دونوں ایک دوسرے سے وابستہ تھے، یعنی جس شخص کو مذہبی رہنمائی کے حقوق حاصل ہوتے تھے وہی سیاسی قیادت کا بھی ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اور اس لئے مسجدیں عبادت و نظم حکومت دونوں کے لئے وقف ہوتی تھیں۔

ان دونوں کے باہمی تعلق کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسجد ہمیشہ کیمپ کے مرکزی حصہ میں قائم کی جاتی تھی اور خلیفہ یا فرمانروائے وقت کا مکان جسے دار الامارۃ کہتے تھے اس سے بالکل متصل تعمیر کیا جاتا تھا اور یہ روایت یا رواج اتنے عرصہ تک

قائم رہا کر جب قاہرہ کی مشہور مسجد جامعہ عسکر تعمیر ہوئی (سنہ ۱۶۹ھ) تو اس رسم کو قائم رکھنے کے لئے اس سے متصل دارالامارۃ معز بھی تعمیر کیا گیا جس کا ایک دروازہ مسجد میں کھلتا تھا اور جب ابن طولون نے مسجد تعمیر کرائی تو اس سے ملی ہوئی ایک عمارت "دارالامارۃ" بھی بنوائی جہاں سے وہ مسجد میں داخل ہو سکتا تھا حالانکہ وہ یہاں نہ رہتا تھا۔

بعض خلفا نے اگر اپنا قصر مسجد سے متصل تعمیر نہیں کرایا تو منارۂ مسجد میں ایک "منظرۃ" بنوایا جہاں سے مسجد نظر آتی تھی۔ مسجدوں میں منبروں کا قیام محض اسی لئے تھا کہ خلیفۂ وقت وہاں سے قوم کو خطاب کرے اور انھیں ہدایت و مشورہ دے انھیں منبروں پر ایک خلیفہ کے بعد دوسرا خلیفہ اپنی خلافت کا اعلان کرتا تھا اور اسی جگہ بیٹھ کر وہ گورنروں کے عزل و نصب کی اطلاع لوگوں کو دیتا تھا۔ گورنر بھی اپنے علاقوں میں منبروں پر بیٹھ کر فوجی و انتظامی احکام نافذ کیا کرتے تھے۔

علاوہ اس کے مسجدوں سے بیت المال کا کام بھی لیا جاتا تھا اور یہاں ملکی خزانہ محفوظ رہتا تھا چنانچہ فسطاط میں عثمان بن زید نے جو مالیات کے ناظر اعلیٰ تھے سنہ ۹۷ھ میں مسجد عمر کی تعمیر کے سامنے ایک قبہ یا کوٹھری اس غرض سے تعمیر کرائی کہ وہاں خزانہ رکھا جائے اس کے علاوہ تاریخ اسلام میں اس قسم کے قبوں کا ذکر بکثرت پایا جاتا ہے۔

مسجدوں سے عدالت گاہ کا کام بھی لیا گیا ہے، چنانچہ خود رسول اللہ نے بھی مسجد نبوی میں احکام شریعت نافذ فرمائے اور اس کے بعد قضاۃ بھی منبر کے

پاس یا صحن میں بیٹھ کر فتویٰ صادر کیا کرتے تھے، چنانچہ ۲۲ھ میں مدینہ کے قاضی مسجد ہی میں مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے اور بصرہ میں اسود بن سریع التمیمی بھی مسجد میں قاضی کی خدمات انجام دیتے تھے، ۲۳ھ میں حضرت عمر کے حکم سے عمرو ابن العاص نے فسطاط میں جب قیس کو قاضی مقرر کیا تو یہ احکام قضا مسجد ہی میں بیٹھ کر صادر کیا کرتے تھے۔

یعقوبی کے زمانہ میں بغداد کا قاضی مسجد ہی میں بیٹھ کر معاملات طے کیا کرتا تھا اور دمشق میں بھی یہی رواج تھا یہاں تک کہ جب کسی دوسری قوم سے متعلق کوئی سیاسی یا ملکی معاملہ طے کیا جاتا تھا تو غیر مسلم حکم یا مصنف کو بھی مسجد میں آکر فیصلہ صادر کرنے کا موقعہ دیا جاتا تھا، چنانچہ مسجد کوفہ میں ایکبار عیسائی شاعر اخطل کو حکم کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔

مسجدیں دارالقضا ہونے کے علاوہ دارالافتا بھی تھیں اور بڑی بڑی مسجدوں سے ایک مفتی بھی متعلق ہوتا تھا اور اس کا حلقۂ افتا یہیں قائم ہوتا تھا۔

مسجدوں سے مدارس مکاتب کا کام بھی لیا گیا ہے، قرآن، حدیث، فقہ تو خیر خالص مذہبی علوم ہیں اور ان کا تعلق مذہب سے ظاہر ہے لیکن تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ لسانی علوم یا ادبیات کا درس بھی مسجدوں میں دیا جاتا تھا چنانچہ فقیہ سعید بن المسیب مدینہ کی مسجد میں عرب شاعری پر لکچر دیا کرتے تھے۔ ۲۸۶ھ میں طبری نے طرماح کے اشعار مسجد عمرو میں بیٹھ کر لوگوں کو لکھوائے اسی طرح غرناطہ کی جامع مسجد میں طلبہ کو نحو کی تعلیم دیتا۔ تیونس کے جامعہ زیتونہ میں

مقامات حریری کا درس دیا جاتا اور بغداد میں نماز صبح کے بعد کسائی کا صرف و نحو کا سبق دینا بھی تاریخ سے ثابت ہے۔ اسی طرح علوم عقلیہ کی درس و تدریس بھی مسجدوں میں دی جاتی تھی؛

مسجدوں سے کتب خانوں کا کام بھی لیا گیا اور ان کتب خانوں میں صرف تفسیر و حدیث ہی کی کتابیں نہ ہوتی تھیں۔ لوگ آتے تھے اور مسجدوں ہی میں بیٹھ کر مختلف علوم کی کتابوں کا مطالعہ اور ان پر بحث و مباحثہ کرتے تھے الغرض مسجدوں کی حیثیت اسلام میں بہت متنوع تھی، وہ عبادت گاہیں بھی تھیں اور عدالت گاہیں بھی، دار الافتا بھی تھیں اور ایوان حکومت بھی وہاں علوم عقلیہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور سیاست و ادب کی بھی،

یہ درست ہے کہ لہو و لعب کی مجلسیں مساجد میں کبھی قائم نہیں کی گئیں اور نہ ایسا کرنا مناسب تھا لیکن اس کے علاوہ وہاں سب کچھ ہوتا تھا جس کا تعلق کسی جماعت کی قومی زندگی سے ہے اس لئے یہ کہنا کہ مسجدوں میں سوائے نماز و قرآن خوانی کے کچھ نہ ہونا چاہیئے، بالکل غلط ہے!

ختم شد

ہماری دیگر مطبوعات

۱۔ مکتوبات نیاز	تیس روپے
۲۔ مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ	چالیس روپے
۳۔ خدا نمبر (کتابی صورت)	پچاس روپے
۴۔ عورت اور فنون لطیفہ نمبر (نگار)	چالیس روپے
۵۔ ہندی شاعری نمبر (نگار)	تیس روپے
۶۔ ماجدولین نمبر (نگار)	بیس روپے
۷۔ اقبال نمبر (نگار)	تیس روپے
۸۔ من ویزداں کامل	دو سو روپے
۹۔ شہوانیات	زیر طبع
۱۰۔ مشکلات غالب	چالیس روپے